مرزا دبیر

سوانح و کلام

تالیف

مظفر حسن ملک
ایم اے بی ٹی





یہ مقالہ پنجاب یونیورسٹی سے پی ایچ-ڈی کی سند کے حصول کیلئے
جناب سید عابد علی صاحب عابد کی زیرنگرانی
لکھا گیا۔


ARABIC
PANJAB
UNIVERSITY
LIBRARY
SECTION

گذارش احوال

مرزا سلامت علی دبیر کے سوانح اور کلام کے جائزے پر مشتمل یہ مقالہ پنجاب یونیورسٹی سے پی ۔ایچ ، ڈی ، کی سند کے حصول کے لئے جناب سید عابد علی صاحب عابد کی زیر نگرانی لکھا گیا ۔سید عابد صاحب پاکستان بھر مین واحد شخص ھین جو صنفِ مرثیہ پر محاکمانہ نظر رکھتے ھین ۔موصوف کی دوسری خصوصیت جمال اور جمالیات سے والہانہ اُلفت ھے ۔دبیر کے کلام کی تزئین و آرائش کی اداؤن کو سمجھنے کے لئے عابد صاحب سے بہتر رہنما ملنا مشکل ھے ۔انہین حقائق کے پیش نظر، یونیورسٹی کے اربابِ اختیار نے میری تربیت کے لئے انہین مُنتخب کیا ۔مین اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہون کہ اس بہانے سے متواتر پانچ سال مجھے موصوف سے فیض یاب ہونے کا موقعہ ملتا رہا جو بجائے خود بہت بڑی نعمت ھے ۔

سید عابد صاحب علم و فضل کا دریا ھین ۔اس کے ساتھ ان کی حسِ جمال بہت ھی تیز ھے ۔اس لئے ان کی معیت مین کام کرنے کے لئے بڑے تحمل ، بردباری اور کٹھن محنت کی ضرورت ھے ۔ذرا سی لغزش ان کی طبیعت کے تکدر کا باعث ہوسکتی ھے ۔ اور ذرا سا تساہل ان کے اور طلباء کے انقطاعِ تعلق تک کا موجب ہوسکتا ھے ۔اس لئے اگر مین یہ کہون کہ یہ پانچ سال بڑے صبر آزما تھے تو اس مین مبالغے کا شائبہ تک بھی نہین ۔ لیکن اب جبکہ یہ دور گذر چکا ھے اور مین گذشتہ واقعات پر ٹھنڈے دل سے غور کرتا ہون تو اندازہ ہوتا ھے کہ ان کی یہ سختی کتنی ضروری تھی ۔ان کے ایک ایک اشارے مین مطالب و معانی کے کیا کیا رموز پنہان تھے اور انھون نے اپنے وقت اور مصروفیات کی پرواہ کئے بغیر کس ھمدردی اور جان سوزی سے میری نگارشات کو پڑھا میری اغلاط سے مجھے آگاہ

کیا اور اسرار و رموز سخن سے مجھے آشنا کیا ۔ ان تصورات ہی سے سر شکریے اور ادب سے جھک جاتا ہے ۔

سید عابد صاحب کے بعد ڈاکٹر سید محمد عبداللہ صاحب پرنسپل یونیورسٹی اورینٹل کالج کی رہنمائی کا ذکر ناگزیر ہے ۔ موضوع کے انتخاب سے لے کر مقالہ داخل کرنے تک شاید ہی کوئی ایسا مرحلہ ہو جہاں ان سے استصواب نہ کیا ہو اور یہ استصواب اکثر علمی اور ادبی امور سے گذر کر ذاتی مسائل تک بھی پہنچتا رہا ۔ یہ ان ہی کا حوصلہ ہے کہ وہ اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود مجھے وقت دیتے رہے ۔ میرے خطوط کا جواب لکھتے رہے اور جب میں گھبرا جاتا تو میری حوصلہ افزائی بھی فرماتے رہے ۔

پاکستان سے باہر جن بزرگوں سے بذریعہ خط و کتابت استفادہ کیا گیا ان میں جناب سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب کا ذکر سرفہرست ہے ۔ دائم المریض ہونے کے باوجود آنجناب نے نہ صرف یہ کہ میرے ہر خط کا جواب عنایت فرمایا بلکہ ایسے مواد کی فراہمی میں مدد بھی فرمائی جو میری دسترس سے باہر تھا ۔ موصوف کی مدد کے بغیر اس مقالے کے تحقیقی حصہ کا پایۂ تکمیل تک پہنچنا محال تھا ۔

لکھنؤ کی دوسری شخصیت جن سے مواد کے حصول میں مدد ملی وہ سید سرفراز حسین صاحب خبیر کی ہے ۔ آپ مرزا اوج کے شاگرد اور سالکِ مسلکِ دبیر ہیں ۔ آپ نے بہت سی کتب اور صلاح و مشورہ دونوں سے مستفید فرمایا ۔ خون کے دباؤ اور دل کے امراض کے باوجود آنجناب باقاعدگی سے خطوط کے جوابات دیتے رہے ۔ اور نوادرات کی فراہمی میں بھی مدد فرماتے رہے ۔

مرزا محمد صادق صاحب صادق ابن مرزا طاہر رفیع ابن مرزا اوج ابن مرزا دبیر حسنِ اتفاق سے میرے پاس تشریف لے آئے ۔ خوش قسمتی سے مرزا دبیر مرحوم کا غیر مطبوعہ کلام بھی آپ کے ہمراہ تھا جسے دیکھنے اور نقل کرنے کی اجازت آپ نے کمال فیاضی سے عنایت

فرمادی ۔ یہ سعادت لکھنؤ میں بھی شاید ہی کسی کو نصیب ہوئی ہو ۔ بغیر ان کی فیاضی کے یہ مقالہ غیر مطبوعہ کلام کے شمول سے محروم رہتا ۔

مندرجہ ذیل لائبریریوں سے فائدہ اٹھایا گیا ۔

۱ ۔ پنجاب پبلک لائبریری، لاہور

۲ ۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور

۳ ۔ سید عابد علی صاحب عابد کی ذاتی لائبریری

۴ ۔ سید غضنفر علی صاحب ریٹائرڈ سپرنٹنڈنٹ پولیس جہلم کی ذاتی لائبریری

۵ ۔ سید صفدر حسین صاحب زیدی پرنسپل گورنمنٹ کالج دادو سندھ کی ذاتی لائبریری

۶ ۔ راقم الحروف کی ذاتی کتب جو خاص اسی مقصد کے لئے بہم پہنچائی گئیں ۔ اس سلسلے میں سید خیر، آغا نادر لکھنوی اور مکتبہ جدید لاہور نے بہت مدد دی ۔

سید غضنفر علی شاہ صاحب پرانی وضع کے بزرگ ہیں عمر اسی سے متجاوز ہے ۔ ساری ملازمت یوپی اور سی پی میں گذری ۔ کتب جمع کرنے کا شوق تھا (جو ماشاءاللہ اب تک ہے) موصوف کی لائبریری کا جواب پاکستان میں شاید ہی ہو ۔ مگر افسوس ہے کہ شاہ صاحب کی گوشہ نشینی کی وجہ سے لوگوں کو اس سے استفادہ کے بہت کم مواقع میسر آئے ہیں ۔ کتابوں کی چوری ایک عام مرض ہے ۔ لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ جمع کرنے والے نے کس اشتیاق اور محنت سے یہ ذخائر یکجا کئے ہیں ۔ نتیجہ یہ ہے کہ شاہ صاحب کتاب دینے میں اکثر احتیاط برتتے ہیں ۔ کچھ میرے دیرینہ مراسم اور کچھ شوق مطالعہ کی بنا پر کمال فیاضی سے کام لیا اور چابیاں میرے حوالے کر دیں ۔ وہ لوگ جنہیں مذہب امامیہ کی روایات سے دلچسپی ہو انہیں اس کتب خانے کی طرف ضرور رجوع کرنا چاہئے ۔

اس سوال کا جواب کہ مرزا دبیر کو بطور موضوع کیوں منتخب کیا گیا یہ ہے کہ موصوف کا رتبہ مرثیہ گو شعراء میں بہت بلند ہے ۔ اگرچہ زمانے نے ان کے مقابلے میں میر انیس کا ساتھ

دیا لیکن فی الواقع مرزا دبیر نہ صرف زندگی بھر میر انیس کے مد مقابل مانے جاتے تھے بلکہ اپنے عہد میں ان سے بہتر بھی سمجھے جاتے تھے ـ آج آہستہ آہستہ ان کے کمال کا چراغ گل ہوتا جا رہا ہے اور ان کا نام محض اس وجہ سے زندہ ہے کہ انیس کے نام کے ساتھ ملحق ہے ـ ورنہ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو مرزا صاحب کا کلام شوق سے پڑھتے ہوں ـ

یہ بحث کہ دونوں میں سے کون بہتر تھا بہت ہوچکی ہے ـ موازنہ انیس و دبیر اور المیزان کا دور گذر چکا ہے ـ وقت کے امتحان نے انیس کو بہت اونچا پہنچا دیا ہے ـ اور وہ اس سے بھی زیادہ کے مستحق ہیں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مرزا دبیر کو بالکل ہی فراموش کردیا جائے ـ ان کا اپنا رنگ اور اپنا مقام ہے جس میں وہ اپنے عہد میں بھی منفرد تھے اور اب بھی منفرد ہیں ـ

یہ کتاب نہ تو موازنہ انیس و دبیر کے جواب میں ہے اور نہ ہی المیزان اور رد موازنہ کی تائید میں ـ نہ ہی اس کتاب کا مقصد انیسیوں اور دبیریوں کے مناقشے کو زندہ کرنا ہے ـ بلکہ اس کا مقصد صرف مرزا دبیر کے کلام کا ان کے سیاسی، مجلسی اور ثقافتی پس منظر کی روشنی میں مطالعہ ہے ـ اگر کہیں موازنہ اور اس کے جوابات کا ذکر اس کتاب میں ضمناً آگیا ہے ـ تو یہ صرف بر سبیلِ تذکرہ ہے ـ ورنہ مرزا دبیر کے کلام کو سمجھنے کے لئے ان جھگڑوں میں الجھنے کی چنداں ضرورت نہیں سمجھی گئی ـ ان کتب کا ایک خاص دور تھا جو گذر چکا ـ اب ان کا مقام محض تاریخی ہے ـ البتہ کوئی طالب علم صنفِ مرثیہ کے انتقاد کے ارتقاء کو ان کے پڑھے بغیر نہیں سمجھ سکتا اور یہی ان کی اہمیت ہے ـ

اس کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے ـ پہلے حصے میں مرزا دبیر کے کلام کے مجلسی اور ثقافتی پس منظر اور مرثیہ کے فروغ کے اسباب کا ذکر ہے ـ شاہان اودھ کے مختصر سے سیاسی تذکرے کے بعد اودھ کی عام معاشرت پر بحث کی گئی ہے نیز ان اسباب کا سراغ لگایا گیا ہے جو اس خاص معاشرت کی علت ہیں ـ مرثیہ کے فروغ کے اسباب کا ذکر کرتے

ہوئے انیس و دبیر کی مقبولیت کی وجوہات کا بھی بیان کردیا گیا ہے اور دونوں کے مخصوص انداز سخن کی طرف بھی اجمالی اشارات کردیے گئے ہیں ۔

حصہ دوم سوانح پر مشتمل ہے ۔ حصہ دوم کے پہلے باب میں دبیر کے خاندان اور ان کی ابتدائی زندگی اور آغاز شاعری تک کے حالات درج ہیں ۔ باب دوم میں مرزا کی شہرت اور ترقی کے اسباب سے بحث کی گئی ہے ۔ نیز ان کی علمی اور شاعرانہ زندگی سے متعلق واقعات کی تفصیل بیان کی گئی ہے ۔ باب سوم میں مرزا صاحب کی شخصیت کو متعارف کیا گیا ہے ۔ ان کے اوصاف اور عوام و خواص سے تعلقات اور سلوک کا ذکر ہے ۔ باب چہارم ان واقعات پر مشتمل ہے جو انیس اور دبیر دونوں سے متعلق ہیں ۔ اس میں بعض ایسی روایات کی تحقیق کی گئی ہے جو فریقین نے محض فریق ثانی کو نیچا دکھانے کے لئے وضع کرلی ہیں اور اب تاریخی حیثیت حاصل کرچکی ہیں ۔ ان تمام روایات کو یکجا کر کے ان پر محاکمہ کردیا گیا ہے ۔ باب پنجم میں دبیر کی آخری زندگی کے واقعات مندرج ہیں ۔ الحاق اودھ کے بعد ارباب کمال زبوں حالی کے شکار ہوگئے تھے ۔ اس زبوں حالی میں انہیں افلاس اور غریب الوطنی دونوں سے سابقہ پڑا ۔ میر انیس کی وفات پر مرزا صاحب کے قطعہ تاریخ کا ذکر اور اس پر بحث کی گئی ہے ۔ خود مرزا صاحب کی وفات اور اس پر مختلف قطعات تاریخ، مزار اور اولاد کا بھی ذکر ہے ۔

اس کتاب کے سوانحی حصے کو مرتب کرنے میں بہت کاوش کرنی پڑی ۔ اس کٹھن کی وجوہات یہ ہیں کہ تذکرہ نویس بالعموم مرزا دبیر کا ذکر نہیں کرتے کیونکہ بطور غزل گو کے ان کی شہرت نہیں ہوئی ۔ جو سوانح عمریاں میر انیس یا مرزا دبیر کی لکھی گئی ہیں وہ یکطرفہ ہیں ۔ غیر جانبدارانہ بیانات کا ملنا بہت مشکل ہے ۔ اول تو اب ایسا کوئی آدمی موجود نہیں، جس نے ان کا عہد اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو، پھر جو سوانحی مواد ہم تک پہنچا ہے وہ بے حد غیر مصدقہ اور ناقابل اعتبار ہے ۔ ان کے مؤلفین کی نیت پر تو شبہہ نہیں کیا جاسکتا مگر عقیدت اور وکالت یا مخاصمت کے نفسیاتی اثرات سے انہیں پاک بھی نہیں سمجھا جاسکتا ۔

مرزا صاحب کے سوانح پر قدیم ترین فارسی کتابچہ شمس الضحیٰ ہے جو مولوی صفدر حسین کی تالیف اور ۱۲۹۸ھ کی طبع شدہ ہے۔ مولوی صفدر صاحب کے بعد دوسرے بڑے راوی افضل حسین ثابت ہیں جنھوں نے حیاتِ دبیر (دو حصے) اور دربارِ حسین، ان کے اور ان کے شاگردوں کے حالات پر علی الترتیب تالیف کیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے مرزا صاحب کے انتخاب کلام سبع مثانی کے دیباچے میں بھی موصوف کے حالات بالتفصیل رقم فرمائے ہیں۔ مرزا صاحب کی وفات پر ان کے حالات زندگی اودھ اخبار میں بھی طبع ہوئے۔ رسالہ ندیم، گیا، بہار نمبر ۱۹۳۵ع میں وصی بلگرامی صاحب کے مضمون س، ش، ص میں بھی دبیر کے حالات کا ضمناً ذکر آگیا ہے۔ لیکن ان میں سے بیشتر تحریریں یکطرفہ اور عقیدت کے جذبہ کے تحت وجود میں آئی ہیں۔ لہٰذا ان کی چھان بین معاصرین اور فریق مخالف کے سوانح کو ساتھ رکھ کر کی گئی ہے۔ تاریخی واقعات کا تجزیہ کیا گیا ہے اور جو نتائج درست معلوم ہوئے انہیں درج کرلیا گیا ہے، باقی کو یا تو نظر انداز کردیا گیا ہے یا ان کے مشکوک اور غلط ہونے کا ذکر کردیا گیا ہے۔ مرزا صاحب کی اولاد اور دیگر کوائف کی تصدیق ان کے خاندان سے کرلی گئی ہے۔

حصہ سوم میں کلام پر انتقاد و تبصرہ کیا گیا ہے۔ باب اول میں کلام کی مقدار، مختلف ایڈیشن، تحریف، الحاقی کلام اور غیر مطبوعہ کلام کا بیان ہے۔ نیز کلام کی منازلِ ارتقا، تاریخی تدوین اور دبیر کے عہد کی زبان کا ذکر کیا گیا ہے۔ کلام کی مقدار کے متعلق مرزا صادق صاحب (جو دبیر کی اولاد میں سے ہیں) سے بھی مشورہ کرلیا گیا ہے اور اب اس میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہی۔

اس حصہ کے دوسرے باب میں اصطلاحی مرثیہ کی قدر و قیمت کی تعیین کردی گئی ہے اور وہ اصول وضع کئے گئے ہیں جن کی روشنی میں مرزا صاحب کے کلام کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مرثیہ میں دیگر اصنافِ سخن یعنی ایپک، المیہ اور داخلی شاعری کے عناصر کی تلاش کی گئی ہے یہ باب مرزا دبیر سے براہ راست تعرض نہیں کرتا مگر اس لحاظ سے اہم ہے کہ اسمیں بیان کردہ

اصولوں ~~اسولوں~~ کی روشنی مین مرزا صاحب کا کلام پرکھا پھر گیا ہے ۔

باب سوم مین صنفِ مرثیہ کی مختصر سی تاریخ، یہ معلوم کرنے کی غرض سے، بیان کی گئی ہے کہ مرزا دبیر نے اسے کہان سے شروع کیا اور کہان تک پہنچایا ۔ تاکہ اس صنف کے ارتقاء مین ان کا حصہ متعین کردیا جائے ۔

باب چہارم براہ راست مرزا صاحب کے کلام سے متعلق ہے ۔ اس مین مرزا صاحب کے کلام مین داخلی شاعری کے عناصر کا کھوج لگایا گیا ہے ۔ اور مثالون سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ان کے ہان اعلی داخلی شاعری کے نمونے موجود ہین ۔ اس مین مدح اور منقبت کا بھی ذکر آگیا ہے ۔ اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ چونکہ مدح مین جذبات کا خلوص موجود ہے اس لئے یہ بھی داخلی شاعری مین داخل ہے ۔

باب پنجم مین "دبیر" کے کلام مین ایپک کے عناصر کا ذکر ہے ۔ داستان سرائی کے عناصر کی تلاش کی گئی ہے ۔ مثال کے طور پر مرزا صاحب کا ایک مرثیہ "دست خدا کا قوت بازو حسین ہے" لے کر اس کا تجزیہ کیا گیا ہے ۔ اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ مکمل ایپک تو نہین مگر مرزا صاحب کے کلام مین ایپک کے عناصر ضرور موجود ہین ۔

باب ششم کا مقصد یہ ہے کہ دبیر مسلسل ایپک تو نہین لکھتے مگر مختلف واقعات کا بیان بڑی خوش اسلوبی سے کرتے ہین ۔ اس دعوی کی تائید مین

"جب عابد مریض کو داغِ پدر ملا"

والا مرثیہ انتخاب کیا گیا ہے اور اس پر بحث کی گئی ہے ۔

باب هفتم مین دبیر اور مناظرِ فطرت کی تصویر کشی سے بحث کرکے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ ان کے کلام کی یہ بہت بڑی خامی ہے کہ وہ صحیح تصویر کشی نہین کرسکتے اور اس کمی کو وہ موٹے الفاظ سے پُر کرنا چاہتے ہین اس لئے ناکام ہوتے ہین ۔

باب هشتم مین دبیرؔ کو بحیثیت کردار نگار کے جانچا گیا ہے اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ وہ اس فن مین کسی سے پیچھے نہین ۔ ان کے کلام مین ہر قسم کے کردار موجود ہین اور وہ

حسبِ ضرورت ان کا تشخص اور تعیین بھی کردیتے ھین ۔ مختلف کرداروں سے بحث کی گئی ہے اور کلام سے مثالین پیش کی گئی ھین ۔

باب نہم مین دبیر کے کلام کے اصل جوہر یعنی محسناتِ شعر اور آرائشِ کلام کا بیان ہے ۔ صنائع لفظی اور معنوی کا استعمال جس خوبی سے دبیر نے کیا ہے اس کی مثال اردو شاعری مین مشکل سے ملتی ہے ۔ ہر صنعت کے تحت کلامِ دبیر سے مثالین دی گئی ھین اور ابلاغ و اظہار مین ان سے جو کام دبیر نے لیا ہے، اس کا ذکر ہے ۔

باب دہم مین" سلام اور رباعیات" درج ھین ۔ ان اصناف سے جو فوائد مرثیہ گو شعراء نے حاصل کئے ان پر بحث 'لکھنؤ کی ثقافت کے بیان' مین مفصل ہوچکی ہے اس لئے یہان مختصر سے تعارف کے ساتھ دونون اصناف کے نمونے دے دیے گئے ھین ۔

حصہ چہارم کلام کے انتخاب پر مشتمل ہے جو طویل کلام کتاب کے اندر نہ دیا جا سکا ۔ اس حصے مین یکجا دے دیا گیا ہے ۔

اپنی تالیف کے اس مختصر سے جائزے کے بعد مین یہ عرض کردینا مناسب سمجھتا ہون کہ یہ ایک طالب علمانہ کوشش ہے ۔ جس مین خامیون کا پایا جانا ناگزیر ہے ۔ ٹائپ کی اغلاط بھی ہون گی ۔ اگرچہ اپنی طرف سے بہت کوشش کی گئی ہے کہ ان کی صحیح ہوجائے مگر اس مین ایک مجبوری بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ مؤلف کے تحت الشعور مین اپنی تالیف کے فقرات موجود ہوتے ھین اور وہ خود کتابت یا ٹائپ کی غلطی کو بآسانی پکڑ نہین سکتا ۔ اور پھر یہ کام دوسرون کے سپرد بھی تو نہین کیا جاسکتا ۔

خلاصۂ داستان

سلطنت مغلیہ کی گرتی ہوئی عمارت کے مسالے سے جن نئی اور نیم مختار ریاستوں کی تعمیر ہوئی ان میں سلطنت اودھ دلّی سے نسبتہً قریب تھی ۔ اس لئے اہل کمال کی ایک خاصی تعداد دارالخلافہ سے ہجرت کر کے لکھنؤ جا بسی ۔ اس سلطنت کی عمر ۱۷۲۲ع سے لے کر ۱۸۵۶ع تک صرف ایک سو چونتیس سال بنتی ہے ۔ مگر اس قلیل عرصہ میں بھی زبان و ادب اور ایک مخصوص تمدن اور معاشرت کی تعمیر و ترقی کا جو کام شاہان اودھ کے زیرِ سایہ ہوا اسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا ۔

اودھ کے تیسرے حکمران شجاع الدولہ نے انگریزوں سے ۱۷۶۲ع میں بکسر کے مقام پر معرکہ آرائی کر کے شکست کھائی تو اس کے بعد ریاست میں عملاً انگریزی عملداری کا قیام ہوگیا ۔ ریذیڈنٹ معمولی معمولی انتظامی معاملات میں بھی دخل اندازی کرنے لگے ۔ نتیجۃً شاہان اودھ آہستہ آہستہ امورِ سلطنت سے بے تعلق ہوتے چلے گئے ۔ اس مجبوری اور بے بسی کے نتیجے میں نیز جنگِ بکسر میں شکست کے احساس اور گرتے ہوئے وقار کے صدمہ کی بنا پر شاہانِ اودھ نے زندگی کے حقائق سے فرار اختیار کر کے مذہبی غلو اور عیش و طرب میں پناہ لی ۔ خود شجاع الدولہ مذہبی رسوم کا بالخصوص رسومِ محرم میں بڑے خلوص اور باقاعدگی کا اظہار کرتے تھے ۔ اور ساتھ ہی ساتھ جاہ عیش اور اربابِ نشاط کے بھی دلدادہ تھے ۔ غازی الدین حیدر، ان کی ملکہ بادشاہ بیگم اور جانشین نصیرالدین حیدر سب کے سب مذہبی امور میں انتہائی غلو اور خوش اعتقادی کا ثبوت دیتے رہے ۔ بادشاہ بیگم نے تو مذہب میں بعض عجیب و غریب اختراعات بھی کیں ۔ اچھوتوں کی رسم بطور نمونہ پیش کی جاسکتی ہے ۔

چونکہ دبیر کا دربار سے تعلق نصیرالدین حیدر سے لے کر انتزاعِ سلطنت تک قائم رہا ۔ اس لئے ان رسوم، مذہبی غلو اور غیر مصدقہ روایات کے اثرات ان کے کلام میں بھی موجود ہیں شاہان اودھ ان کے بڑے معتقد تھے ۔

اودھ کی عام معاشرت نے مرثیہ کے فروغ میں بڑی مدد دی ۔ اس زوال پذیر معاشرے میں زندگی کے حقائق کا سنجیدگی سے مقابلہ کرنے کی ہمت نہ تھی بلکہ موسیقی کے سرور غزل اور ریختی کی دلچسپی اور مرثیہ کی مذہبی اثر پذیری میں گم ہو کر زندگی کی تلخیوں کو فراموش کرنا چاہتا تھا ۔ نتیجۃً ہر چیز اپنے اصل مقام سے گرتی ہوئی نظر آتی ہے ۔ ٹھمری کی ایجاد، طوائفوں کی کثرت، ریختی کا احیا، سب اسی رجحان کے نتائج ہیں ۔ موسیقی نے سوز خوانی کو جنم دیا اور سوز خوانی نے مرثیہ کی مانگ میں اضافہ کیا ۔

لکھنؤ کی ادبی میراث کے سرمایہ میں عربی، فارسی، دکنی اور دہلوی روایات کا امتزاج ہوگیا ہے ۔ لیکن لکھنؤ کے مخصوص ماحول نے اس عہد کے ادب کو اپنے مخصوص رنگ میں رنگ لیا ہے ۔ سوز و حرمان کی جگہ انبساط و نشاط، سادگی کی جگہ تکلف اور تصنع، حسن و جمال کے مختلف پہلوؤں کا بیان اور مختلف اصناف سخن حتیٰ کہ نثر تک میں محسنات اور صنائع بدائع کا اہتمام اس دور کے ادب کی نمایاں خصوصیات ہیں ۔

مرثیہ کے فروغ کے اسباب میں لذتِ الم، مذہبی تقریبات کی اہمیت بالخصوص مجالسِ عزا کی فراوانی اور امرا کی سرپرستی بھی شامل ہیں ۔ ہندو امراء بھی اِن مجالس و تقریبات کا اپنے ہاں اہتمام کرتے تھے اور مرثیہ گو شعراء کی سرپرستی کرتے تھے ۔ اس کے نتیجے میں مرثیہ گو شعراء بالخصوص میر انیس اور مرزا دبیر کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی ۔ ان کے تلامذہ اور معتقدین کی کثرت کا یہ حال تھا کہ لکھنؤ دو گروہوں میں بٹ گیا ۔ جنھیں عرف عام میں 'انیسئے' اور 'دبیرئیے' کہا جاتا ہے ۔ ان لوگوں کے بحثوں اور فریق مخالف پر چوٹوں کے مطالعے سے ان کے ذوقِ سلیم اور سخن فہمی کی داد دیئے بغیر نہیں رہا جا سکتا ۔

اگرچہ اردو مرثیہ لکھنؤ کے مخصوص ماحول کی پیداوار ہے لیکن اِس صنفِ سخن نے لکھنؤ کی ادبی میراث میں بعض دور رس اثرات بھی چھوڑے ۔ مرثیہ گو شعراء کے طبعی اِستغنا اور تخلیقی لگن کی وجہ سے سلام اور رباعی کا رواج ہوا ۔ ان سے ان لوگوں نے (Prologue) کا کام لیا ۔

اور تدریس اخلاق کی ۔ ان دونوں اصناف کے ارتقا میں لکھنوی مرثیہ گویوں کا بڑا حصہ ہے ۔

مرثیہ کی ترویج و ترقی میں انیس اور دبیر دونوں کو یکساں اہمیت حاصل ہے ۔ دبیر پر لکھنوی ماحول کا اثر انیس کے مقابلے میں زیادہ ہے اور اسی نسبت سے محسنات شعر کا استعمال بھی انہوں نے میر صاحب کے مقابلے میں زیادہ کیا ہے ۔ میر انیس اپنی خاندانی روایات کے زیر اثر صحت محاورہ، تسلسل بیان اور سلاست زبان کا خیال زیادہ رکھتے ہیں ۔ بخلاف اس کے مرزا دبیر آرائش کلام اور صناعانہ فن کاریوں کی طرف زیادہ مائل ہیں ۔

حصہ دوم

سوانح

دسویں صدی ہجری کے پہلے وسط میں باکمالان ہرات میں سے ایک بزرگ اور شاعر ملا اہلی شیرازی کے نام سے شہرت رکھتے تھے ۔ ان کے چھوٹے بھائی ملا ہاشم شیرازی اسی زمانہ میں وارد ہندوستان ہوکر دربار مغلیہ سے منسلک ہوگئے ۔ ملازمت کا یہ سلسلہ نسلاً بعد نسلٍ اس خاندان میں منتقل ہوتا رہا ۔ جب ملا غلام محمد (دبیر کے دادا) کی باری آئی تو انہوں نے شاہ عالم ثانی کے عہد میں شاہی ملازمت ترک کرکے گوشہ نشینی اختیار کرلی ۔ دبیر کے والد ترک سکونت کرکے لکھنو آگئے اور شادی کرکے مستقل طور پر یہیں کے ہورہے ۔ اور بعض روایات کے مطابق کاغذ کا کاروبار کیا جس سے ان کی مالی حالت بہت اچھی ہوگئی ۔

دبیر نے تمام کتب درسیہ، منقول و معقول، عربی اور فارسی، اپنے عہد کے مشہور اساتذہ سے پڑھیں، جس کا اثر ان کے کلام میں موجود ہے ۔ ان کی شاعری کا آغاز بہت کم عمر میں ہوا ۔ اور منازل عمر کے ساتھ ساتھ ترقی کرتا رہا ۔ مرثیے اور مرثیے کی زبان کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ ان کے کلام کی تقدیم و تاخیر کی تعیین ممکن ہے ۔

بیگمات اور شاہان اودھ کی ضعیف الاعتقادی اور مرثیہ کی عام مقبولیت کے علاوہ، اُستاد سے ناچاقی نے دبیر کی شہرت میں بڑی مدد دی ۔ شاہی سرپرستی تو پہلے ہی حاصل تھی ۔ استاد سے بغاوت نے واضح کردیا کہ ہونہار شاعر، اُستاد کی مدد کا محتاج نہیں بلکہ مد مقابل ہے ۔

دبیر نے ابتدائی عمر میں غزلیات بھی کہیں ۔ مگر جلد ہی تلف کردیں ۔ انہیں اس امر کا بے حد احساس تھا کہ ان کی غزلیات ارباب نشاط نہ گائیں اس اہتمام میں اتنی سختی برتی کہ بڑی تلاش و جستجو کے بعد ~~کہ آج ان کی ایک غزل بھی دستیاب ہونا مشکل ہے~~ صرف دو غزلیں دستیاب ہو سکیں ۔

مرثیہ گوئی کے علاوہ مرثیہ خوانی بھی ایک فن ہے ۔ قدرت نے دبیر کو باٹ دار، بلند آواز سے مستفید فرمایا تھا ۔ ہاتھوں سے بتانا وہ گناہ سمجھتے تھے ۔ سارا کام آواز کے اُتار چڑھاؤ ہی سے لیتے تھے ۔ پڑھنے کا انداز ایسا تھا کہ کیا مجال کہ کوئی ان کی مجلس میں ہل بھی سکے ۔ کلام میں تاثیر اس بلا کی تھی کہ ابھی مرثیہ ابتدائی مراحل ہی میں ہوتا کہ تمام مجلس میں آہ و بکا شروع ہوجاتی ۔

شاہی خاندان کے اکثر افراد جنہیں شعر و شاعری کا شوق تھا، دبیر کے حلقۂ تلامذہ میں شامل تھے ۔ ان کے علاوہ مُنیر شکوہ آبادی، صفیر بلگرامی اور شاد عظیم آبادی جیسے نامور شعراء کو مرزا صاحب سے شرفِ تلمذ حاصل تھا ۔

واجد علی شاہ آپ کی قدردانی کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں —

~~بچپن~~ بچپن سے ان کے دامِ سخن میں اسیر ہوں
میں کم سنی سے عاشقِ نظمِ دبیر ہوں

ایک دفعہ دورانِ مجلس میں شامیانہ گر پڑا تو واجد علی شاہ بنفسِ نفیس چتر پکڑ کر اختتامِ مجلس تک کھڑے رہے ۔

دبیر، مرنجاں مرنج انسان تھے ۔ فیاضی، وضعداری، ایفائے عہد، خوفِ خدا اور زہد و عبادت ان کی مخصوص صفات تھیں ۔ فنون جنگ میں بھی رواج زمانہ کے مطابق مہارت حاصل تھی ۔

علم وفضل میں دبیر کا مرتبہ بہت بلند تھا ۔ عربی اور فارسی کی اعلیٰ کتب ہمیشہ زیرِ نگاہ رہتی تھیں ۔ اس کی جھلک ان کے کلام میں بھی ملتی ہے ۔ انھوں نے قرانی آیات، احادیث نبوی، اقوالِ آئمہ اور مشہور عربی و فارسی اشعار کو اپنے کلام میں سمونے کی کوشش کی ہے ۔ چنانچہ ان کے ہاں اخذ و ترجمہ کی بہت عمدہ مثالیں ملتی ہیں ۔

دبیر کی شاعری کے آغاز اور شہرت کو انیس کی شاعری پر تقدمِ زمانی حاصل ہے ۔ جب تک انیس فیض آباد سے ترکِ سکونت کرکے لکھنؤ تشریف لائے، دبیر کو اقلیمِ مرثیہ میں اپنا سکہ بٹھائے پچیس سال ہوچکے تھے ۔ اس کی تائید خود میر صاحب کے قول سے ہوتی ہے ۔

انیس اور دبیر دونوں کے باہمی تعلقات ہمیشہ خوشگوار رہے ۔ دونوں بزرگوں نے ایک دوسرے پر تعریض اور چوٹ کرنے سے پرہیز کیا ۔ جتنے جھگڑے ہوتے تھے، وہ ہمیشہ مداحین ہی کے درمیان رہے ۔ ان دونوں مشاہیر نے کبھی اس میں حصہ نہیں لیا ۔ اور نہ ہی کبھی کسی مجلس میں یکجا پڑھا ۔ چنانچہ سلام کا مشہور قصہ بھی فرضی ہے اسی طرح مولانا شبلی کا یہ فرمانا کہ مرزا دبیر، بالعموم مقابلے کا قصد کرتے تھے یا میر انیس ان پر سرقہ کا الزام لگاتے تھے اور مرزا دبیر، برابر کا جواب نہیں دیتے تھے، درست نہیں ۔ مولانا کے دعویٰ کی بنیاد میر انیس کی بعض شاعرانہ تعلیوں پر ہے جن کی دبیر کے ہاں بھی کمی نہیں ۔

الحاقِ اودھ کے بعد اہلِ کمال، خستہ حالی اور پریشانی میں مبتلا ہوکر لکھنؤ سے باہر نکلے ۔ دبیر، جنھوں نے تمام عمر کبھی سفر نہ کیا تھا، کانپور اور عظیم آباد گئے ۔ پھر ضعفِ بصارت کے علاج کے لئے واجد علی شاہ، جانِ عالم کے بلاوے پر کلکتے گئے ۔ اور ایک جرمن ڈاکٹر سے آنکھوں کا اپریشن کرایا جو کامیاب رہا ۔

دبیر کے آخری دو سال نہایت تکلیف میں بسر ہوئے ۔ نوجوان فرزند، بھائی اور ہم مقابل (میر انیس) کی وفات کے صدمے برداشت کئے ۔ انیس کی وفات پر ایک قطعہ تاریخ کہا جو مدتوں اہلِ سخن کے درمیان موضوع بحث رہا اور آج بھی ہے ۔ ۲۹ محرم ۱۲۹۲ ھ کو وفات

پائی اور اپنے مکان واقعہ نخاس لکھنؤ مین مدفون ہوئے ۔

مرزا دبیر کی اولاد مین ان کے لائق فرزند، مرزا اوج اور نبیرہ مرزا طاہر رفیع اپنے عہد کے مشہور صاحب طرز مرثیہ گو گذرے ہین ۔

حصہ سوم (کلام)

مرزا دبیر کے کلام کی مقدار کے متعلق تذکرہ نویس حضرات متفق نہین ۔ خود مولانا محمد حسین آزاد نے ایک جگہ تین ہزار اور دوسری جگہ دس ہزار مرثیے بتائے ہین لیکن اب تک مطبوعہ اور وہ غیر مطبوعہ مرثیے جن کا سراغ ملا ہے، مذکور کی تعداد ہونے چار سو سے تجاوز نہین کرتی ۔

چونکہ مرزا دبیر کے کلام کی طباعت ان کی زندگی مین نہین ہوئی اس لئے بیشتر ایڈیشن کتابت اور طباعت کی غلطیون سے پر ہین ۔ لیکن دفتر ماتم جس کی مرزا اوج نے صحت کی اور نولکشور کا ۱۹۲۷ع کا ایڈیشن جس کی صحت مرزا طاہر رفیع نے فرمائی کسی حد تک قابل اعتماد ہین ۔ انہین دو ایڈیشنوں سے اس مقالہ مین استصواب کیا گیا مگر بد قسمتی سے دفتر ماتم مین بھی کچھ الحاقی کلام شامل ہوگیا ہے ۔ چھ مرثیون کے متعلق تو یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ وہ الحاقی ہین ۔

مرزا صاحب کا غیر مطبوعہ کلام بھی ان کے ورثاء کے پاس محفوظ ہے ۔ آٹھ مکمل مرثیے، خود مرزا مرحوم کے ہاتھ کے لکھے ہوئے راقم الحروف کی نظر سے بھی گذرے جن مین سے پانچ کی نقل بھی راقم الحروف کے پاس موجود ہین ۔ اس کے علاوہ بھی کچھ کلام مشتمل بہ نامکمل مرثیہ جات موجود ہے ۔

دفتر ماتم کی پہلی چودہ جلدون مین مرثیے شامل (۳۶۶) ہین ۔ پندرھوین جلد مثنوی مین ہے ۔ سولھوین سترھوین اور اٹھارھوین جلد مین ۳۳۲ ردیف وار سلام ہین ۔ انیسوین جلد ۶۲ مخمس سلامون پر مشتمل ہے ۔ اور بیسوین جلد متفرق کلام پر مشتمل ہے ۔

مرحوم نے اپنے کلام مرثیہ کے لئے ایسی رواں بحرین انتخاب کین جو سوز خوانی اور تحت اللفظ دونون کے لئے مفید ہون ۔ اس سے ان کی ذہانت اور طبیعت مین جمالیاتی لپچ کا پتہ چلتا ہے ۔

اگرچہ مرزا صاحب کا کلام، تاریخی تدوین سے جمع نہیں ہوا ۔ لیکن اگر ان کے مراثی کو تحقیقی نظر سے جانچا جائے تو ہم بآسانی اسے مختلف ادوار میں تقسیم کرسکتے ہیں مثلاً " وہ ابتدائی مرثیے یا نوحے جو سوزخوانوں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے لکھے گئے کیونکہ ان ایام میں تحت اللفظ کا رواج کم تھا ۔ یقیناً " ابتدائے مشق کے عہد کے ہیں ۔ پھر ۱۲۲۹ھ میں میر ضمیر نے اپنے مرثیوں میں چہرہ، رخصت، رزم و سراپا کا اضافہ کیا تو دوسرے شعراء نے بھی تقلید کی ۔ اس طرح ۱۲۲۹ھ کو حد فاصل رکھ کر بھی کلام کو دو مختلف ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ۔ پھر ایک ڈھنگ اور بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ بعض مراثی میں باوصف عطف و اضافت کے " نون " کا اعلان جائز سمجھا گیا ہے یہ بھی ابتدائی زمانے کا کلام ہے ۔ بعض مرثیے ایسے ہیں جن میں شاعر نے اپنی مایوسیوں، ناکامیوں اور نامساعد حالات کی طرف بھی کہیں کہیں اشارے کیے ہیں جو اسے ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد پیش آئے ۔ اس طرح وہ مرثیے جو ۱۸۵۷ء کے بعد لکھے گئے وہ بھی الگ کئے جاسکتے ہیں ۔

دبیر کی شاعری کا آغاز جس عہد میں ہوا ۔ وہ علم و فضل کے لحاظ سے لکھنو کا زرین عہد کہلانے کا مستحق ہے ۔ اس عہد میں ایک مخصوص، علمی زبان کی پرورش ہورہی تھی جس میں فارسی اور عربی کے دقیق الفاظ اور معنی خیز ترکیبیں داخل ہورہی تھیں ۔ اگرچہ مرزا صاحب نے اپنی مشق کا آغاز سلیس اور عام فہم زبان میں کیا مگر جلد ہی وہ محسنات شعر کی وادیوں میں داخل ہوگئے ۔ مگر امتداد زمانہ کے ساتھ طبیعت نے پھر پلٹا کھایا ۔ یعنی جب ۱۸۵۷ء کے بعد وہ علمی فضا نہ رہی اور قدردان موقوف ہوگئے تو پھر سلیس زبان استعمال کرنے لگے ۔ اس سلسلے میں مرزا صاحب کے علم و فضل، ذہنی استعداد اور لکھنو کے علمی ماحول کو نظرانداز نہیں کرنا چاہئے ۔

دبیر ان شعراء میں سے ہیں جنہیں موقعہ محل کے مطابق زبان کے استعمال پر قدرت ہوتی ہے خود کہا ہے ۔

ہے رزم و سراپا تو زباں اور ہی ہے　　اور بین کے مابین بیاں اور ہی ہے

کس درجہ بلند ہے تری فکر دبیر　　کہتی ہے زمیں یہ آسماں اور ہی ہے

مرزا دبیر بنیادی طور پر مرثیہ گو شاعر ہیں ۔ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس صنفِ سخن کے متعلق بھی کچھ بحث کرلی جائے ۔ مرثیہ ایسی نظم کو کہتے ہیں، جس میں کسی مرے ہوئے آدمی کے اوصاف بیان کرکے اس کا ماتم کیا جائے ۔ یہ ماتم اقوام اور حکومتوں کا بھی ہوتا ہے ۔ اور اعزہ و احباب کا بھی ۔ اس لحاظ سے اس کا بنیادی تعلق داخلی شاعری سے ہے لیکن اردو میں اصطلاحی مرثیہ سے مراد وہ نظمیں ہیں جن میں شہدائے کربلا اور ان کے متعلقین کے مصائب بیان کرکے ماتم کا سامان پیدا کیا جائے ۔ ان نظموں میں داستان طرازی، جذبات نگاری اور کردار نگاری کی بھی کوشش کی جاتی ہیں ۔ اس لئے اس صنفِ سخن کا تعلق، ایپک اور المیہ سے بھی کسی حد تک ہوجاتا ہے، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ان اصنافِ سخن کی کچھ صفات مرثیہ میں بھی پائی جاتی ہیں ۔ بعض لوگوں نے مشہور مرثیہ گو شعراء کے کلام کو ترتیب دے کر ایپک کی شکل دی ہے مگر اس میں مرثیہ گو سے زیادہ مرتب کی کاوش کو دخل ہوتا ہے ۔ کیونکہ مرثیہ گو حضرات کا مقصد ہمیشہ ایک مخصوص مجلس کی ضروریات ہی رہا ہے ۔

مرثیہ پر تنقید کرتے وقت مخصوص لکھنوی معاشرے اور اس کی ضروریات کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے ۔

اردو مرثیہ کی تاریخ اس قدر قدیم ہے جس قدر کہ اردو شعر کی ۔ قدیم دکنی (عادل شاہی قطب شاہی اور نظام شاہی) ریاستیں چونکہ مجالس عزا کی سرپرستی کرتی تھی اس لئے وہاں نوحے اور مرثیے تصنیف ہوئے ۔ فضلی کی کربل کتھا شمالی ہند میں مرثیہ کا قدیم ترین نمونہ ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ صنفِ مرثیہ، میر اور سودا سے قبل ہی خاصی رواج پذیر ہوچکی تھی مگر حقیقتاً" یہ میر اور سودا ہی کا حصہ تھا کہ انہوں نے اس میں عمدہ تجربات کئے ۔ یہ

تجربات ہیئت اور مضمون دونوں میں ہیں ۔

دلی کی تباہی نے آرزو، سودا، میر، سوز اور میرحسن جیسے ارباب کمال کو وطن سے نکال کر شاہانِ اودھ کے دربار میں پہنچا دیا تھا ۔ چونکہ حکمرانوں کے اس سلسلے کا تعلق امامیہ مذہب سے تھا اس لئے یہاں اس صنفِ شعر کو بہت عروج حاصل کیا ۔ جن بزرگوں نے اسے بامِ عروج تک پہنچایا وہ میر خلیق، میرضمیر اور دلگیر ہیں اور ان میں دبیر کے استاد میرضمیر بہت نمایاں ہیں ۔

میر خلیق اور میرضمیر کے لکھنؤ میں دبیر ایک نوآموز مرثیہ گو کی حیثیت سے نمودار ہوکر جلد ہی بامِ شہرت پر جلوہ گر ہوجاتے ہیں ۔ مجالس کا انعقاد بکثرت تھا اور مرثیہ کی مانگ وافر ۔ شاہی سرپرستی بھی موجود تھی ۔ مرزا صاحب نے تعلیم خاص حاصل کی تھی ۔ اس کے ساتھ لکھنؤ اس وقت کا علمی گہوارہ تھا ۔ خواص و عوام میں شعر فہمی کا ملکہ موجود تھا ۔ محسناتِ شعر، شکوہ الفاظ اور معنی خیز تراکیب کو کمال شاعری سمجھا جاتا تھا ۔ مرثیہ کے دامن میں مضامین کی وسعت میرضمیر اور ان کے ہمعصر حضرات پیدا کرچکے تھے لیکن اس صنفِ سخن کی معراج مرزا دبیر اور میر انیس کی قسمت میں لکھی تھی ۔ مجالس بکثرت منعقد ہوتی تھیں ۔ اس لئے مراثی کی مانگ بھی بہت تھی ۔ لیکن پھر بھی فنکارانہ مقابلوں کی گنجائش موجود تھی اور مرثیہ گو حضرات ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے لئے کوشاں ہوتے ۔ اس عمل نے زبان کے ارتقاء میں مدد دی ۔

دبیر کے کلام میں اہلِ بیت سے بے پناہ محبت کا اظہار کیا گیا ہے ۔ لیکن یہ رواجی محبت نہیں بلکہ اس میں جذبات کا خلوص پایا جاتا ہے ۔ اس لئے ان کا کلام داخلی شاعری کا بہترین نمونہ ہے ۔ اگر وارداتِ قلبی کے بیان کا اعلیٰ نمونہ دیکھنا ہو تو دبیر کا مرثیہ

ے انگشتریٔ عرش کا یارب نگین دکھا

ملاحظہ فرمائیے ۔

مرثیہ گو شعراء کا اصل مقصد، واقعاتِ کربلا کا شاعرانہ بیان ہے ۔ اس سلسلے مین وہ قصے کے افراد کے احساسات و جذبات، داخلی اور ذہنی کشمکش اور قلبی کیفیات کی مصوری بھی کرتے ہین ۔ کیونکہ ان کے کردار پتھر کے مجسمے نہ تھے بلکہ اسی دنیا کے حقیقی افراد تھے ۔ جن پر حالات کا نفسیاتی ردِّ عمل ہوتا ہے ۔ دبیر اپنے کرداروں کے وجود اور ان کے مسرت و غم سے ناآشنا نہیں ۔ وہ نباضِ فطرت کی طرح اپنے کرداروں کے انبساط و انقباض مین شامل رہتا ہے اور مختلف کیفیات کے ردِّ عمل کو باقاعدہ بیان کرتا ہے ۔

شدّتِ تاثر اور جذباتِ غم کے بیان کے علاوہ دبیر کے کلام مین داخلی شاعری کے اعلیٰ نمونے حمد، نعت اور منقبت مین ملتے ہین ۔ یہان آپ کو خلوصِ قلب، گہری عقیدت اور سچی تڑپ کا مزہ ملتا ہے ۔ بدقسمتی سے ہماری زبان مین مدح کا لفظ بدنام ہے ۔ مگر جب مدح کی بنیاد، شاعر کے اندرونی ہیجانات اور وجدانی تجربات ہون تو اس مدح و منقبت کی بنیاد ممدوح اور مداح کے ربط و ضبط پر ہوتی ہے اور اس کا تعلق بقول مولانا شبلی (شعرالعجم جلد ۴ ص ۲۲۷ آگرہ ۱۹۱۲ء) جذباتی شاعری سے ہوتا ہے ۔

یون یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ اس قبیل کی شاعری کی اساس، چونکہ مذہبی اعتقاد پر ہے اس لئے اسے عظیم ادب مین مقام نہیں دیا جاسکتا ۔ لیکن ادبی دنیا کے بیشتر عظیم شاہکار، مذہبی عقائد پر مبنی ہین ۔ صرف تبلیغی نوعیت کی شاعری کو عظیم ادب سے خارج کیا جاسکتا ہے ۔ اگر شاعر کا محبوب، محبوبِ حقیقی ہے اور اس کا حسن، حُسنِ ازل ہے تو اس کے کلام کو ادبِ عظیم سے خارج نہیں کیا جاسکتا ۔

یہان یہ خیال رکھنا بھی ضروری ہے کہ شاعر کا خطاب بنیادی طور پر اپنی ذات سے ہے اور یہی داخلی شاعری کی پہچان ہے ۔

بعض نقاد، مرثیے کو ایپک کی حدود مین داخل سمجھتے ہین ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دوسرے مرثیہ گو حضرات کی طرح دبیر بھی، ایپک نہیں لکھتے بلکہ ان کا ہر مرثیہ ایپک

ایک مخصوص مجلس کے لئے ہے۔ یہ بھی ممکن نہیں کہ ہر مرثیہ کو ایک مربوط داستان کا ایک باب تصور کرلیا جائے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ واقعات کے بیان میں تاریخی ترتیب سے زیادہ، مجالس کی ضرورت کا خیال رکھا گیا ہے اور شاعر کا مقصد اسی قدر ہے۔ ہاں مختلف مراثی کی قطع وبرید اور مناسب ترتیب سے ایک ایک وجود میں آسکتی ہے مگر اس میں مرتب کسی کاوش کو مرثیہ گو کی محنت سے زیادہ دخل ہوگا۔

سانحۂ کربلا کو ایپک کی شکل دینے کے لئے اس حادثۂ جانکاہ کے اسباب وعلل کو گذشتہ تاریخی واقعات میں تلاش کرنا ضروری ہے۔ اور کہانی کے موضوع میں جاذب نظری پیدا کرنے کے لئے پلاٹ کے علاوہ حیرت کے عنصر یعنی تحیر Suspense کا ہونا ضروری ہے لیکن دبیر ان ضروریات کا خیال نہیں رکھتے بلکہ ایپک وبد کرداروں کے تضاد وتقابل سے کہانی میں دلکشی پیدا کرتے ہیں جو بجائے خود کم اہم نہیں۔ وہ کہانی سے ایک خاص مقصد اور عقیدہ کی تبلیغ بھی کرتے ہیں اور اس کے حصول کے لئے جزئیات کو استعمال کرکے کہانی کے موضوع اور ارتقاء میں بطور خام مواد کے، کام میں لاتے ہیں۔ ہیرو کی عظمت اور اس کے مقاصد کی اہمیت ان کے زیر نظر رہتی ہے۔ اسلوب بیان غیر مبہم اور موضوع کے مناسب ہے لیکن ان تمام امور کے باوجود ان کے بیان میں وہ ربط اور تسلسل نہیں پایا جاتا جو ایپک کے لئے ضروری ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ ان کا مطمع نظر صرف مخصوص مجالس کی مانگ کو پورا کرنا تھا۔ اس سلسلے میں وہ بعض اوقات متضاد روایات بھی نظم کرجاتے ہیں۔

دبیر دوسرے مرثیہ گو شعراء کی طرح مربوط داستان کی بجائے مختلف واقعات کو مختلف اوقات میں بیان کرتے ہیں اس سلسلے میں وحدت تاثر اور مرکزی خیال کا انہیں پورا احساس رہتا ہے۔ واقعات، متضاد عناصر اور زندگی کی کشمکش سے تشکیل پاتے ہیں۔ شاعر کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان اسباب وعلل سے بےخبر نہ ہو۔ واقعات کے بیان میں دبیر ماہر خصوصی کا درجہ رکھتے ہیں، وحدت تاثر ان کے کلام کی خاص خوبی ہے۔

دبیر کی غالباً " سب سے بڑی کمزوری مناظرِ فطرت کی تصویر کشی میں ظاہر ہوتی ہے، وہ صحیح مصوری سے عاجز آکر شکوہِ الفاظ کا سہارا لیتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ انیس اس مصوری میں دبیر سے بہت آگے ہیں +

داستان کو آپ مربوط اور مسلسل طور سے بیان کریں یا مختلف واقعات کو علحدہ علحدہ کرکے پیش کریں، کردار نگاری کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ۔ داستان میں کردار ہی مصنف کے زاویۂ نظر کے ابلاغ و اظہار اور ترسیلِ خیال کا واحد ذریعہ ہیں ۔ کرداروں کو ہم دو حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں ایک وہ جو فطری طور پر نیکی کی طرف مائل ہوتے ہیں اور دوسرے وہ جو فطری طور پر بدی کی جانب راغب ہوتے ہیں ۔ لیکن انسانی زندگی میں بے شمار حادثات، عواطف، خیالات اور خواہشات کردار کی تشکیل میں مد ہوتے رہتے ہیں ۔ اور بعض اوقات محض جذبات کے زیرِ اثر بعض اشخاص سے ایسے افعال سرزد ہوجاتے ہیں جو عام حالات میں ناممکن الوقوع ہوتے ۔ کردار نگاری میں ان حادثات اور نفسیاتی کیفیات کا تجزیہ کرنا نہایت ضروری ہے ۔

مرثیہ گو شعراء پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ہر حضرت کی مدح دوسرے پر بآسانی چسپاں کی جاسکتی ہے ۔ وہ کرداروں کی انفرادیت نمایاں نہیں کرسکتے ۔ لیکن یہ الزام درست نہیں ۔ المیۂ کربلا کے سب سے بڑے کردار حضرت امام حسین علیہ السلام ہیں ۔ دبیر نے انہیں فوق البشر کے کردار میں پیش کیا ہے ۔ انھوں نے بعض خوبیاں ان کے ساتھ مخصوص کردی ہیں ۔ مثلاً " حد سے بڑھی ہوئی بردباری اور حوصلہ " یہ صفات اسی درجہ میں حضرت عباس میں مفقود ہیں، حالانکہ وہ ان کے رشتہ کے بھائی ہیں ۔

لیکن یہاں یہ نتیجہ اخذ نہیں کرنا چاہئے کہ دبیر حضرت امام علیہ السلام کی بشری خوبیاں یا احساسات و جذبات سے بے خبر ہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ آپ کے کردار کی بڑی خوبی جذبۂ انسانیت (Human Touch) ہے، جسے دبیر نظرانداز نہیں کرتے ۔ بے شمار ایسے واقعات، متعلقہ مرثیہ جات میں منظوم ہیں ۔

اس کے علاوہ آپ کی جسمانی خصوصیات بلکہ ان کے کردار کا تشخص (Individualization of character) بھی نمایاں ہے ۔

حضرت امام حسین علیہ السلام کے علاوہ حضرت حر کا کردار بہت زیادہ متحرک (Dynamic) ہے ۔ اس کے بعد حضرات عون و محمد، حضرت حر کے بھائی اور غلام اور کئی دیگر افراد ایسے ہیں جو حالات کے اثرات اور ردعمل کو باقاعدہ قبول کرتے ہیں ۔ بلاشبہ کچھ کردار (Flat) بھی ہیں جو بعض اقدار کے خلاف نبردآزما ہیں ۔ اور ان کے لئے ان حالات میں ایسا ہی ہونا ضروری تھا ۔

اس سے پیشتر یہ ذکر کیا جاچکا ہے کہ دبیر جس معاشرے کے نمائندے تھے، محسنات شعر اس کی تہذیب کا جزو تھا ۔ چنانچہ دبیر کے ہاں بھی یہ التزام پورے عروج پر ہے ۔ شاید ہی کوئی لفظی اور معنوی صنعت ہوگی جو ان کے ہاں موجود نہ ہو مگر وہ عروس معنی کے بازوں کا بوجھل زیور نہیں بلکہ اس کے حسن کا نکھار ہے ۔ صنعت کو شاعر نے پیچیدہ قلبی واردات کے اظہار و ابلاغ کا ذریعہ بنایا ہے اور یہی اس کا مقصد ہے ۔ حسن کہیں بھی ہو حسن ہے اور محض آرائش کے جرم پر کوئی کلام مردود نہیں ہوسکتا ۔ دبیر کا کلام ایک خاص کلاسیکی نہج پر ہے ۔ اور ان کی قدرت بیان پر شاہد ہے ۔

سلام میں غزلیات کی طرح اعلیٰ درجے کے مضامین از قسم واردات قلبیہ و معاملات نذ ھیہ باندھے جاتے ہیں ۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ شوخی و رنگینی کے باوجود غزل سے یہ مختلف رہے ۔ مرزا دبیر کے تین سو بتیس (۳۳۲) سلام مطبوعہ موجود ہیں اور مذکورہ بالا معیار پر پورے اترتے ہیں ۔

رباعیات مرثیہ کے ساتھ بطور افتتاحیہ (Prologue) کے استعمال ہوتی تھیں ۔ مرثیہ گو شعراء نے اس صنف سخن کے ارتقا میں بہت مدد دی ہے ۔ ان کے ہاں اعلیٰ اخلاقی اسباق اور اقدار کا بیان صنف رباعی میں کیا گیا ہے اور بطور رباعی نگار کے دبیر کا رتبہ بہت بلند ہے ۔ آپ چار مصرعوں میں اعلیٰ سے اعلیٰ اور طویل سے طویل مضمون کو اس طرح بیان کر جاتے ہیں کہ گویا دریا کو کوزے میں بند کردیا گیا ہے ۔

فہرست مآخذ

الف ۔ کتب تاریخ (قلمی)

۱ انشائے فیض بخش مرتبہ فیض بخش کاکوروی ۱۲۰۵ھ پنجاب یونیورسٹی لاہور

۲ چہار گلزار شجاعی (ہرچرن داس) (۱۲۰۱ھ) پنجاب یونیورسٹی لاہور

۳ خلاصہ تاریخ وزیر علی خان (محمد حسین آزاد) پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور

(مطبوعہ)

۴ گذشتہ لکھنؤ عبدالحلیم شرر نسیم بک ڈپو لکھنؤ

۵ سرفراز اخبار لکھنؤ محرم نمبر (مکمل)

۶ قدیم ہنر و ہنرمندان اودھ سرفراز قومی پریس لکھنؤ ۱۹۳۶ء

۷ لطائف السعادت (سید انشاءاللہ خان انشاء) مرتبہ ڈاکٹر آمنہ خاتون کوثر پریس بنگلور ۱۹۵۵ء

۸ شباب لکھنؤ (ترجمہ دی لائف آف این ایسٹرن کنگ) از احمد علی لاا از ناشن الناظر پریس لکھنؤ ۱۹۱۲

۹ سیرالمتاخرین ہر سہ جلد منشی غلام حسین خان طباطبائی مطبوعہ نولکشور (نسخہ مملوکہ گورنمنٹ ہائی سکول جہلم)

۱۰ تاریخ اودھ پانچ جلد نجم الغنی خان نولکشور ۱۹۱۹ء

۱۱ الحسین عمر بن ابوالنصر مکتبہ جدید لاہور

۱۲ شہادت امام حسین ابوالکلام آزاد ۔ شیم بک ڈپو عبدالکریم روڈ لاہور

۱۳ سفیر اودھ محمد مسیح الدین علوی خان بہادر مطبوعہ الناظر پریس لکھنؤ

۱۴ قیصرالتواریخ سید محمد میر زائر (جمال الدین حیدر) نولکشور

۱۵ عمادالسعادت سید غلام علی مطبوعہ نولکشور ۱۲۹۷ھ

۱۶ تحفۃ العالم سید عبداللطیف شوستری مطبوعہ حیدرآباد ۱۲۲۳ھ

۱۷ فسانۂ عبرت رجب علی بیگ سرور نجم العلوم کارنامہ لکھنؤ

۱۸ جان عالم (مقدمہ حزن اختر) شرر ادارہ فروغ اردو لاہور

۱۹ رود کوثر شیخ محمد اکرام تاج آفس کراچی

۲۰ فہرست دربار تعلقداران اودھ (جس کی تصحیح گورنمنٹ نے ۱۵ جنوری ۱۸۹۳ء کو کی) ۔اودھ پریس لکھنؤ ۔

۲۱ بزم آخر مطبع ارمغان ظ دهلی ۱۸۸۵ع (نسخه پبلک لائبریری) بیشمار صفحات غائب

۲۲ ماد هوجی سندهیا (هند کے حکمران ایچ جی کین)
ترجمه اردو رولرز آف انڈیا خود عبدالسلام) جامعه عثمانیه ۱۹۲۳ع

۲۳ تاریخ هندوستان مولوی محمد ذکاءالله صاحب شمس المطابع دهلی ۱۸۹۸ع

۲۴ ترجمه فہرست تعلقداران اود ھ مع نمبرمائے فہرست ایکٹ ۱۸۶۹ع اود ھ پریس

۲۵ مسلم ثقافت هندوستان مین عبدالمجید سالك اداره ثقافت اسلامیه لاهور

۲۶ نادرات شاهی حالات و کلام شاه عالم ثانی از عرشی مطبوعه رامپور

کتب تاریخ (انگریزی)

1. Fall of the Mughal Empire, by Sir Jadua Nath Sarkar, (M.C. Sarkar and Sons, Calcutta, 1932).

2. Memoirs of Delhi and Faizabad, being a translation of the Tarrikh Farrah Bakhsh of Mohammad Faiz Bakhsh, by William Hoey, printed at the Govt. Press N.W Provinces and Oudh.

3. The First two Nawabs of Oudh, by A.L. Sarivastava, M.A., Ph.D. upper India Publishing House Ltd. Lucknow.

4. Later Mughals, by William Irvin, I.C.S. (2 Volumes) edited by J.N. Sarkar, Luzak & Co. London.

5. Shujauddolah by A.L. Srivastava (Two Volumes).

6. The Life of an Eastern King, by William Knighton, Oxford University Press.

7. Observations on the Mussalmans of India, by Mrs. Meer Hasan Ali, Oxford University 1917.

تذکرے

۱ تذکرہ جلوۂ خضر (صفیر بلگرامی) مطبوعہ نورالانوار آرہ (بہار)

۲ تذکرہ ریختی مرتبہ سید تمکین کاظمی شمس الاسلام پریس حیدرآباد دکن ۱۹۳۰ء

۳ تذکرہ آب بقا مولفہ خواجہ عبدالروٗف عشرت نولکشور لکھنئو ۱۹۱۸ء

۴ تذکرۂ ھندی (مصحفی) جامعہ برقی پریس دھلی ۱۹۳۳ء

۵ ریاض الفصحا (مصحفی) ایضا " ۱۹۳۴ء

٦ ذکر میر (میر تقی میر) انجمن ترقیٔ اردو اورنگ آباد ۱۹۲۸ء

۷ مجموعہ نغز (میر قدرت اللہ قاسم) بحد تصحیح محمود شیرانی مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی لاھور ۱۹۳۳ء

۸ مجالسِ رنگین شائع کردہ سید مسعود حسن رضوی ادیب نظامی پریس لکھنئو ۱۹۲۹ء

۹ کاشف الحقائق، امداد امام اثر مکتبہ معین الادب لاھور

۱۰ آب حیات، آزاد، اسلامیہ اسٹیم پریس لاھور ۱۹۱۷ء

۱۱ شعرالہند، عبدالسلام ندوی، مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۲۳ء

۱۲ گل رعنا، سید عبدالحی، مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۳۴۳ھ

۱۳ شعر العجم (شبلی) مطبوعہ مفید عام آگرہ ۱۹۱۲ء

۱۴ داستان اردو، نواب نصیر حسین خیال، ادارہ اشاعت اردو حیدرآباد دکن

۱۵ سخن شعراء، عبدالغفور نساخ، نولکشور لکھنئو ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء

۱٦ سراپا سخن، سید محسن علی مولوی، مطبع نولکشور لکھنئو ۱۸۹۸ء

۱۷ خم خانۂ جاوید، جلد اول تا سوم سری رام گلاب سنگھ پریس لاھور ۱۹۱۱ء

۱۸ ایضا " جلد چہارم سری رام ہمدرد پریس دھلی ۱۹۲٦ء

۱۹ ایضا " جلد پنجم سری رام مرتبہ کیفی ۱۹۴۰ء

۲۰ تاریخ ادب اردو، رام بابو سکسینہ، مترجمہ عسکری، کتب خانہ علمیہ کشمیری بازار لاھور

۲۱ سودا، شیخ چاند، انجمن ترقی اردو اورنگ آباد ۱۹۳٦ء

۲۲ تذکرہ شعراء، مصنفہ ابن امین اللہ طوفان مرتبہ قاضی عبدالودود مئی ۱۹۵۲ء مطبع آزاد پریس پٹنہ ـــ

۲۳ حیات دبیر، سید افضل حسین ثابت لکھنوی، جلد اول سیوک اسٹیم پریس لاہور

ایضاً " ایضاً " جلد دوم امامیہ بک ایجنسی لاہور

۲۴ دربار حسین ، ایضاً " مطبع اثنا عشری دہلی

۲۵ خطبات گارساں دتاسی، انجمن ترقی اردو اورنگ آباد ۱۹۳۵ء

۲۶ شعر و ادب فارسی، موتمن، کتاب خانہ ابن سینا طہران

۲۷ میر تقی میر، حیات اور شاعری، احمد فاروقی، انجمن ترقی اردو علی گڑھ

۲۸ گل عجائب، اسد علی خان تمنا، انجمن ترقی اردو اورنگ آباد ۱۹۳۶ء

۲۹ چمنستان شعراء، لچھمی نرائن شفیق، مطبوعہ انجمن ترقی اردو حیدرآباد

۳۰ میر حسن اور خاندان کے دوسرے شعراء، محمود فاروقی، مکتبہ جدید لاہور

۳۱ تذکرہ شوق، عطاء اللہ پالوی، مکتبہ جدید لاہور ۱۹۵۶ء

۳۲ جرأت ان کا عہد اور عشقیہ شاعری، ابواللیث صدیقی، اردو اکیڈیمی کراچی ۱۹۵۲ء

۳۳ تحقیقی مطالعے، ڈاکٹر نذیر احمد، دانش محل لکھنؤ ۱۹۵۲ء

۳۴ ولی گجراتی، ظہیرالدین مدنی، انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹیٹیوٹ بمبئی ۱۹۵۰ء

۳۵ احوال غالب، مختارالدین احمد، انجمن ترقی اردو علی گڑھ

۳۶ مصحفی اور ان کا کلام، ابواللیث صدیقی، شیخ مبارک علی لاہور

۳۷ تنقید آب حیات، میر محمد رضا ظہیر، مطبوعہ لکھنؤ ۱۳۰۳ھ

۳۸ آب حیات کا تنقیدی مطالعہ، سید مسعود حسن رضوی ادیب کتاب نگر دین دیال روڈ لکھنؤ۔

۳۹ شاہکار انیس، حامد حسن قادری، آگرہ اخبار پریس آگرہ

۴۰ حیات انیس، سید امجد علی اشہری، مطبع آگرہ اخبار

۴۱ واقعات انیس، سید مہدی حسین احسن، فخرالمطابع لکھنؤ

۴۲ تذکرہ جواہر سخن، محمد مبین کیفی، ہندوستان اکاڈمی الہ آباد ۱۹۳۶ء

۴۳ تاریخ ادبیات ایران درعہد جدید، ڈاکٹر براؤن، ترجمہ سید وہاج الدین احمد کنتوری، انجمن ترقی اردو ہند دہلی ۱۹۳۹ء

۴۴ سیر دہلی، (سیر ریاض) شیخ محمد ریاض الدین امجد، مطبع حیدری آگرہ ۱۸۶۱ء

۴۵ تذکرہ جدید شعرائے اردو، فیروز سنز لاہور

۴۶ شمس الضحیٰ (میر صفدر حسین) مطبع اثنا عشری لکھنؤ ۱۲۹۸ھ

۴۷ اعمالنامہ، سر رضا علی، ہندوستان پبلشرز دہلی ۱۹۴۳ء

۴۸ دکن میں اردو، نصیر الدین ہاشمی، مکتبہ معین الادب لاہور ۱۹۵۲ء

۴۹ یورپ میں قدیم دکنی مخطوطات، نصیر الدین ہاشمی ۔

۵۰ اردو شہ پارے، ڈاکٹر محی الدین قادری زور

۵۱ تذکرہ سلکِ گہر (جاوید انصاری برہان پوری) نسخہ پنجاب پبلک لائبریری

۵۲ اردو شعراء کے تذکرے، ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، مکتبہ جدید لاہور ۱۹۵۲

۵۳ مقدمہ سحر شاعری، افضل حسین ثابت، معارف ایجنسی، نخاس لکھنؤ ۱۹۳۰ء

۵۴ چند ہمعصر، ڈاکٹر مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ

۵۵ محرم نامہ، کہ سب رس، حیدرآباد دکن ۱۳۵۸ھ

۵۶ تاریخ ریختی مع دیوان جان صاحب، مطبوعہ نظامی پریس بدایوں

۵۷ تذکرہ گلشن بیخار (شیفتہ) نولکشور لکھنؤ ۱۸۷۲ء

۵۸ تذکرہ گلستانِ بیخزاں، (حکیم سید قطب الدین باطن) نولکشور ۱۲۹۱ھ

۵۹ حیات فرہاد، سید علی محمد شاد عظیم آبادی (نسخہ مملوکہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری) مطبوعہ مطبع معارف دارالمصنفین اعظم گڑھ

۶۰ چراغ دہلی، مرزا حیرت دہلوی مطبوعہ ۱۹۳۰ دہلی

۶۱ تذکرہ یادگار ضیغم، عبداللہ خان ضیغم، مطبع گلزار دکن حیدرآباد ۱۳۰۳ھ

۶۲ تذکرہ نادر، مولفہ کلب حسین خان نادر (شاگرد ناسخ) مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب لکھنؤ (نسخہ پنجاب پبلک لائبریری)

۶۳ مرآۃ الشعرا، محمد یحییٰ تنہا، عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور ۱۹۲۵ء

تنقید

۱ موازنہ انیس و دبیر، شبلی، مطبوعہ شیخ مبارک علی لاہور

۲ المیزان، سید نظیر الحسن فوق، مطبع فیض عام علی گڑھ

۳ تطہیر الاوساخ لنسخ التسلخ، معجز، مطبع شعلہ کانپور ۱۲۹۶ھ

۴ مقدمہ صبر جمیل، افضل حسین ثابت مطبع اثنا عشری دہلی ۱۹۲۲ء

۵ مقدمہ شعر و شاعری، حالی مرتبہ ڈاکٹر وحید قریشی مکتبہ جدید ۱۹۵۳ء

۶ الانتقادیات، نیاز فتح پوری، مکتبہ معین الادب لاہور

۷ ادب اور سماج، سید احتشام حسین، پبلشرز لمیٹڈ بمبئی ۱۹۴۸ء

۸ نقد حیات، ممتاز حسین، الہ آباد پبلشنگ ہاؤس ۱۹۵۰ء

۹ بہترین ادب، مکتبہ اردو لاہور ۱۹۵۰ء

۱۰ بوطیقا (فن شاعری) ارسطو، ترجمہ عزیز احمد انجمن ترقی اردو ہند دہلی ۱۹۲۱ء

۱۱ انسان اور آدمی، محمد حسن عسکری مکتبہ جدید لاہور ۱۹۵۳ء

۱۲ یادگار غالب، حالی شیخ مبارک علی لاہور

۱۳ اردو میں ڈراما نگاری، سید بادشاہ حسین تاج بکڈپو لاہور ۱۹۵۰ء

۱۴ روح تنقید، سید محی الدین قادری زور، مکتبہ معین الادب لاہور ۱۹۵۵ء

۱۵ تنقیدی اصول اور زاویے، حامد اللہ افسر، انوار بکڈپو لکھنؤ ۱۹۵۲ء

۱۶ نئی قدریں، ممتاز حسین، مکتبہ اردو لاہور ۱۹۵۳ء

۱۷ مرثیہ نگاری اور انیس، محمد احسن فاروقی، اردو اکیڈیمی لاہور

۱۸ انیس کی مرثیہ نگاری، اثر لکھنوی، دانش محل لکھنؤ

۱۹ ادبی اقدار، سلیم احمد، مرکز ادب کراچی

۲۰ نئے دھارے، عبدالقادر سروری کتاب منزل لاہور ۱۹۴۸ء

۲۱ تحقیق و تنقید، اختر اورینوی، شاد بکڈپو پٹنہ

۲۲ نقد میر، ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، آئینہ ادب لاہور ۱۹۵۸ء

۲۳ ولی سے اقبال تک ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، مکتبہ جدید لاہور ۱۹۵۸ء

۲۴ ہماری داستانیں، سید وقار عظیم، لاہور ادارہ فروغ اردو۔

۲۵ غزل اور مطالعہ غزل، عبادت بریلوی، انجمن ترقی اردو کراچی

۲۶ غزل اور متغزلین، ابواللیث صدیقی، اردو مرکز لاہور ۱۹۵۵ء

۲۷ اردو شاعری پر ایک نظر، کلیم الدین احمد، قومی پریس بانکی پور پٹنہ

۲۸ اردو تنقید پر ایک نظر، کلیم الدین احمد، قومی پریس بانکی پور پٹنہ

۲۹ فن داستان گوئی، کلیم الدین احمد، دائرہ ادبیہ بانکی پور

۳۰ ہماری شاعری، سید مسعود حسن رضوی ادیب، نولکشور لکھنؤ ۱۹۲۲ء

۳۱ اردو غزل، ڈاکٹر یوسف حسین، مکتبہ جامعہ دہلی

۳۲ الانتقاد، سید عابد علی عابد، ادارہ فروغ اردو لاہور ۱۹۵۶ء

۳۳ مقدمہ آتشکدہ (دیوان تاثیر) مقدمہ از سید عابد علی عابد

۳۴ تنقیدی جائزے، سید احتشام حسین ادارہ اشاعت اردو حیدرآباد دکن

۳۵ تنقید کیا ہے ؟ آل احمد صاحب سرور ۔ مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۵۲ع

۳۶ نئے اور پرانے چراغ، آل احمد صاحب سرور، اردو اکاڈمی کراچی ۱۹۵۱ع

۳۷ اردو تنقید کا ارتقا ۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی، مطبوعہ انجمن ترقی اردو کراچی

۳۸ بحث و نظر، ڈاکٹر سید محمد عبداللہ صاحب، مطبوعہ مکتبہ اردو لاہور

۳۹ نقد و نظر، حامد حسن صاحب قادری، مطبوعہ آگرہ

۴۰ تاریخ و تنقید، حامد حسن صاحب قادری مطبوعہ آگرہ

۴۱ اردو کا تنقیدی سرمایہ، پروفیسر عبدالشکور

۴۲ لکھنؤ کی زبان، محمد باقر شمس لکھنوی، ضیا برقی پریس کراچی

۴۳ مقالات شبلی، جلد دوم و چہارم ۱۹۵۰ و ۱۹۳۲ علی الترتیب مطبع معارف اعظم گڑھ

۴۴ فن تنقید اور تنقیدین، مرتبہ عبدالرزاق

۴۵ مشاطۂ سخن، صفدر مرزا پوری نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری

۴۶ کاروان ادب، فیروز سنز لاہور

۴۷ احوال غالب، مختارالدین احمد ۔ انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ ۱۹۵۳ع

۴۸ کیفیہ، دتاتریہ کیفی، مکتبہ معین الادب لاہور ۱۹۵۰ع

۴۹ تنقیدی حاشیے، مجنون گورکھپوری، اشاعت اردو حیدرآباد دکن ۱۹۳۵ع

۵۰ اندازے، فراق گورکھپوری

۵۱ معرکہ شرر و چکبست، مرزا محمد شفیع شیرازی نولکشور ۱۹۳۲ع

۵۲ سخن ہائے گفتنی کلیم الدین احمد ادارہ فروغ اردو لکھنؤ ۱۹۵۵ع ۔

کتب تنقید (انگریزی)

1. Parker. E. Critical Essays of today, Macmillan & Co. London, 1932.

2. Robert Leeder & Robert Withengton. The Art of Literary criticism, 1941. (Belongs to Punjab Public Library)

3. Eliot, T.S. Selected Essays, ~~Faber~~ Faber & Faber, Ltd, London, 1951.

4. Scott James R.A., Making of Literature, Marten Secker Ltd., London, 1946.

5. Forster F.M., Aspects of Novel, Edward Arnold & Co. London 1949 & 1953.

6. Jepson R.W. & Boulter, B.C. More Modern Essays, Longman green & Co., London, 1949.

7. Influence of Arabic on Persian Poetry, by Umar Mohammad Daud Pota, Bombay, 1934.

8. Anis and Shakespeare, by Seyed Ghulam Imam, Lucknow, 1950.

9. Colling Wood R.A. The Principles of Art, Oxford University Press, London, 1955.

10. Crawshaw, Interpretation of Literature, Macmillan & Co. London 1896.

11. Richards, I.A., Principles of Literary Criticism, Rovtledge & Kegan Panl Ltd. Lonodn, 1955.

12. H.V. Routh, God, Man and Epic Poetry, Cambridge, 1926.

13. Percy Lu bback, The Craft of Fiction Jouthan Cape Ltd., London, 1924.

14. Eliot T.S., On Poetry & Poets, ~~Faber~~ Faber & Faber, Ltd, London, 1956.

15. Bowra, C.M., The creative Experiment, Macmillan, 1949.

16. Bowra, C.M. From Virgil to Milton, Macmillan, 1945.

17. Ingram Bywater, Poetics Gilbert Murray, Oxford, 1954.

18. Arthur Melville Clark, Studies in Literary modes, Oliver & Boyd, 1946.

19. David Daiches, Critical Approaches, Literature, Longman Green & Company, 1956.

20. Literary Essays by David Daiches, Oliver & Boyd, London, 1936.

21. Eliot, T.S., Poetry & Drama, Faber & Faber, 1950

22. Joyce Cary, Art & Reality, Cambridge, 1958

فصاحت و بلاغت و فن تاریخ گوئی

۱ المعجم فی معاییر اشعار العجم شمس الدین محمد بن قیس رازی طہران ۱۳۱۴ شمسی

۲ تذکرۃ البلاغت مولوی ذوالفقار علی مطبع مجتبائی دہلی ۱۹۲۳ء

۳ فکر بلیغ شاد عظیم آبادی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور

۴ بحر الفصاحت مولوی محمد نجم الغنی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری

۵ ترجمہ اردو حدائق البلاغت محمد ادریس مکتبہ شرقیہ کراچی

۶ مفتاح البلاغت احمد غریب نواز تاج بک ڈپو لاہور

۷ نکات سخن حسرت موہانی انتظامی پریس حیدرآباد دکن

۸ ترجمان البلاغت محمد بن عمر الرادویانی چاپخانہ استنبول ۱۹۴۹ء

۹ ملہم تاریخ سید اقتدار احمد ساحر مطبع العلوم مرادآباد

۱۰ غرائب الجمل از نواب عزیز جنگ بہادر عزیز المطابع حیدرآباد ۱۳۳۷ء

۱۱ دریائے لطافت میر انشاء اللہ خان انشاء ترقی اردو ۱۹۳۵ء (ترجمہ کیفی ترتیب ڈاکٹر عبدالحق) ۔

مقالات (پی ایچ ڈی)

۱ زندگی اور ادب شاہان اودھ کے عہد میں ڈاکٹر صفدر حسین غیر مطبوعہ

۲ سعادت یار خان رنگین ڈاکٹر صابر علی خان غیر مطبوعہ

۳ لکھنؤ کا دبستان شاعری ابواللیث صدیقی مطبوعہ اردو مرکز لاہور ۱۹۵۵ء

۴ دلی کا دبستان شاعری ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ۱۹۴۹ء

۵ اردو تنقید کا ارتقا ڈاکٹر عبادت بریلوی انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی

۶ مذہب و شاعری ڈاکٹر اعجاز حسین اردو اکادمی سندھ کراچی

فلسفہ و نفسیات

۱ مبادی فلسفہ حصہ اول و دوم عبدالماجد دریابادی مطبوعہ معارف علی گڑھ ۱۹۳۱ء

۲ فلسفہ جذبات عبدالماجد دریابادی مطبوعہ انجمن ترقی اردو ہند

۳ انواع فلسفہ ظفر حسین خان انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ ۱۹۵۲ء ترجمہ ٹائپس آف فلاسفی ولیم ارنسٹ ہاکنگ



۴ تعلیمی نفسیات عبدالحی جمیل طوی کتاب منزل لاہور ۱۹۲۹ء

5. Educational Psychology, L.R. Shukla, N.K. Bros, Benaras, 1948.

6. Jennings H.S. Biological Basis of Human Nature, Norton and Co., 1930.

7. Shull, A.F. Heredity (3rd Ed.) (Mc Graw Hill), 1938.

8. Scheifeld A. You and Heredity (Chatto & Windson, London) 1939.

9. Mc Dougall, W, Introduction to Social Psychology (London: Methvan) 1937.

10. MC Dougall, W. An outline of Psychology, (London: Methnen).

11. Bertrand Russell, The Analysis of mind, George Allan & unwin Ltd. London, 1951.

12. Ross, J.S. Ground wark of Educational Psychology (London: Harrap) 1936.

13. James W. Principles of Psychology (Macmillan)

۱۴ اخلاق ناصری علامہ محقق نصیرالدین طوسی مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی ۱۹۵۲ء

مرثیہ و انتخاب مرثیہ

۱ مراثی میرتقی میر شائع کردہ انجمن محافظ اردو نیا محل منصور نگر لکھنؤ ۱۹۵۱ء

۲ مرثیہ انیس جلد اول تا چہارم نولکشور لکھنؤ

۳ مجموعہ مرثیہ منشی دلگیر مطبوعہ نولکشور کان پور ۱۸۹۷ء

۴ مجموعہ مرثیہ میر ضمیر مطبوعہ نولکشور کان پور ۱۸۸۴ء

۵ روح انیس مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب انڈین پریس الہ آباد

۶ مراثی و دیگر کلام دبیر دفتر ماتم بیس جلد (کلیات دبیر) مطبع شاہی لکھنؤ بار دوم ۱۹۱۲ء

۷ مراثی دبیر مطبوعہ نولکشور ۱۸۷۷ء

۸ ایضاً ۱۸۹۰ء

۹ ایضاً ۱۹۳۷ء (بعد تصحیح مرزا طاہر رفیع)

۱۰	سبع شانی انتخاب دبیر مختار بک ڈپو لکھنؤ ۱۹۳۰
۱۱	هفت آیات ایضاً "
۱۲	هشت بهشت ایضاً "
۱۳	انتخاب دبیر تاجور اردو مرکز (عطر چند کپور) لاهور
۱۴	انتخاب انیس و دبیر حامد حسن قادری شاهین برقی پریس پشاور
۱۵	پیام زندگی تیره جلد تاجور اردو مرکز لاهور
۱۶	مدائح و مراثی ایضاً "
۱۷	تصویر جذبات ایضاً "
۱۸	مناظر فطرت ایضاً "
۱۹	صبر جمیل ثابت لکھنوی مطبع اثنا عشری دهلی ۱۹۲۲ع
۲۰	بدر کامل سید سرفراز حسین خبیر مختار بک ایجنسی لکھنؤ
۲۱	رزم نامه انیس سید مسعود حسین رضوی ادیب سرفراز قومی پریس لکھنؤ

موسیقی

۱	معارف النغمات محمد نواب علی خان مختار المطابع لکھنؤ
۲	پاکستانی موسیقی اداره مطبوعات پاکستان کراچی

مجموعه هائے ضامین (کلیات وغیره)

۱	ضامین فرحت حصه اول انارکلی کتاب گھر لاهور
۲	ایضاً " حصه دوم عبدالحق اکادمی حیدرآباد دکن
۳	جذبات فطرت الیاس برنی مطبوعه مسلم یونیورسٹی انسٹیٹیوٹ علی گڑھ
۴	مناظر فطرت الیاس برنی مسلم یونیورسٹی انسٹیٹیوٹ علی گڑھ
۵	مثنویات میرحسن مقدمه از عبدالباری آسی و شیر علی افسوس نولکشور ۱۹۲۵ع
۶	مثنوی گلزار نسیم اردو اکادمی پنجاب لاهور
۷	کلیات ولی مرتبه سید نورالحسن هاشمی انجمن ترقی اردو پاکستان ۱۹۵۲ع
۸	فسانه عجائب منشی رجب علی بیگ سرور نولکشور لکھنؤ
۹	فسانهٔ آزاد لاله رتن ناتھ سرشار مطبوعه نولکشور نسخه مملوکه گورنمنٹ هائی سکول جهلم

۱۰ قومی تہذیب کا مسئلہ ڈاکٹر سید عابد حسین انجمن ترقی اردو علی گڑھ ۱۹۵۵ء

۱۱ کلیات سودا مرتبہ عبدالباری آسی ۔ نولکشور نولکشور ۱۹۳۲ء

کتب لغت و حوالہ

۱ انسائکلوپیڈیا برٹانیکا نسخہ جات مملوکہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری پنجاب پبلک لائبریری و ہائر سیکنڈری سکول جہلم

۲ انسائکلوپیڈیا آف اسلام نامکمل نسخہ مملوکہ گورنمنٹ ہائی سکول جہلم

۳ دی ڈکشنری آف انگلش لینگویج ہیری سیسل وائلڈ لنڈن ۱۹۳۲ء

۴ کنسائز آکسفورڈ ڈکشنری ۱۹۳۲ء کلیرنڈن پریس

۵ کنسائز انگلش ڈکشنری ڈاکٹر اینڈیل بلیکی اینڈ سنز لنڈن

۶ اے ڈکشنری آف سائکالوجی جیمز ڈریور پنگوائن ریفرنس بکر

۷ اے ڈکشنری آف فلاسفی ڈاگوبرٹ ڈی رنز جیکو پبلشنگ ہاوس بمبئی

۸ سٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری ڈاکٹر عبدالحق انجمن ترقی پریس کراچی ۱۹۵۶ء

۹ المنجد لوئیس معلوف لیسوعی مطبوعہ بیروت ۱۹۳۱ء

۱۰ غیاث اللغات باستناد کشف صراح منتخب و مدار مع چراغ ہدایت حاشیہ از سراج الدین علی خان آرزو مطبوعہ گلاب سنگھ لاہور ۱۹۳۵ء

۱۱ ہندوستانی لسانیات (بالخصوص باب لکھنئو کی خدمات) زور معین الادب لاہور ۱۹۵۵ء

۱۲ سرگذشت الفاظ احمد الدین شیخ مبارک علی لاہور ۱۹۳۲ء

۱۳ تقویم ہجری و عیسوی مرتبہ ابوالنصر محمد خالدی بہ نظر ثانی مولوی محمود احمد خان صاحب مطبوعہ انجمن ترقی اردو ۱۹۵۲ء

رسائل و اخبارات

۱ سالنامہ ادبی دنیا لاہور ۱۹۳۷ء

۲ فائل ادبی دنیا لاہور ۱۹۳۳ ۱۹۳۴

۳ سالنامہ ادب لطیف لاہور ۱۹۳۶ء اردو نمبر ۱۹۵۵ ۔ سالنامہ ۱۹۵۸ سالنامہ ۱۹۵۹

۴ نقوش لاہور دہ سالہ نمبر ۱۹۵۸ء منٹو نمبر مکاتیب نمبر اول و دوم شخصیات نمبر اول و دوم طنز و مزاح نمبر جون ۱۹۵۶ء

٥ همایون لاهور جوبلی نمبر ۱۹۲۷ سالنامہ ۱۹۵۸ء

٦ رسالہ شاعر آگرہ آگرہ سکول نمبر ۱۹۳۷ء

۷ رسالہ صحیفہ لاہور مکمل فائل

۸ رسالہ معاصر پٹنہ شمار ایک تا گیارہ

۹ روزنامہ جنگ استقلال ایڈیشن کراچی

۱۰ روزنامہ امروز لاہور مضمون سید عابد علی عابد (لکھنئو اور دہلی کے شعری دبستان معنوی افتراق اور اعتقادی حد بندیاں) و دہ سالہ نمبر ۱۹۵۸ء و خاص نمبر ۱۲ اگست ۱۹۵۸ء

۱۱ ماہنامہ نقش کراچی منتخب ادب نمبر ۱۹۵۷ء

۱۲ ماہنامہ قند مردان شمارہ ماہ اگست ۱۹۵۸ء

۱۳ رسالہ ندیم گیا مکمل فائل مملوکہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری

۱۴ انتخاب مخزن رسالہ مخزن لاہور مطبوعہ فیروز سنز لاہور

۱۵ اودھ اخبار فائل ۱۸۷۴ء ۱۸۷۵ء

۱٦ نئی تحریریں مکمل فائل (شمارہ ایک تا پانچ)

اجمالی خاکہ

حصہ اول

سیاسی مجلسی اور ثقافتی پسِ منظر — (مرثیہ کے فروغ کے اسباب)

الف — اودھ کی مختصر تاریخ — (سیاسی پس منظر)

برہان الملک — صفدر جنگ — شجاع الدولہ — جنگ بکسر اور اس کے نتائج — اودھ مین عملاً انگریزی عملداری کا قیام — آصف الدولہ — زندگی سے فرار — عیش و طرب مین پناہ — مذہبی انہماک مین سکون قلب کی تلاش — نواب سعادت علی خان اور ان کی جزرسی — ریذیڈنٹون کا طریق کار — غازی الدین حیدر — دہلی کی مرکزی حکومت سے انقطاع — ان کے جانشین — واجد علی شاہ — انتزاع سلطنت

ب — مجلسی اور معاشی پس منظر (مرثیہ کے فروغ کے اسباب)

اودھ کی عام معاشرت — موسیقی کا شوق — ٹھمری کی ایجاد — طوائفین — ریختی — سوز خوانی — سوزخوانی کا مرثیے پر اثر — لکھنئو کی ادبی میراث — مرزا شوق کی مثنویان — ان مین لکھنوی معاشرت کی تصویرین — مرثیہ کے فروغ کے خاص اسباب — لذتِ الم — مذہبی تقریبات کی اہمیت — محرم — امرا کی سرپرستی — اہم مجالسِ عزا — ہندو عزادار مسلمان روسا کی مجالس — لکھنوی معاشرت پر مرثیے کے اثرات — سلام اور رباعیان — انیس اور دبیر کی مقبولیت — دونون کے اندازِ سخن کی طرف اجمالی اشارہ —

حصہ دوم (سوانح)

باب اول (دبیر کے ابتدائی حالات)

دبیر کا خاندان — اور کاغذ فروشی — تحقیق — دبیر کی استعداد علمی اور ذہانت — آغازِ شاعری

باب دوم (دبیر کی شہرت اور ترقی کے اسباب)

بیگمات اور شاہان اودھ کی ضعیف الاعتقادی — دبیر شاہی عزاخانے مین — استاد سے ناچاقی
دبیر اور غزل گوئی — دبیر کا اہتمام کہ اس کا کلام غزل باقی نہ رہے — دبیر کے پڑھنے کا انداز
شاگرد — شاگردون کے کلام پر اصلاح دینے کا طریق — انداز تصنیف — واجد علی شاہ اور
دبیر —

باب سوم (دبیر کی شخصیت)

عام لوگون سے تعلقات — فیاضی — وضعداری — ایفائے عہد — فنون جنگ مین مہارت —
زہد — مداحین —

باب چہارم (انیس اور دبیر کی معاصرت)

کلام دبیر کا کلام انیس پر تقدم زمانی —— سلام کا قصہ — کون کس کی تقلید کرتا تھا
(اس سوال کا جواب اور مختلف روایات اور ان پر محاکمہ) — مولانا شبلی کا کتاب کے میرو کے
متعلق غلط مفروضہ — میر انیس اور مرزا دبیر کا ایک مجلس مین پڑھنا (مختلف روایات اور
محاکمہ)

باب پنجم (دبیر کا عالم ضعیفی)

الحاق اودھ اور اس کے تمدنی اور سیاسی اثرات — ارباب کمال کی زبون حالی، پریشانی اور
ضعف بصر — دبیر کا ظہور عظیم آباد اور کلکتہ جانا — واجد علی شاہ کی قدردانی —
شاد عظیم آبادی کی شاگردی کا قصہ — شاد کے اساتذہ — آخری عمر مین صدمات — نوجوان
فرزند — بھائی اور میر انیس کی وفات اور اس کا دبیر پر اثر — انیس کی وفات پر دبیر کا
قطعۂ تاریخ — اودھ اخبار مین قطعہ کی اشاعت — مادہ تاریخ اور قطعہ مین اغلاط — کیا یہ قطعہ
یہ قطعہ تاریخ دبیر کی تصنیف ہے؟ — عظیم آباد مین آخری مجلس — وفات — مشہور قطعات
تاریخ — مزار — اولاد ——

حصہ سوم (کلام)

باب اول (کلام)

الف ـ کلام کی مقدار اور مختلف ایڈیشن ـ کلام کی مقدار مین متضاد روایات ـ تحریف ـ کتابت کی غلطیان ـ کلام کی مقدار ـ الحاقی کلام ـ غیر مطبوعہ کلام ـ مختلف ایڈیشن ـ معصلہ بحور ـ

ب ـ منازلِ ارتقا

کلام کی تاریخی تدوین ـ ابتدائی مرثیے ـ ۱۲۵۰ ھ سے قبل کے مرثیے ۱۲۵۰ ھ سے لے کر انتزاعِ سلطنت تک کا کلام ـ انتزاعِ سلطنت ـ بعد کا کلام ـ

ج ـ دبیر کے عہد کی زبان اور دبیر کو زبان پر قدرت ـ

باب دوم

الف ـ اصطلاحی مرثیہ کی قدروقیمت کی تعیین ـ ~~تعریف~~ تعریف ـ اقسام شخصی مرثیے ـ اجماعی اور ملی مرثیے ـ

ب ـ اردو مرثیہ اور دیگر اصناف سخن

مرثیہ اور ایپک ـ ایپک کی خصوصیات ـ ارسطو کی رائے ـ ~~بلوطا~~ باورا کی رائے رزمیہ اور حماسہ ملی ـ کیا مرثیہ کو ایپک کی حدود مین داخل کیا جاسکتا ھے مشترک خصوصیات ـ مرثیہ اور مناظرِ فطرت کی تصویر کشی ـ مناظرِ فطرت کی تصویر کشی کی مختلف صورتین ـ مرثیہ اور داخلی شاعری ـ ابلاغ جذبات اور جذبات انگیزی ـ مرثیہ گوئی کے مقاصد ـ مرثیہ اور مذہبی شاعری ـ اصطفاف اور طبقہ بندی مین مشکلات ـ بارکر کی رائے ـ مرثیہ کے دیگر مقاصد ـ مداحی ـ کردار نگاری ـ مرثیہ اور المیہ ـ مرثیہ مین واقعات کا بیان ـ مرثیہ کی طوالت ـ

باب سوم ـ مرثیہ دبیر سے پہلے

باب چہارم ـ دبیر کے کلام کا تجزیہ

باب پنجم ـ دبیر کے کلام میں ایپک کے عناصر

باب ششم ــ دبیر اور واقعات نگاری

واقعہ اور طویل داستان ــ واقعہ اور افسانہ ــ مرثیہ اور افسانہ ــ بیان واقعات میں زندگی کی جھلک ــ خارجی حالات ــ اتفاقات ــ اسباب و علل ماحول اور نفسیاتی جائزہ ــ وحدت تاثر ــ رمزیت اور مقصدیت ــ دبیر کی واقعہ نگاری پر تبصرہ ــ حیرت انگیز قوت مشاہدہ ــ فضا کی یکرنگی اور تسلسل

باب ہفتم ــ دبیر بحیثیت کردار نگار

داستان میں کردار نگاری کی اہمیت ــ کردار نگاری کے بعض اصول ــ مدح اور کردار نگاری ــ کرداروں کی تقسیم ــ نوعی یعنی سپاٹ کردار ــ تخیلی اور متحرک کردار ــ حضرت امام حسین کا کردار (فوق البشر) حضرت کے کردار میں شفقت ــ حضرت ~~[illegible]~~ کی بعض جسمانی کیفیات ــ حضرت کے کردار کا تشخص اور تعیین/دیگر متحرک کردار ــ حر کا کردار ــ بقیہ کردار ــ

باب ہشتم ــ دبیر اور مناظر فطرت کی تصویر کشی

مناظر فطرت کی تصویر کشی کی مختلف صورتیں ــ اس میں دبیر کی بے چارگی ــ اسباب ــ



حصہ اول

مجلسی اور ثقافتی پس منظر

نوابان اودھ

۱۱۳۶ھ تا ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۷۲۲ء تا ۱۸۵۶ء

(۱) سعادت خان برہان الملک

(۲) (دختر) ابوالمنصور خان صفدر جنگ ۱۱۵۲ھ تا ۱۱۶۷ھ مطابق ۱۷۳۹ء تا ۱۷۵۳ء

(۳) شجاع الدولہ ۱۱۶۷ھ تا ۱۱۸۸ھ مطابق ۱۷۵۳ء تا ۱۷۷۵ء

(۴) آصف الدولہ ۱۱۸۸ھ تا ۱۲۱۲ھ مطابق ۱۷۷۵ء تا ۱۷۹۷ء

(۵) وزیر علی ۱۲۱۲ھ مطابق ۱۷۹۸ء (صرف چار ماہ)

(۶) سعادت علی خان ۱۲۱۲ھ تا ۱۲۲۹ھ مطابق ۱۷۹۷ء تا ۱۸۱۴ء

(۷) غازی الدین حیدر ۱۲۲۹ھ تا ۱۲۴۳ھ مطابق ۱۸۱۴ء تا ۱۸۲۷ء

(۸) نصیر الدین حیدر ۱۲۴۳ھ تا ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۲۷ء تا ۱۸۳۷ء

(۹) محمد علی شاہ ۱۲۵۳ھ تا ۱۲۵۸ھ مطابق ۱۸۳۷ء تا ۱۸۴۲ء

(۱۰) امجد علی شاہ ۱۲۵۸ھ تا ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۲ء تا ۱۸۴۷ء

(۱۱) واجد علی شاہ ۱۲۶۳ھ تا ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸۴۷ء تا ۱۸۵۶ء

(لکھنؤ کا دبستان شاعری از ابواللیث صدیقی ـ مطبوعہ اردو مرکز لاہور)
ص ۱۷ و ۱۸

حصہ اول ۔ مجلسی اور ثقافتی پس منظر
اور مرثیہ کے فروغ کے اسباب

(دبیر کا عہد)

الف ۔ اودھ کی مختصر تاریخ (سیاسی پس منظر)

برہان الملک ۔صفدر جنگ ۔شجاع الدولہ ۔ جنگ بکسر اور اس کے نتائج

اودھ مین عملاً انگریزی عملداری کا قیام ۔ آصف الدولہ ۔زندگی سے فرار

عیش و طرب مین پناہ ۔مذہبی انہماک مین سکون قلب کی تلاش

نواب سعادت علی خان اور ان کی جزرسی ۔ ریذیڈنسی کا طریق کار ۔

غازی الدین حیدر ۔ دہلی کی مرکزی حکومت سے انقطاع ۔

ان کے جانشین ۔واجد علی شاہ اور انتزاع سلطنت

ب ۔ معاشرتی پس منظر (مرثیہ کے فروغ کے اسباب)

اودھ کی عام معاشرت ۔موسیقی کا شوق ۔ ٹھمری کی ایجاد ۔ طوائفین

ریختی ۔ سوزخوانی اور اس کا مرثیہ پر اثر ۔ لکھنؤ کی ادبی میراث ۔

مرزا شوق کی مثنویان اور ان مین لکھنوی معاشرت کی تصویرین ۔مرثیہ کے

فروغ کے خاص اسباب ۔لذت الم ۔مذہبی تقریبات کی اہمیت ۔محرم ۔

امراء کی سرپرستی ۔اہم مجالس عزا ۔ لکھنوی معاشرت پر مرثیے کے اثرات ۔

سلام اور رباعیان ۔ انیس و دبیر کی مقبولیت ۔دونون کا انداز سخن

محمد امین برہان الملک (۱) کو ۱۷۲۲ع مین اودھ کی صوبیداری عطا ہوئی (۲) یہ بڑے بہادر باحوصلہ اور اعلی درجہ کے منتظم تھے۔ دربارِ دہلی کی سازشون مین خود شریک رہ چکے تھے اور بادشاہ کی حالت کا انہین خوب اندازہ تھا۔ لہذا انھون نے اپنے سولہ سالہ عہد مین خود اپنے پاؤن پر کھڑے ہونے کی کوشش کی اور مرکزی حکومت سے بالکل بے نیاز رہے۔ صوبہ کے مختلف حصون مین دورہ کیا اور اپنی انتظامی صلاحیتون کی وجہ سے محاصل کی آمدنی کو سترلاکھ سے دوکروڑ سالانہ تک پہنچادیا (۳)۔ اپنی سکونت کے لئے اجدھیا سے چار میل دور دریائے گھاگرا پر ایک کچا بنگلہ تعمیر کرایا، جس پر چھپر پڑا ہوا تھا اور اس کے گرد ایک وسیع کچی چاردیواری تھی جس کے اندر کئی رسالے، توپ خانے اور پلٹنین سما سکتی تھین۔ بیگمات کے لئے بھی کچے محلات ہی تعمیر کروائے گئے۔ اس وسیع حویلی (جو بنگلہ کہلاتی تھی) کے اردگرد کئی امراء نے اپنے محلات تعمیر کروائے اور یہی بستی صفدر جنگ کے عہد مین فیض آباد کہلانے لگی۔ (۴)

---

(۱) ۱۷۰۶ع مین نیشاپور کے ایک سیدزادے میر محمد نصیر بعہد محمد شاہ واردِ ہندوستان ہوئے اور عظیم آباد (پٹنہ) مین سکونت اختیار کی۔ ان کے ہمراہ ان کا بڑا لڑکا میر محمد باقر تھا۔ ان کا چھوٹا لڑکا میر محمد امین بھی جسے وہ پیچھے چھوڑ آئے تھے دو سال بعد واردِ ہندوستان ہوا۔ مگر اس وقت تک میر محمد نصیر کا انتقال ہوچکا تھا۔ دونون بھائی عظیم آباد چھوڑ کر دہلی روانہ ہوئے اور قطب الملک کی مدد سے شہزادون کی جاگیر کا ٹھیکہ حاصل کرلیا۔ اور اس مستعدی اور لیاقت سے کام کیا کہ جلد ہی دربار شاہی کے معزز منصبدارون مین شامل ہوگئے اور محمد امین کو سعادت خان کا خطاب ہوا۔ اس وقت ساداتِ بارھہ بڑے عروج پر تھے۔ امرا اور بادشاہ سب ان سے ڈرتے تھے۔ محمد امین نے انہین قتل کرواکر سادات کا زور ہمیشہ کے لئے توڑ دیا اور ان کا مال و متاع لوٹ کر اپنے لئے کافی کچھ جمع کرلیا۔ دربارِ شاہی سے سات ہزار سوارون کی سرداری کے ساتھ "برہان الملک بہادر جنگ" کا خطاب اور آگرہ کی صوبیداری عطا ہوئی۔ دوسال بعد اودھ کی صوبیداری مل گئی، لیکن کچھ عرصہ بعد آگرہ کا انتظام ان سے لے لیا گیا۔ (فرسٹ ٹو نوابز) (آف اودھ) (کے ایل سری واستوا) (تاریخ فرح بخش انگریزی ترجمہ) و (گذشتہ لکھنؤ شرر)

(۲) میمائرز آف دہلی اینڈ فیض آباد انگریزی ترجمہ تاریخ فرح بخش۔

۳ تاریخ اودھ (ج ۱ ص ۶۲) نجم الغنی اس بیان کو مبالغے سے خالی نہیں سمجھتے۔ لیکن مؤلف صاحب بحار السعادت اسے درست تسلیم کرتے ہیں آخر الذکر رائے بہر حال معتدل سمجھنی چاہئے۔

۴ نجم الغنی (تاریخ اودھ) ج ۱ ص ۳۶

۱۷۳۸ع مین جب نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا، تو مرکز نے برہان الملك کو بتاکید طلب کیا ـ یہان پہنچ کر ان کی فطری جاہ طلبی کے باعث ان سے کچھ ایسی حرکات ہوئین کہ انہین زہر کھاکر خود کشی کرنا پڑی (۱) ـ

صفدر جنگ | برہان الملك کی موت پر تخت کے دو دعویدار پیدا ہوگئے ـ ایك شیر جنگ جو صوبی نواب کے بھتیجے تھے اور دوسرے صفدر جنگ، جو بحیثیت قائم مقام کام کر رہے تھے اور سب مال و دولت پر قابض تھے ـ آخرالذکر نے نادر شاہ کو دو کروڑ روپیہ ادا کرکے اس کی سفارش سے سندِ نظامت حاصل کرلی (۲) ـ

صفدر جنگ، نیك نہاد اور علم دوست انسان تھے ـ انہین شعر و سخن کا بھی ذوق تھا ـ خود پاکیزہ شعر لکھتے تھے ـ بہت سے اربابِ علم ان کے دربار سے بہرہ یاب تھے (۳) ـ جاہ و حشمت اور شان و شوکت کے دلدادہ تھے (۴) ـ چنانچہ شجاع الدولہ کی شادی پر چھیالیس لاکھ روپے خرچ کئے ـ پندرہ اکتوبر ۱۷۵۴ع کو انتقال ہوا تو (۵)

شجاع الدولہ | ان کے فرزند مرزا جلال الدین حیدر، شجاع الدولہ، صوبیدار مقرر ہوئے ـ وہ ایك مضطرب اور بے قرار طبیعت رکھتے تھے (٦) ـ ان کی امارت کے ابتدائی چند سال تو حرم کی دلچسپیون، سیروشکار کے مشغلون اور کھیل تماشے کی تفریحون مین بسر ہوئے ـ

---

(۱) نادر شاہ پچاس لاکھ روپیہ تاوان جنگ لے کر واپس جانے پر رضامند ہوگیا تھا ـ برہان الملك نے اسے کہا اگر وہ دلی پہنچ جائے، تو اسے کم از کم بیس کروڑ روپیہ نقد اور بے شمار زر و جواہر ہاتھ آسکتا ہے ـ نادر شاہ اس لالچ مین سیدھا دلی پہنچا ـ مگر شاہی خزانہ مین پچاس لاکھ سے زیادہ کی رقم نہ نکلی ـ نادر شاہ نے سعادت خان سے بازپرس کی اور اس نے مجبور ہوکر گھر جاکر زہر کھالیا ـ نیز دیکھئے تاریخ اودھ نجم الغنی نولکشور ص ٦۷ جلد ۱) ـ

(۲) بوستان اودھ (کنور درگا پرشاد ص ۲۰ و عماد السعادت (مطبوعہ نولکشور) ص ۳۱ و سیرالمتاخرین جلد دوم ص ۲۸۵ ـ

(۳) سیرالمتاخرین (سید غلام حسین عظیم آبادی) جلد ۳ ـ

(۴ و ۵) فرسٹ ٹو نوابز آف اودھ (سری واستاوا) و تاریخ اودھ نجم الغنی جلد ۱ ص ۲۹۵ تا ۳۰۰) ـ

(٦) گذشتہ لکھنؤ (شرر) ـ

لیکن وہ امورِ سلطنت سے بھی کلیتہً بےپروا نہ رہے ۔بلونت سنگھ (حاکم بنارس) کی بغاوت کو فرو کیا، مرھٹوں کے سردار گووند پنتھ کو چاندپور کے مقام پر شکست دی (۱۷۵۹ء) اور پانی پت کی تیسری لڑائی (۱۷۶۱ء) میں بھی احمد شاہ ابدالی کے حلیف کی حیثیت سے وہ موجود تھے ۔احمد شاہ ابدالی نے خوش ہوکر انہیں سلطنتِ دہلی کا وزیر مقرر کروا دیا۔ اس کے بعد جنگ بکسر (۱۷۶۳ء) کا قیامت خیز معرکہ برپا ہوا جس میں شجاع الدولہ کی شکست اور انگریزوں کو فتح نصیب ہوئی ۔(۱)

اس شکست اور معاہدہ الہ آباد (۱۶/ اگست ۱۷۶۵ء) کی رُو سے صرف پچاس لاکھ کے تاوان، چنار گوھ کے قلعہ سے نواب کی دست برداری اور پُرخلوص دوستانہ معاہدہ پر نواب کو بحال کردیا گیا تاکہ اس کی ریاست مرھٹوں اور انگریزوں کے درمیان ایک سرحدی ریاست کی حیثیت سے سدِّ سیاسی اور سدِّ عسکری کا کام دے ۔(۲)

شُجاع الدولہ کو اپنے موقف کا شدید احساس تھا ۔باقی عمر انہوں نے تازہ فوج کی بھرتی اور اس کی جدید اصول پر تربیت اور اسلحہ مہیا کرنے میں گذار دی ۔(۳) اور اپنی سکونت مستقل طور پر فیض آباد میں ہی رکھی ۔ ان تیاریوں کی وجہ سے انگریز انہیں شبہ کی نظر سے دیکھنے لگے ۔چنانچہ معاہدہ بنارس ۲۹ ستمبر ۱۷۶۸ء کی رو سے نواب سے اقرار لے لیا گیا کہ اس کی افواج کی مجموعی تعداد پینتیس ہزار سے بڑھنے نہ پائے ۔(۴)

شجاع الدولہ نے اس معاہدہ پر کبھی عمل نہیں کیا ۔بلکہ چار سال بعد لارڈ ہیسٹنگز سے اسے منسوخ کرالیا ۔ ۱۸ ستمبر ۱۷۷۳ء بروز عید اٹاوہ پر حملہ کرکے مرھٹوں سے اٹاوہ، مین پوری، ایٹہ کے علاوہ کول اور آگرہ کے بعض علاقے چھین لئے ۔اس

---

(۱) ماخوذ از سوانحات سلاطین اودھ بو ستان اودھ اور عماد السعادت ۔

(۲) تاریخ فرح بخش کا انگریزی ترجمہ شجاع الدولہ از ڈاکٹر سری واستوا و گذشتہ لکھنؤ (شرر)

(۳) تاریخ فرح بخش (انگریزی ترجمہ) ایک سفر از جارج فارسٹرص ۱۵۸ ۔

(۴) History of Hindustan, Appendix A vol. 2, Page 92

کے بعد روھیل کھنڈ پر بھی قابض ہوگئے ۔اس طرح انگریزوں کے دونوں دشمنوں کی تباھی اور انگریزی سلطنت کے استحکام کا باعث ہوئے ۔

۲٦ جنوری ۱۷۷۵ء کو ان کا انتقال ہوا ۔ وہ بڑے بہادر، بلند قامت اور خوبصورت جوان تھے ۔(۱) فارسی ادب پر پوری قدرت رکھنے کے علاوہ ترکی عربی مرہٹی اور ھندی سے بھی واقف تھے ۔ سلطنت کے حساب کی پڑتال خود کرلیتے تھے ۔(۲) ھر ایك سے بڑے اخلاق سے پیش آتے تھے ۔(۳) مذھب اثنا عشری کے پابند تھے اور اس کے رسوم و فرائض نہایت خلوص اور باقاعدگی سے ادا کرتے تھے ۔ محرم کی رسوم میں نہایت مستعدی اور پابندی دکھاتے تھے ۔یہاں تك کہ پانی پت کی لڑائی سے کچھ وقت پہلے جب عشرۂ محرم آپہنچا تو انھوں نے اس حالت میں بھی رسومِ عزا پورے طورپر ادا کئے ۔(۴)

ان کی حسن پرستی کے قصے خاص طورپر مشہور ھیں ۔مرتے وقت ان کے حرم میں دو ھزار کنیزیں اور نواب بہو بیگم کے علاوہ سات سو اور محل تھے ۔(۵) حسن پرستی کے طبعی میلان کی وجہ سے بازاری عورتوں اور ناچنے والی طائفوں کی شہر میں اس قدر کثرت ہوگئی کہ کوئی گلی کوچہ ان سے خالی نہ تھا ۔اور نواب کے انعام و اکرام کی وجہ سے وہ اس قدر خوشحال تھیں کہ اکثر رنڈیاں ڈیرہ دار تھیں ۔یہ نواب کے ساتھ دورہ کرتیں اور ان کے گرد پہرہ ہوتا ۔(٦)

نواب آصف الدولہ | شجاع الدولہ کی وفات پر نواب آصف الدولہ، ان کے جانشین مقرر ہوئے ۔بقول شرر "ان کی اخلاقی حالت اس قدر خراب تھی کہ امرا نے یہی مناسب سمجھا کہ ماں (نواب بہو بیگم) بیٹے کو الگ الگ رکھا جائے ۔

....

(۱) معدن السعادت حصہ چہارم ص ۲۸۵ ب

(۲) چہار گلزار شجاعی از ھرچرن ۔

(۳) معدن السعادت مذکور

(۴) شجاع الدولہ (ڈاکٹر سری واستاوا) حصہ دوم ص ۱٦۸ ۔

(۵) چہار گلزار شجاعی از ھرچرن ۔ مطبوعہ نولکشور

(٦) گذشتہ لکھنؤ ۔مطبوعہ نسیم بک ڈپو لکھنو ۔

ان کے تخت نشین ہوتے ہی فوجی تیاریاں ختم ہوگئیں ۔انگریزوں نے بڑی ہشیاری سے اپنے دخل دہی کے حقوق کو بڑھانا شروع کردیا ۔ اور کمال عقلمندی سے آصف الدولہ کو اس بات پر لگا لیا کہ وہ فوجی اصلاحات سے بے فکر ہوکر دوسرے مشاغل سے جی بہلائیں۔ انہیں خود بھی اس طرف کوئی دلچسپی نہ تھی ۔ دادِ عیش کے لئے روپیہ کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے تھوڑی سے فوج رکھ کر باقی کو جواب دے دیا ۔ وہ اپنے مغربی دوستوں کے اطاعت کیش دوست تھے ۔ ان کے اشاروں پر چلتے اور ان کے مقابلہ میں کسی کی نہ سنتے [(۱)] کمینہ خصلت لوگوں کی صحبت میں رہنا، گالی گلوچ دینا اور سننا ان کی خاص عادات تھیں ۔ جب اس طرف سے ذرا ہٹے تو مذہبی امور میں غلو کرنے لگے ۔

زندگی سے فرار اور احساس کہتری کے نتیجہ میں، جو انگریزوں کی برتری اور شاہان اودھ کے بے بسی کا نتیجہ تھا آصف الدولہ نے جاہ و حشم کے بے جا اظہار میں قلبی سکون تلاش کیا ۔ چنانچہ اپنے لڑکے وزیر علی کی شادی پر اس کے خلعت میں بیس لاکھ کے جواہر ٹنکوائے اور دس لاکھ روپے صرف دو خیموں کی تیاری پر صرف ہوئے [(۲)]

۲۱/ ستمبر ۱۷۹۷ع کو انتقال کیا اور اپنے تعمیر کردہ امام باڑے میں دفن ہوئے ۔

نواب سعادت علی خان | آصف الدولہ کی وفات پر وزیر علی خان مسند نشین ہوئے مگر انگریزوں نے غالبا اپنے مفاد کی بنا پر ان پر یہ الزام لگاکر کہ وہ آصف الدولہ کے صلب سے نہیں، انہیں برطرف کردیا اور نواب سعادت علی خان کو جو کلکتہ میں جلاوطنی کی زندگی گذار رہے تھے مسندِ وزارت پر بٹھا دیا اور اس کے عوض نصف ملک جس کی سالانہ آمدنی ایک کروڑ پینتیس لاکھ سے زائد تھی انگریزی علاقے میں شامل کرلیا ۔ [(۳)]

گو یہ سمجھا جاتا تھا کہ ریاست کی تقسیم کے بعد نواب اپنے کم از کم اپنے اندرونی معاملات میں آزاد ہوجائیں گے، لیکن معمولی معمولی واقعات اور معاملات میں ریذیڈنٹ مسٹر بیلی (Baillie) دخل اندازی کرتا رہا جس سے نواب کے وقار کو سخت صدمہ پہنچتا تھا ۔ [(۴)]

---

(۱) گذشتہ لکھنؤ و تاریخ فرح بخش
(۲) ایضاً
(۳) گذشتہ لکھنؤ ص ۲۱ و شباب لکھنؤ (ترجمہ اردو دی لائف آف این ایسٹرن کنگ ص
(۴) زندگی اور ادب شاہان اودھ کے عہد میں (ڈاکٹر صفدر علی حسین) ۔

ان حالات نے ان کی شخصیت کی تشکیل پر گہرا اثر ڈالا ـ اضطرابِ مسلسل، بیقراری اور جزرسی ان کے خصائصِ طبع بن گئے، بلکہ روپیہ جمع کرنے کی دُھن اور اس غرض کے لئے معافیون اور جاگیرون کی ضبطی کی وجہ سے جاگیردارون کا گروہ ان کے خلاف ہوگیا اور انہین اپنی جان کی حفاظت کے لئے انگریزی حفاظتی دستہ رکھنا پڑا ـ (١)

انتہائی کفایت شعاری کے باوجود عمارات کی تعمیر (٢) اور اربابِ کمال کی قدردانی سے غافل نہ تھے ـ (٣) طبیعت مین مزاح کا عنصر زیادہ تھا، جو کبھی کبھی تمسخر سے بڑھ کر فحش کی حدود مین داخل ہوجاتا تھا ـ (٤)

١٢ جولائی ١٨١٤ع کو انتقال ہوا ـ

غازی الدین حیدر | سعادت علی خان کے بعد ان کے بڑے لڑکے غازی الدین حیدر مسند نشینِ وزارت ہوئے ـ برما اور نیپال کی لڑائیون مین کمپنی کی مالی حالت بہت خراب ہوگئی تھی ـ اس لئے لارڈ ہیسٹنگز نے ان سے دو مختلف مواقع پر ایک ایک کروڑ روپیہ قرض مانگا جو انھون نے بخوشی دے دیا ـ ایک کروڑ کے عوض مین کھیری اور ترائی کا ناقابل کاشت علاقہ دے دیا اور باقی رقم بھی وثیقۂ ورثا کے لئے انگریزی خزانے مین محفوظ رہی (٥) ـ

گو سلطنت دہلی کی حیثیت ایک ٹمٹماتے ہوئے چراغ سے زیادہ نہ تھی ـ مگر پھر بھی اس کا وجود انگریزون کی آنکھون مین کھٹکتا تھا ـ مسلمانون کی وفاداری کے جذبات جو شاہانِ دہلی کے برائے نام وجود مین مرتکز تھے انگریزون کو سخت ناپسند تھے

---

(١) گذشتہ لکھنؤ (شرر) ص ٢٢ ـ (تعجب ہے کہ ریاست کی اپنی فوج سے حفاظتی سوارون کا ایک دستہ بھی نہ چنا جاسکا) ـ

(٢) ایک مسجد اور امام باڑے کی تعمیر پر بیس لاکھ روپے صرف کئے ـ منورجہ منورمنزل اور خورشید منزل کی عمارتین اور سعادت گنج رکاب گنج جنگلی گنج مقبول گنج مولوی گنج اور گولا گنج کے بازار انہین کی یادگار ہین (گذشتہ لکھنؤ شرر) ـ

(٣) میر سوز علی مشہور سوز خوان کے لئے دوسو روپے ماہوار مقرر کئے ـ تاریخ اودھ نجم الغنی جلد چہارم ص ١٠٠ ـ اور انشاء نے دریائے لطافت ان ہی کی ایما سے لکھی ـ ملاحظہ ہو لطائف السعادت (ڈاکٹر آمنہ خاتون) ص ٦٩ـ٧٠

(٤) لطائف السعادت مذکور لطائف ٢٠ ٢١ ٢١ ٢٨ ـ

(٥) Hastings Minutes Page 97 بحوالہ زندگی اور ادب شاہان اودھ کے عہد مین (ڈاکٹر صفدر حسین) مقالہ پی ایچ ـ ڈی) ـ

لارڈ ہیسٹنگز نے غازی الدین حیدر کو اشارہ کیا کہ وہ اپنا موروثی، نواب وزیر کا خطاب تبدیل کرکے 'بادشاہی کا لقب' اختیار کریں ۔ چنانچہ ایک بڑے جشن میں غازی الدین حیدر، نواب وزیر سے بادشاہ بن گئے ۔(۱) ولی عہد کو سلیمان جاہ اور نواب معتمد الدولہ کو وزیر اعظم کے خطاب عنایت کئے گئے ۔ اور اس طرح مغلوں کی حکومت کی مرکزیت کا تصور باطل ہوا اور اس خنگی میں ہوا خواہی اور وفاداری کا شعور بٹ گیا ۔ لکھنؤ کے لوگ طبعاً اپنی معاشرت اور فرمانرواؤں سے وابستگی رکھنے لگے اور انگریز ہندوستانی مسلمانوں کی متحدہ طاقت کے خطرہ سے ہمیشہ کے لئے محفوظ ہوگئے ۔ لیکن اس سے شاہانِ اودھ کو بھی کوئی فائدہ نہ پہنچا نہ تو ان کے اختیارات میں کوئی توسیع ہوئی اور نہ ہی ریذیڈنٹوں کا طریقِ کار بدلا ۔ سلطنت کے معمولی سے معمولی کام بھی ریذیڈنٹوں کی منظوری اور خوشنودی کے بغیر انجام پذیر نہ ہوسکے ۔ نتیجتاً غازی الدین حیدر نے مذہبی غلو کے دامن میں پناہ لی ۔ ان کے اس مذہبی انہماک کا نتیجہ یہ نکلا کہ شیعت حکومت لکھنؤ کا ایک نمایاں عنصر بن گئی ۔ علمائے فرنگی محل کی جگہ مجتہدوں نے عروج حاصل کیا اور اجتہاد نے فقہ کی جگہ لے لی ۔ بادشاہ بیگم کی جہالت اور خوش اعتقادی کی وجہ سے بعض بدعتیں ایجاد ہوئیں (ذکر آئندہ آئے گا)(۴) جن کا اثر امراء اور عوام پر بھی پڑا ۔(۲) ~~میر کی شاعری کا آغاز اس بادشاہ کے عہد میں ہوا ۔~~

بادشاہ ذاتی طور پر کریم النفس خدا رسیدہ، رحم دل اور منصف مزاج انسان تھے ۔(۳) ۱۸۲۷ء میں انتقال ہوا اور اپنے تعمیر کردہ امام باڑہ نجفِ اشرف میں دفن ہوئے ۔*

نصیر الدین حیدر غازی الدین حیدر کی وفات پر ان کے خلف نصیر الدین حیدر تخت نشین ہوئے ۔ اختیارات تو جیسا کہ اوپر ذکر ہوچکا ہے شاہِ شطرنج سے زیادہ نہ تھے مگر نواب سعادت علی خان، کی جمع کردہ پونجی میں سے دس کروڑ روپیہ نقد ان کے ہاتھ لگا ۔

---

(۱) بنے سالِ ہمایونِ جلوسش ۔ بگو ناسخ کہ ظل اللہ گردید (ناسخ)
۱۲۳۵ھ

(۲) گذشتہ لکھنؤ (شرر) ص ۵۱ ۔ ۵۲

(۳) سوانحات سلاطین اودھ ص ۲۵۶ و سفرنامہ بشپ ہیبر ص ۳۹۲ ۔

* نجف اشرف غازی الدین حیدر کے تعمیر کردہ امام باڑے کا نام ہے (دیکھئے نجم الغنی) ۔

۴ اس کیلئے دیکھئے "مرثیے کے فروغ کے اسباب" اودھ کا عام معاشرت ص ۱۰ مقالہ ہذا

لہذا انھون نے دل کھول کر دادِ عیش دی ۔ یہان تک کہ ان کی وفات پر صرف ستر لاکھ باقی بچے، گویا سلطنت کی تمام آمدنی کے علاوہ نو کروڑ تیس لاکھ روپیہ نذرِ عیش ہوا ۔ (۱) اس طرب و نشاط کے ساتھ ساتھ مذہبی انہماک وقت کے خلا کو پورا کرتا رہا ۔ (۲) ۱۸۳۷ع مین وفات ہوئی ۔ دبیر کی شاعری کا آغاز انہی کے عہد مین ہوا ۔

محمد علی شاہ | نصیرالدین حیدر کی وفات پر بادشاہ بیگم اور محمد علی شاہ کے درمیان کش مکش کی وجہ سے انگریزون کو اپنے اختیارات بڑھانے کا ایک اور بہانہ ہاتھ آیا ۔ انھون نے محمد علی شاہ کا ساتھ دے کر ان سے یہ معاہدہ لکھوالیا کہ برطانوی حکومت جب بھی بد انتظامی دیکھے گی، تو تمام اودھ یا اس کا کوئی حصہ ضبط کرلے گی ۔ (۳) گویا جو کچھ واجد علی شاہ کے ساتھ ہوا اس کی بنیاد رکھ دی گئی ۔ ۱۸۴۲ع مین سفرِ آخرت اختیار کیا ۔

تخت نشینی کے وقت ان کی عمر تریسٹھ سال تھی، جس کے نتیجے میں ان کے مزاج مین ایک طرح کا سکون اور مذہبی رجحان کا غلبہ تھا ۔ (۴)

امجد علی شاہ | (۱۸۴۲ع تا ۱۸۴۷ع) امجد علی شاہ کی تعلیم و تربیت قدیم مشرقی انداز پر ہوئی تھی ۔ ان پر بھی اپنے والد کی طرح مذہبی رجحان کا غلبہ تھا ۔ شکار اور فوجی زندگی ناپسند تھی ۔ (۵)

---

(۱) سفرنامہ سلیمن جلد اول ص ۲۷۴ ۔

(۲) شہاب لکھنئو ص ۱۲۸ و فسانۂ عبرت (رجب علی بیگ سرور) ص ۱۰ ۔

(۳) گذشتہ لکھنئو ص ۵۹ ۔

(۴) محمد علی شاہ نے کئی لاکھ روپے کربلا معلی مین ترمیم روضہ جناب عباس اور حضرت حر کی نہر کی درستی کے لئے روانہ کئے ۔ عاشور خانہ حسین آباد تعمیر کرایا اور در دولت سے امام باڑے تک ایک کشادہ سڑک بنوائی ۔ مسجد اور امام باڑے کے اخراجات اور ان کے ملازمین کی تنخواہون کے لئے وقف قائم کیا ۔ تاریخ اودھ جلد ۵ ص ۵۸ ۱۰ تا ۱۳ نجم الغنی نولکشور ۱۹۱۹ع ۔

(۵) سوانحات سلاطین اودھ جلد اول ص ۳۷۲ (نولکشور) ۔

واجد علی شاہ
۱۸۲۷ء تا ۱۸۵۶ء

چونکہ انتزاع سلطنت ان ہی کے عہد مین ہوا لہٰذا بقول شرر تمام اہل الرائے کے ہدف سہام اور نشانۂ ملامت بھی یہی بن گئے -

زمانۂ ولی عہدی ہی سے ان کا رجحان، ارباب نشاط کی طرف تھا - گو تعلیم اچھی پائی تھی مگر جو لطف انہین حسین عورتون اور ارباب غنا مین آتا وہ علمی صحبتون مین نہ آتا - تخت نشینی کے بعد انھون نے ذرا سنبھلنے کی کوشش بھی کی مگر ریذیڈنٹ نے ان کے فوجی مشاغل پسند نہ کئے (۱) اور وہ پھر ارباب نشاط کی محفلون کے ہوکر رہ گئے -

انگریز اب دراصل ریاست کے الحاق کے لئے بہانہ چاہتے تھے - لہٰذا کرنل سلیمن نے دورہ کرکے انتظام ریاست کے خلاف شکائتی درخواستین مہیا کین اور الزامات کی فہرست مرتب کرکے ۱۸۳۷ء کے عہد نامے کی رو سے واجد علی شاہ کو حکومت سے برطرف کرکے ۱۸۵۶ء مین کلکتہ بھیج دیا گیا + (۲)، جہان ۱۸۸۷ء مین ~~[illegible]~~ رحلت پائی -

---

(۱) Sir Erskin Perry, Birds eye view on India,
(Sir Erskin Perry)

(۲) اودھ کی سیاسی تاریخ کی تفصیلات اور بالخصوص استحصال ریاست سے بعد کے واقعات واقعات اس مقالہ کی حدود سے باہر ہین - مختصراً یہ کہ کلکتہ پہنچ کر بادشاہ نے اپنے حقوق کی واگذاری کے لئے جد وجہد شروع کی - خود انگلستان جاکر مقدمہ لڑنے کا خیال تھا مگر خرابیٔ صحت کی بنا پر نہ جا سکے اور اپنی والدہ اور ولی عہد کو مولوی مسیح الدین کے ہمراہ انگلستان روانہ کیا - مقدمہ مین شاید کامیابی ہوجاتی مگر بادشاہ زیادہ دیر تک بلاوظیفہ صبر نہ کرسکے - لہٰذا والسرائے ہند کی شرائط منظور کرکے وظیفہ لینا قبول کرلیا اور مقدمہ سے دستبردار ہوگئے - ملاحظہ ہو:-

سفیر اودھ از مولوی مسیح الدین (یہ مولوی مسیح الدین جنہین واجد علی شاہ نے اپنی وکالت کے لئے منتخب کیا تھا بھی عجیب شخصیت کے مالک تھے - دو دفعہ کمپنی کی ملازمت سے موقوف کئے جاچکے تھے - دونون دفعہ بددیانتی کا الزام لگا - انگلستان مین بھی ان پر جعل سازی کا مقدمہ بنا - ملاحظہ ہو سفیر اودھ ان کی خود نوشت سوانح عمری) مطبوعہ الناظر پریس لکھنؤ (نسخہ مقبوضہ گارڈن کالج راولپنڈی)-

بقول سر رضا علی، شخصی حکومت کی سب سے آخری مثال میں (ھندوستان میں) اودھ کی سلطنت تھی، جس کا خاتمہ لارڈ ڈلہوزی کے ھاتھوں ھوا ۔ انگریز مورخ جو کچھ کہیں مگر ھمارے وہ بزرگ جنھوں نے واجد علی شاہ کا دور دیکھا تھا اور جو ضبطی سے پہلے کے حالات سے واقف تھے سلطنتِ اودھ کو ملک کے لئے مفید اور آخری فرمانروا کو ان حالات کے ماتحت جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے عمال نے اودھ میں پیدا کر رکھے تھے، معذور اور مجبور سمجھتے تھے۔(۱)

ب ۔ اودھ کی عام معاشرت (مرثیہ کے فروغ کے اسباب)

خدا معلوم، سلطنتِ اودھ کی بنیاد کس ساعت میں ھوئی کہ اس کا کوئی فرمانروا جذبۂ عشرت و نشاط سے خالی نظر نہیں آتا اور جس وقت اس سلسلہ میں ھم جانِ عالم واجد علی شاہ کے عہد پر پہنچتے ھیں تو وہ تمام کہانیاں جو راجہ اندر سے منسوب کی جاتی ھیں ایک تاریخی حقیقت ھوکر رہ جاتی ھیں ۔

یہ مسئلہ، حقائقِ مسلمہ سے ھے کہ فرمانروا کے ذوقِ مشاغل کا اثر رعایا پر بہت پڑتا ھے ۔ اس لئے اگر واجد علی شاہ کے عہد میں سارا لکھنؤ ایک بلدۂ شعر و موسیقی، اک شہرِ حسن و محبت نظر آتا تھا تو جائے حیرت نہیں ۔ کیونکہ خود جانِ عالم کی زندگی کا کوئی لمحہ اسیشۂ جان بخش سے خالی نہ گذرتا تھا ۔(۲)

جیسا کہ شاھانِ اودھ کے حالات کے بیان میں واضح کیا جاچکا ھے، جہاں تک کاروبارِ سلطنت کا تعلق ھے، ریذیڈنٹوں کے طریق کار کی بدولت حکمران اس سے بے نیاز ھوچکے تھے ۔(۳) لہذا کچھ تو اپنا خالی وقت بسر کرنے کے لئے اور کچھ انتزاعِ اختیارات کے احساس کو مٹانے کے لئے وہ اپنا وقت، اربابِ نشاط و غنا کی صحبت میں بسر کرنے لگے ۔ زندگی کے تلخ حقائق سے آسان ترین فرار فنونِ لطیفہ، مثل نغمہ موسیقی، رقص اور رہس وغیرہ کی طرف سمجھا گیا ۔ حکمرانوں نے جب ان فنون میں دلچسپی لینا شروع کی

---

(۱) رضا علی اعمالنامہ ص ۳۳ (ھندوستان پبلشرز دھلی ۱۹۲۷ع)

(۲) انتقادیات (نیاز فتح پوری) ص ٦٨ ۔ تفصیلات کے لئے ملاحظہ ھو تاریخ اودھ جلد پنجم (محمد نجم الغنی) ۔

(۳) ملاحظہ دی لائف آف این ایسٹرن کنگ (نائٹن) اردو ترجمہ احمد علی (شباب لکھنؤ) نیز دیکھیں تاریخ اودھ نجم الغنی حصہ پنجم ص ۱۵۹ و ۱٦۰

تو عوام کا رجحان بھی اسی طرف ہوگیا ۔یہاں تک کہ لکھنؤ میں موسیقی کو اس قدر عروج حاصل ہوا کہ امراء کے صحیح اور پختہ ذوق کے باعث معمولی گانے والا وہاں کامیاب نہ ہوسکتا تھا۔[۱]

طوائفیں | معاشی خوشحالی اور ذوقِ جمال نے طوائف کو لکھنوی معاشرے کا ایک لازمی جزو بنادیا ۔شجاع الدولہ کی قدردانی کی وجہ سے ہزارہا ارباب نشاط نواب وزیر کے گرد جمع ہوگئیں ۔[۲] وہ خود اور ان کے امرا و فوجی افسران بھی جب دورے پر جاتے تو طوائف کے ڈیرے ساتھ کوچ کرتے ۔سعادت علی خان جیسا جزرس انسان بھی ان اشغال سے بے بہرہ نہ تھا بلکہ اپنے وقت کا حسن پرست مشہور تھا ۔[۳] سلطان واجد علی شاہ کی صورت پرستی توضرب المثل بن چکی ہے ۔[۴] چونکہ طوائف کے تعلقات معاشرہ کے اعلیٰ طبقے سے تھے اس لئے اثر و رسوخ میں بھی بڑے بڑے امراء ان کا مقابلہ نہ کرسکتے تھے ۔

جب حکمران اور امراء کی رغبت طوائف کی طرف اس قدر بڑھی تو ان کی دیکھا دیکھی عوام بھی اس طرف جھک گئے ۔اس صورت حال سے ڈومنیوں نے خوب فائدہ اٹھایا گانے اور ناچ میں مشق بہم پہنچاکر مردانی اور زنانی محفلوں میں دخل پایا اور شادی کی رسوم کا سب سے بڑا عنصر بن گئیں اور بقولِ شرر دولتمند گھرانوں کی بیگموں کو ایسا گرویدہ کرلیا کہ کوئی محل اور کوئی ڈیوڑھی ایسی نہ تھی جہاں ڈومنیوں کا کوئی طائفہ نوکر نہ ہو۔[۵]

---

(۱) گذشتہ لکھنؤ ص ۲۰۶ مزید تفصیل کے لئے دیکھیں قدیم ہنر و ہنرمندان اودھ مصنفہ سید اسرار حسین باب موسیقی ۔

(۲) چہار گلزار شجاعی ہرچرنداس۔

(۳) تاریخ اودھ (نجم الغنی) جلد چہارم ص ۱۰۲ ۔

(۴) جب عمر کی پانچویں سالگرہ پڑی تو رحیمن نام ایک گداز بدن عورت کی آغوش میں راحت حاصل ہونے کا خود اعتراف کیا ہے ؎

تلذذ تھا اور کچھ نہ تھا زینہار فقط اس سے تھا لطف بوس و کنار
(ماخوذ از تذکرہ شوق (عطاالله پالوی)

(۵) گذشتہ لکھنؤ (شرر) ۔

موسیقی کا اثر ـ سوز خوانی گو مرثیون کو سوز سے پڑھنے کا رواج نیا نہ تھا مگر اس فن کو معراج کمالِ لکھنئو مین ہی عطا ہوا ـ موسیقی کی ان دھنون کو منتخب کیا گیا جو اظہار حزن و ملال اور ماتم داری کے لئے موزون ہون اور اس طرح سوزخوانی کو ایک مستقل فن کی حیثیت عطا ہوئی، جو نہ صرف گویّون کے ہاتھ مین تھا، بلکہ شرفا بھی اس مین عملی حصہ لیتے تھے ـ

طوائفون اور ڈومنیون کی بدولت، نیز مذہبی جذبات کے زیرِ اثر سوز خوانی کا رواج مستورات مین بھی ہوا اور بقولِ شرر، یہ حالت ہوگئی، کہ چند ہی دنون مین محرم اور اکثر مذہبی عبادتون کے ایام مین لکھنئو کے گلی کوچون سے تمام گھرون سے پرسوز و گداز تانون اور دلکش نغمون کی حیرت انگیز صدائین بلند ہوتی تھین اور کوئی مقام ایسا نہین ہوتا تھا کہ جہان یہ سمان بندھا نہ ہو ـ(۱)

اس کا دوسرا اثر یہ پڑا کہ سنی اور شیعہ دونون کے گھرون مین تعزیہ داری ہونے لگی بلکہ ہندو بھی اس مین شریک ہوگئے ـ(۲) سوزخوانی کے کمالِ تاثیر اور صنف نازک مین اس کی مقبولیت کا ایک واقعہ شرر ہی کی زبانی سنئے ـ

" ایک سال چہلم کے موقع پر چند احباب کے ساتھ مین تال کٹورہ کی کربلا مین گیا تھا اور وہین ایک خیمے مین شب باش ہوا تھا ـ دو بجے رات کو یکایک آنکھ کھلی تو ایک ایسے دلکش نغمے کی آواز کان مین آئی جس نے سب دوستون کو جگا کے بیتاب کردیا ـ ہم سب اس آواز کے شوق مین خیمے سے نکلے اور دیکھا کہ آخرِ شب کا سناٹا ہے چاندنی کھیت کئے ہوئے ہے اور اس مین عورتون کا ایک غول تعزیہ لئے ہوئے آرہا ہے ـ سب بال کھولے اور سر برہنہ ہین ـ بیچ مین ایک عورت شمع ہاتھ مین لئے ہے، اس کی روشنی مین ایک حسین سروقد نازنین چند اوراق مین سے پڑھ پڑھ کر نوحہ خوانی کر رہی ہے اور کئی اور عورتین اس کے ساتھ گلے بازی کر رہی ہین ـ اس سناٹے، اس وقت، اس چاندنی، ان برہنہ سر حسینون اور اس پُر سوز و گداز نغمے نے، جو سمان پیدا کر رکھا تھا، اس کو مین بیان نہین کرسکتا. نازک اداؤن کا یہ مجمع جیسے ہی کربلا کے پھاٹک مین داخل ہوا، اس سروقامت نازنین نے بہیرن کی دھن مین یہ نوحہ شروع کیا :ـ

---

(۱) گذشتہ لکھنئو شرر

(۲) ایضا "

جب کاروانِ شہرِ مدینہ لٹا ہوا ﷺ پہنچا قریب شام کے قیدی بنا ہوا
نیزے پہ سر حسین کا آگے دھرا ہوا اور پیچھے پیچھے بیبیوں کا سر کھلا ہوا

اس مناسب حالت مرثیے نے یکایک ایسا سماں باندھ دیا کہ شبہ ہوتا تھا کہ ان اشعار کے ذریعے سے وہ خاتون واقعۂ کربلا کی تصویر کھینچ رہی ہے یا خود اپنے اس ماتمی جلوس اور اپنے داخلۂ کربلا کی۔[1]

سوز خوانی کا مرثیہ گوئی پر اثر سوزخوانی کی مقبولیت اس حد تک تھی کہ اکثر مرثیہ گو، عوام میں متعارف ہونے اور اپنے کلام کی اشاعت کے لئے، سوز خوانوں کے محتاج تھے، چنانچہ میاں دلگیر کے متعلق لکھا ہے کہ وہ اپنا کلام میرعلی "سوز خوان" کو پڑھنے کے لئے دیتے تھے اور اس کی (میرعلی سوز خوان کی) اس قدر رعایت ملحوظ تھی کہ جو مرثیہ ایک دفعہ اسے عطا ہوتا وہ تین برس تک کسی دوسرے سوزخوان کو نہ دیا جاتا۔[2] گویا سوزخوانوں کی حیثیت نقادان مرثیہ کی سی ہوگئی ۔ کسی مشہور سوزخوان کا کسی مرثیہ کو پڑھ دینا، مرثیہ نگار کی شہرت کا ذریعہ ہوگیا، لہذا سوزخوانوں کی سہولت اور انہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے اپنے مرثیوں میں استعمال کردہ الفاظ کی موسیقیت اور سوزخوانی کے لئے مناسبت کا خیال رکھنے لگے ۔ اس لئے کہ اگر دوسو یا ڈیڑھ سو بند کے مرثیہ میں سے چند بند سوزخوانی کے لئے چھانٹ لئے جائیں تو تسلسل نہ ٹوٹے ۔ چنانچہ جابجا مطلع لگا دیے جاتے، تاکہ جس مطلع سے مناسب سمجھا جائے مرثیہ شروع کیا جاسکے ۔ ظاہر ہے کہ اس سلسلہ میں جو الفاظ کی تراش اور موسیقیت کے لحاظ سے ان کے انتخاب میں کاوشیں ہوئیں، انھوں نے مرثیہ کے ارتقا اور آرائش میں بڑی مدد دی ۔

مرثیہ گو طبعاً یہ چاہتے ہوں گے کہ ان کے کلام کی اشاعت میں سوزخوانوں کا واسطہ نہ رہے اور وہ اپنی کاوشوں کی داد، براہ راست وصول کرسکیں ۔ اس کے لئے دو خوبیوں کا ہونا لازمی تھا، اول پڑھنے کا ڈھنگ، دوسرے کلام میں جاذبیت ۔ چنانچہ جب ہم اس عہد کے مرثیہ گو شعراء کے حالات پڑھتے ہیں تو ان کے پڑھنے کے ڈھنگ، ان کی آواز،

---

(۱) گذشتہ لکھنؤ ص ۲۲۵ ۔ اودھ کے مشہور سوزخوانوں کی فہرست دیکھئے قدیم ہنرو قدیم ہنرمندان اودھ (سید اسرار حسین) الناظر پریس (۱۹۳۶ء) ۔

(۲) حیات دبیر ص ۷۹ ۔

طرزِ تخاطب اور ساتھ بلکہ چشم و ابرو کے اشارون (۱) تک سے آشنا کروایا جاتا ہے ــ اس طرح مرثیہ گوئی کے ساتھ ساتھ مرثیہ خوانی نے بھی ایک الگ اور اہم حیثیت اختیار کرلی ــ

لکھنؤ کی ادبی میراث

لکھنؤ کی ادبی میراث کا تجزیہ کیا جائے، تو معلوم ہوگا کہ ادب اردو کی وہ روایت جو دلی سے لے کر مصحفی تک ایک فیض جاریہ کی حیثیت رکھتی تھی، جب لکھنؤ مین پہنچی تو اس خطے کے معاشرتی اور ثقافتی کوائف نے اس روایت کو اپنے رنگ مین رنگا اور اپنے سانچے مین ڈھالا ــ یہ دعویٰ کرنا مشکل ہے کہ لکھنؤ کا دبستان شعر گوئی، قائم بالذات، مستقل، منفرد، جداگانہ دبستان نہین ہے ــ کیونکہ جہان تک روائتی مطالب و مضامین اور اسالیبِ ابلاغ و اظہار کا تعلق ہے، لکھنؤ اور دہلی کے شعراء کے کلام مین کوئی نمایان فرق نظر نہین آتا، جسے حدّ فاصل قرار دیا جاسکے ــ (۲)

البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ جب اردو کی شعری روایت لکھنؤ مین پہنچی تو لکھنؤ کی وضع زیست اور وہان کی پرتکلف اور پر تصنع معاشرت نے شعری اور نثری تخلیقات کو بھی طبعاً متاثر کیا ہے ــ اس اثرپذیری کی تفصیل ہمارے دائرے سے خارج ہے لیکن باجمال یون کہا جاسکتا ہے کہ

(الف) لکھنؤ کی شعری تخلیقات مین سوز و حرمان اور حسرت و یاس کی بجائے انبساط و نشاط کا عنصر طبعاً نمایان ہے کہ اس خطّے مین عشق ایسی جنس ہے جسے خریدا جا سکتا ہے اور حسن تو بازار مین بہرحال بکتا ہے ــ

(ب) لکھنوی معاشرت کے تکلف اور تصنع کا اظہار شعری تخلیقات اور نثری کاوشون کے تکلف اور تصنع مین ظاہر ہوتا ہے یہان تک کہ ایسی بھی محسنات کا استعمال، بعض اوقات اس طرح کرتے ہین کہ بے اعتدالی کا گمان گذرتا ہے ــ

(ج) لکھنوی شعراء طبعاً حسن و جمال کی تمام اداؤن کے رازدار ہین اور ان کے کلام مین جمال کے تمام پہلو یعنی آن، چھب، عشوہ غمزہ، ادا ایسی خوبصورتی سے بیان ہوتے ہین کہ باید و شاید ــ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ چیزین لکھنوی شعراء کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا تھا ــ دہلوی متانت و اعتدال اور لکھنوی نوک پلک اور آرائش کا امتزاج، اپنی حسین ترین صورت مین مصحفی کے کلام مین نظر آتا ہے ــ

---

(۱) ان اشارات کو اصطلاحاً " پٹانا " کہا جاتا ہے ــ

(۲) دیکھئے مضمون "لکھنؤ اور دہلی کے شعری دبستان ــ صنوعی افتراق اور انتقادی حدبندیان ــ مطبوعہ امروز ــ (راقم الحروف کے خیال میں لکھنوی رنگ کو اسلوب کہہ کر تعبیر کرنا زیادہ مناسب ہے)

(د) اگرچہ ریختی کا آغاز دکن ہی میں ہوچکا تھا کیونکہ وہاں بھی دیوداسیوں کی کثرت تھی جو ہمجنسی کی تحریکات کو ابھارتی تھی ـ[۱] لیکن لکھنؤ میں ڈیرہ دار طوائفوں کی کثرت نے اور جنسی کجروی نے تماش بینوں کے نئے آداب مجلس کے ساتھ مل کر ریختی کو ایسے مقام تک پہنچا دیا جہاں یہ بالکل واضح ہوجاتا ہے کہ عورت طوائف ہو یا غیر طوائف ہو، کبھی ایک حصار معنوی میں مقید ہونے کے بعد مرد کے سامنے عریان تو ہوجاتی ہے، لیکن بے نقاب نہیں ہوتی ـ روح کو بے نقاب طوائف کی قبیل کی عورتیں دوسری عورت ہی کے سامنے کرسکتی ہے ـ کیونکہ اس کے خیال میں مرد اس لطافت اور دقت نظر سے محروم ہوتے ہیں جن سے عورتیں طبعاً متصف ہوتی ہیں ـ یہ نفسیاتی کیفیت ریختی کی شکل میں ظاہر ہوئی۔

لکھنوی معاشرت کی یہ تمام خصوصیات بیشتر ادبی تخلیقات میں اپنا رنگ دکھاتی ہیں ـ غزل میں تو بہرحال شخصی واردات کا رنگ چوکھا ہوتا ہی ہے ـ دوسری اصناف ادب میں لکھنو کی ثقافت اور زوال پذیر معاشرت بہرصورت اپنا اثبات کرتی رہتی ہے ـ

مرزا شوق کی مثنویاں اور ان میں لکھنوی معاشرت کی تصویریں

مثنوی میں اس کی بہترین مثال مرزا شوق[۲] کی مثنویاں پیش کرتے ہیں ـ جن میں اپنے ماحول کی نہایت دیانتداری سے ترجمانی کی گئی ہے ـ[۳] مثلاً مثنوی بہار عشق کی ہیروئن کے پاس جب ملازمہ یہ پیغام پہنچاتی ہے کہ باہر کوئی اجنبی ملنے کے لئے آیا ہے تو وہ دوشیزہ ہونے کے باوجود سمجھ جاتی ہے کہ کہیں سے پیغام محبت ہی آیا ہوگا اور خود ڈیوڑھی پر پہنچ جاتی ہے اور نامہ و پیام سننے کے بعد جواباً "پیغام دیتی ہے کہ ـــ

ہم بھی درگاہ آج جائیں گے   ہوگی فرصت تو واں بھی آئیں گے

عطاء اللہ صاحب پالوی نے اس پر یوں تبصرہ کیا ہے :-

اب غور کیجئے کہ ایک دوشیزہ نے اس طرح کیوں کیا ؟ اس پیغامبر کو اتنی جرات کس طرح ہوئی ... دراصل ان تمام خرابیوں کی وجہ معاشرت کا نقص تھی جس نے لکھنؤ کی سماجی اور ذہنی حالت بگاڑ کر رکھ دی تھی ـ سارا اودھ رنگ رلیوں میں

---

(۱) دیکھئے H. ELLIS, Study in the Psychology of Sex
اور تاثیر کے دیوان آتشکدے پر مقدمہ (عابد علی عابد) بالخصوص نظم دیوداسی کا تجربہ ـ

(۲) ۱۱۹۷ھ تا ۱۲۸۸ھ تذکرہ شوق عطاء اللہ پالوی مطبوعہ مکتبہ جدید لاہور (ص ۳۹) (ص ۵۵)

(۳) مقالات ماجد ـ

صروف اور منہمک تھا ہر شخص ایک وارفتگی کی حالت اور سرشاری کی کیفیت مین کھویا اور ڈوبا ہوا تھا ۔ بازار سے لے کر دربار تک ادنٰی سے لے کر اعلی تک اور عوام سے لے کر خواص تک ظرافت و بذلہ سنجی، تکلف اور صنع، پھبتی اور پھکڑ اور ہجو و نقالی کا شیدا و دلدادہ ہو رہا تھا ۔ چنانچہ اس کا اثر شاعری پر بھی پڑا اور شعر کا خطاب بجائے ایک کیرکٹر کے معشوق کے ہر صورت سے ہونے لگا اور وہ اس قعر مذلت مین زیادہ سے زیادہ نیچے اترتے چلے گئے ۔ یعنی وصل اور ملاپ کا نقشہ بھی ٹھیٹھ لفظوں مین واشگاف اور محابہ کھینچا جانے لگا ۔ معشوق کے ہر ہر عضو کی خوبیان واشگاف الفاظ مین بیان کی جانے لگین[1] سوال پیدا ہوتا ہے کہ پیغام بھیجنے والے کون تھے ؟ کیا یہ اسی معاشرہ کے اعلی طبقہ کے افراد نہ تھے[2] ؟ اور یہ پیغام وصول کرنے والی کون تھین ؟ کیا یہ ان کی بہو بیٹیان اور بہنین نہ تھین[3] ؟ اور یہ ملاقاتین کہان ہوتی تھین ؟ کربلاؤن اور درگاہون مین !

دوست جتنے تھے رہتے تھے ہمراہ	کربلا مین کبھی کبھی درگاہ
رہتا تھا تیرھوین کا جلسہ یاد	شام سے جاتے تھے حسین آباد
لوگ پہلے سے وان پہ جاتے تھے	فرش تالاب پر بچھاتے تھے
دوپہر رات جب گذرتی تھی	ڈولی پر ڈولی اترتی تھی
صحبت عیش گرم رہتی تھی	کچھ نہ آپس مین شرم رہتی تھی[4]

گویا غزل اور مثنوی دونون ایک ہی راہ پر گامزن ہوگئین ۔ جس کی منزل لذت کوشی اور معصیت انگیزی کے سوا کچھ نہ تھی[5] ۔

---

(۱) تذکرہ شوق (عطاءالله پالوی) ص ۱۵۲ ۔

(۲) دیکھ کر وان سے پھر نہ ٹلتا تھا | اچھی صورت پہ دم نکلتا تھا
ظلم جب سہ چکے حسینون کے | ہوئے مرشد تماش بینون کے

(فریب عشق)

(۳) وضع ظاہر مین گو کہ سادی ہین | پھر وہ آخر امیر زادی ہین

(۴) فریب عشق ۔

(۵) شوق کی مثنویون کا اگر اس کے پیش رؤون مثلاً میرحسن کی مثنویون سے مقابلہ کیا جائے تو یہ فرق واضح ہوجاتا ہے ۔

لذت الم | مندرجہ بالا سطور مین جس طاھی عیش و طرب اور گناہ و معصیت سے بھرپور فضا کا ذکر کیا گیا ہے اس مین ایک خاص قسم کی کمی اور خلا محسوس ہوتا ہے ـــــ روحانیت کا خلا لذت الم، غم و اندوہ کے لطیف جذبات اور حرمان و درد کا خلا ـــــ جسے پورا کرنا ضروری تھا ـ بقول حافظ ـــ

دوام عیش و تنعم نہ شیوۂ عشق است　　　اگر معاشر مائی بنوش جام غمے[(1)]

اب تک شعر و سخن مین جذبات غم اور شدت الم کے اظہار کے لئے غزل کو وسیلہ اور تصوف کو ذریعہ بنایا جاتا تھا مگر اب جبکہ تصوف کا عنصر غزل[†] سے خارج ہوچکا تھا تو اس کی جگہ لینے کے لئے " مرثیہ " آگے بڑھا، جو حکمرانون کے عقیدہ کا مظہر ہونے کی وجہ سے غزل سے زیادہ متنوع، حقائق سے زیادہ قریب اور غم و الم کے بیان مین زیادہ شدید تھا ـ اس لئے مرثیہ کی مقبولیت لازمی تھی ـ گویا مرثیہ کی مقبولیت مین مذھب سے زیادہ وہ نفسیاتی خلا دخیل تھا، جسے اس نے پُر کیا ـ

مذھبی تقریبات کی اھمیت | اس مقبولیت کا ایک اور بڑا سبب لکھنئو مین مذھبی تقریبات کی اھمیت تھی ـ مجالس عزا کا اھتمام بڑے خلوص اور شدت سے کیاجاتا تھا ـ اس لئے سوگواری نفاست اور نزاکت کا خیال رکھ کر محرم کے لئے خاص لباس اور خاص زیور ایجاد کئے گئے ـ سیاہ اور نیلے رنگ، سوگواری کے لئے مخصوص رنگ قرار پائے ـ چونکہ عباسیون کے عہد مین ان کے سیاہ رنگ کے مقابلہ مین بنوفاطمہ کا رنگ سبز تھا اسلئے یہ رنگ بھی تقریبات عزا مین جائز رہا ـ سرخ رنگ، ایامِ محرم مین بالکل ممنوع تھا ـ تمام زیور ماتم کے دنون مین اتار کر کلائیون کے لئے سیاہ و سبز ریشمی پونچیان اور کانون کے لئے، سیاہ و زرد ریشم کے کرن پھول پہنے جاتے ـ مجالسِ عزا اس کثرت سے منعقد کی جاتی تھین کہ اگر کوئی شخص چاھتا اور پتہ لگاتا رھتا تو سال بھر بغیر محنت و مزدوری کے محض مجالس کی شرکت سے اپنا پیٹ پال سکتا تھا ـ[(2)]

---

(1) گر بود از صف ما ھر کہ مرد غوغا نیست　کسے کہ کشتہ نشد از قبیلہ ما نیست

(2) گذشتہ لکھنئو (شرر) یہان یہ فراموش نہین کرنا چاھئے کہ مغلیہ سلطنت کے آخری تاجدارون کے ھان بھی محرم اور دیگر مذھبہ تقریبات (جن مین ھندو اور مسلم دونون شامل ہین) کا اھتمام و التزام لکھنئو سے کم نہ تھا ھان داد و دھش مین دولت کی کمی سد راہ ہوتی ـ تفصیلات بزم آخر ارمغان دھلی ۱۸۸۵ع ـ

† یہاں آتش کو نظر انداز کر دینا چاہیے۔ آخر وہ ایک دہلوی صوفی خاندان کے فرد تھے۔ آتش کی صوفیانہ شاعری پر بصیرت افروز مقالہ "آتش کی صوفیانہ شاعری" مطبوعہ نقوش لاہور ادب عالیہ نمبر ملاحظہ ہو

ہندو عزادار لکھنؤ کے اس دور میں اہل اسلام کے علاوہ ہندو شرفا بھی مجالس عزا میں خاصی دلچسپی لیتے تھے جن میں سے لالہ الفت رائے، الفت، شاگرد میر خلیق، پنڈت بیج ناتھ، (مالک مطبع ثمر ہند لکھنؤ)، دیبی دین جگناتھ المعروف بہ شرف الدولہ، اور مہاراجہ مکیش رائے، اپنے گھروں میں دھوم دھام سے مجالس عزا منعقد کرنے میں شہرت رکھتے تھے اور مرثیہ گو شعراء کی سرپرستی کرتے تھے ـ (۱)

محرم کی رسوم کا اہتمام ناٹن نے اپنی کتاب "دی پرائیوٹ لائف آف این ایسٹرن کنگ" میں نصیرالدین حیدر کے عہد کے محرم کے چشم دید حالات بیان کئے ہیں ـ ان کا خلاصہ یہاں درج کیاجاتا ہے : (یہی عہد دبیر کی شاعری کے آغاز کا ہے)

محرم کا چاند دیکھتے ہی لکھنؤ کے باشندے غمگین نظر آنے لگتے تھے اور دنیاوی اشغال سے کنارہ کش ہوجاتے ـ ہر شخص سوگوار ہوکر خانہ نشین ہوجاتا ـ دوسری تاریخ کو تعزیوں کے جلوس نکلنے شروع ہوجاتے اور ان کے ساتھ لوگ ماتمی لباس پہن کر شامل ہوتے ـ

ان ایام میں امام باڑوں میں روشنی کثرت سے کی جاتی اور انہیں بڑے تکلف اور اہتمام سے سجایاجاتا ـ تعزیوں کے گرد سبز اور سرخ شمعیں رات بھر جلا کرتیں اور چوبیس گھنٹوں میں دو مرتبہ مجالس عزا منعقد ہوتیں ـ بادشاہ سلامت بہ نفس نفیس، ماتمی لباس میں شریک مجلس ہوتے ـ ذاکر مصائب اہل بیت، بیان کرتے اور حاضرین ماتم اور آہ و بکا سے داد دیتے ـ

محرم کی پانچویں کو علم چڑھانے کی تقریب منائی جاتی جس میں تمام باشندگان لکھنؤ حصہ لیتے ـ جلوس میں مرصع ہاتھی اور فوجی دستے بھی شامل ہوتے ـ ہر سال تقریباً "پچاس ہزار علم چڑھائے جاتے تھے ـ

محرم کی ساتویں کو مہندی کی تقریب منائی جاتی اور امراء و غربا اپنی اپنی مہندیاں امام باڑوں میں چڑھاتے ـ اس رات امام باڑے زیادہ اہتمام سے روشن کئے جاتے ـ مہندی کے سامان میں شمایاں، خشک میوے، پھولوں کے ہار، مسہری، گلدستے، آتش بازی اور دلہن

---

(۱) ان کے متعلق تفاصیل کے لئے دیکھئے مضمون " قدیم لکھنؤ کے ہندو تعزیہ دار اور عزاداران عزادار " از خواجہ عبدالروف عشرت لکھنوی مطبوعہ رسالہ سرفراز محرم نمبر ۱۳۵۲ھ

کی نقرئی پالکی شامل ہوتے ۔ سامان عروسی کے ساتھ ساتھ، سامان غم بھی ہوتا جو حضرت قاسم کے تابوت اور خالی گھوڑے پر مشتمل ہوتا ۔ ان رسوم کے خاتمہ پر مجالس عزا منعقد ہوتیں ۔

محرم کی رسوم کی ادائیگی میں واقعہ کی فوجی حیثیت نظرانداز نہ ہوتی ۔ رزمیہ باجے، ہتھیار بند سپاہی، جلوس کا قرینہ، بندوقوں اور پستولوں کا داغنا میدان جنگ کے نقشہ کا تصور قائم کردیتا ۔

محرم کی دسویں تاریخ کو دوسرے اہتمام کے علاوہ غلہ روٹی اور نقدی جو جلوس کے ہمراہ ہوتی، غربا میں تقسیم کی جاتی ۔(۱)

شاہان اودھ کا مذہبی غلو دبیر کی شاعری کا آغاز نصیر الدین حیدر کے عہد سے ہوا ۔ ان کی ملکہ بیگم بادشاہ بیگم کے نام سے موسوم ہیں جو مبشر خان منجم اور تقویم ساز کی لڑکی تھیں اور خود بھی درسی علوم کے علاوہ، تخریج احکام نجوم میں بھی دسترس رکھتی تھیں ۔ غازی الدین حیدر عالم شہزادگی سے اس کے حسن و جمال پر فریفتہ تھے ۔

بادشاہ بیگم سے بیاہ کے بعد، صبح دولت نامی ایک خواص پر نواب غازی الدین حیدر عاشق ہوگئے اور وہ حاملہ ہوگئی ۔ بادشاہ بیگم اسے برداشت نہ کرسکی چنانچہ جب ۲۲ جمادی اول ۱۲۱۸ ھ کو صبح دولت کے ہاں نصیرالدین حیدر کی پیدائش ہوئی تو بادشاہ نے اس کنیز کو زہر دے کر مروا ڈالا اور بچے کو اپنی پرورش میں لے لیا ۔(۲)

بادشاہ بیگم، ایک منجم کی لڑکی ہونے کی وجہ سے ضعیف الاعتقاد تو ابتدا ہی سے ہوں گی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس جرم کے ارتکاب کے بعد ان کا ذہنی توازن زیادہ بگڑ گیا اور انھوں نے مذہب میں عجیب و غریب اختراعات کیں ان میں سے ایک تو چھٹی کی رسم ہے جس میں زچہ عورت جننے سے چند دن بعد معہ بچہ کے عمدہ لباس پہن کر غسل کرتی ہے اور اقربا و اعزہ کو مہمان بلاتی ہے ۔ بادشاہ بیگم ہر سال یہ رسم ماہ شعبان میں ادا کرتیں اور بہت سا روپیہ خرچ کرتیں ۔

---

(۱) ماخوذ از شباب لکھنؤ (احمد علی) (ترجمہ دی لائف آف این ایسٹرن کنگ از ناشن) مطبوعہ الناظر پریس ۱۹۱۲ء

(۲) نجم الغنی تاریخ اودھ جلد ۲ ص ۱۶۸ ۔

دوسری رسم اچھوتی کی ہے۔جس کا مطلب یہ ہے کہ شرفا کی دوشیزہ اورخوبصورت لڑکیاں روپیہ کے بل پر یا کسی اور ذریعہ سے بہم پہنچاکر انہیں آئمہ اطہار کی ازواج کے نام دے دیے جاتے ۔صرف حضرت فاطمہؑ کی رعایت کی جاتی اور ان کے احترام کی وجہ سے کوئی اچھوتی حضرت علیؑ سے منسوب نہ کی جاتی ۔ ہر اچھوتی کے لئے تین نوکرانیاں مہیا کی جاتیں ۔عمدہ کھانے اور نفیس لباس مہیا کئے جاتے اور اگر ان میں سے بالغ ہوکر کوئی نکاح کرنا چاہتی تو مانع ہوتیں ۔

اچھوتیوں کے مقابلہ پر اچھوتے بھی ایجاد کئے، جن میں فرق محض تذکیروتانیث کا ہے باقی برابر ۔(۱)

نصیرالدین حیدر کی پرورش بادشاہ بیگم ہی نے کی ۔لہذا ان کی طبیعت پر ملکہ کے اثرات بہت گہرے تھے ۔وہ اپنے زمانۂ شاہی میں وہ تمام رسوم ادا کرنے لگے ۔ جو ان کی سوتیلی ماں کیا کرتی تھی بلکہ بعض امور میں شاگرد استاد سے بڑھ گیا ۔انہوں نے بھی گیارہ ازواج، آئمۂ اطہار کے لئے جمع کیں بلکہ حضرات قاسم و عباس وغیرہ کو بھی ساتھ شامل کرلیا ۔اور جب کبھی کسی امام کی ولادت کا دن آتا تو بادشاہ خود، حاملہ عورت کا پارٹ ادا کرتے اور مصنوعی دردِ زہ کے بعد بچہ جنتے ۔ ان کے زمانۂ سلطنت میں رجولیت کو نسائیت میں تبدیل کرنے کا شوق بہت بڑھ گیا اور اکثر مرد عورتوں کے لہجہ میں بات چیت کرنے لگے ۔(۲)

محرم کی رسوم کو اس سختی سے منایاجاتا تھا کہ نصیرالدین حیدر نے اپنی حکومت کے پہلے سال میں یہ حکم دے دیا تھا کہ جملہ ساکنان سلطنت محرم میں سیاہ پوشی اختیار کرکے رسوم عزا کی پابندی کریں ورنہ سزا ہوگی ۔ریذیڈنٹ نے دخل اندازی کرکے بمشکل اس حکم کو منسوخ کرایا ۔(۳) چونکہ دبیر غازی الدین حیدر کے عہد سے لے کر انتزاع سلطنت تک دربار سے متعلق رہے اس لئے غیرمصدقہ روایات کا بیان ان کے کلام میں نسبۃً زیادہ ہے ۔

---

(۱) نجم الغنی تاریخ اودھ ص ۱۶۷تا ۱۷۰ ۔ ج ۴

(۲) تاریخ اودھ مذکور جلد ۲ص ۳۹۲ تا ۳۹۴ ۔

(۳) ایضـــا " ص ۳۹۵ تا ۳۹۷ ۔

ان کے جانشین محمد علی شاہ، امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ، ہر ایک کو مذہبی امور اور بالخصوص رسوم عزا میں غلو تھا ـ نتیجۃً ان کے عہد میں مرثیہ گوئی کو بہت فروغ حاصل ہوا ـ

امراء کی سرپرستی | بمصداق "الناس علی دین ملوکہم" بادشاہی افعال و اقوال کا اثر رعایا پر ہونا ناگزیر ہے ـ اس لئے امراء نے بھی مجالسِ عزا اور مرثیہ گو شعراء کی سرپرستی میں خاصی سرگرمی دکھائی ـ یہاں پر اس عہد کے ان مشہور امرا کا ذکر کیا جاتا ہے جو مجالس عزا منعقد کرتے اور مرثیہ گو شعراء کی سرپرستی کرتے تھے ـ

ملکۂ زمانی | نصیرالدین حیدر کی خاص محل تھیں ـ مرزا دبیر ان کے ہاں کے خاص مرثیہ گو تھے اور ان کی سرکار سے ماہانہ تنخواہ پاتے تھے ـ ان کی فیاضی اور جود وسخا کا لکھنؤ میں شہرہ تھا ـ ان کی بیٹی سلطان عالیہ، زوجہ نواب ممتاز الدولہ بھی مرثیہ کہتی تھیں اور مرزا دبیر کی شاگرد تھیں ـ

نواب افتخار الدولہ | لکھنؤ کے ایک امیر کبیر نومسلم رئیس تھے ـ آخر عمر میں کربلا معلّٰی چلے گئے اور کلید برداری کی سعادت حاصل کی، ان کے ہاں ۱۹، ۲۰، ۲۱ ماہ رمضان کی راتوں میں مجالس عزا منعقد ہوا کرتی تھیں پہلے مرزا دبیر اور پھر ان کے استاد میر ضمیر مرثیہ پڑھا کرتے تھے ـ استاد اور شاگرد کے درمیان وہ ناخوشگوار واقعہ یہیں ہوا تھا جس نے ان کے تعلقات خراب کر دیئے ـ

حسین علی خان اثر | یہ مرزا حیدر بیگ، نائب آصف الدولہ کے صاحبزادے تھے ـ ان کے ہاں تمام چہلم کی مجلسیں مرزا دبیر پڑھا کرتے تھے۔ جب عہدِ امجد علی شاہ، میں میر انیس فیض آباد سے لکھنؤ آگئے، تو ایک دن میر صاحب اور دوسرے دن مرزا صاحب پڑھنے لگے ـ نواب اثر خود شاعر اور ناسخ کے تلامذہ میں سے تھے ـ

میر باقر علی تاجر | میر باقر علی تاجر کے امام باڑہ واقع لکھنؤ چوک میں پہلے نوچھوین کی مجلس میر ضمیر پڑھتے تھے ـ پھر عہدِ محمد علی شاہ مرحوم سے مرزا دبیر نے پڑھنا شروع کر دیا اور مدت العمر ۲۵ رجب اور ۲۵ ذی قعد کی مجلس میں پڑھتے رہے ـ انیس و دبیر کی وفات کے بعد اس امام باڑے میں مرزا اوج خلف مرزا دبیر اور دولھا صاحب خلف میر نفیس مرحوم، مجالس پڑھتے رہے ـ

وزیر خان | یہ واجد علی شاہ کے دیوان خانہ کا داروغہ تھے اور منشی گنج احاطہ مرزا علی خان میں رہتے تھے ـ ہر ماہ کی ۲۳ تاریخ کو ان کے ہاں مرزا دبیر اور ان کے مقابلے میں

محمد خان داروغہ فیل شاہی کے ہان (اسی محلہ مین) میرانیس پڑھا کرتے تھے ـ

جواہر علی خان | ملکہ کشور کے خواجہ سرا تھے۔ محلہ گولا گنج مین رہتے تھے ـ ہر ماہ ۲۲ تاریخ کو مجلس منعقد کرتے تھے اور اسی محلہ مین نواب ناظر فیروزالدولہ خواجہ سرائے شاہی کے ہان ہر ماہ بارہوین کو بھی مجلس منعقد ہوتی تھی ـ دونون مین مرزا دبیر ہی مرثیہ خوانی کرتے تھے ـ

ان مجالس کے علاوہ ہر ماہ کی گیارہوین کو (اپنی ولادت کے دن) مرزا دبیر اپنے گھر مین مجلس منعقد کرتے تھے۔ ہر ماہ کی تیرہوین اور ماہ صفر کی اٹھارہوین کو احمد علی، سوزخوان کے ہان مرزا دبیر اور انہین تاریخون مین حیدر خان کے گھر میر انیس مرثیہ خوانی کرتے ـ

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد مجلسون کا یہ زور شور کم ہوگیا ـ سرپرست یا تو ختم ہوگئے ـ یا فلاکت کا شکار ہوکر اس قابل نہ رہے کہ کسی کی سرپرستی کرسکین ـ پھر بھی یہ سلسلہ کسی نہ کسی حد تک جاری رہا اور میر واجد علی تسخیر اور شیخ الطاف علی کی مجالس مین مرزا صاحب اور شیخ محمد عباس کی مجلسون مین میر انیس تاحیات مرثیہ خوانی کرتے رہے ـ (۱)

لکھنوی ثقافت پر مرثیہ کے اثرات | لکھنؤ کے علم دوست حکمران اور دربار سے مربوط کبائر یا وہ لوگ جو بالکل آزادانہ زندگی بسر کرتے تھے، یقیناً " ذہنی تابناکیون کے جواہر سے مالا مال تھے ـ یہ عجیب بات ہے کہ اسی ماحول مین جہان ڈیرہ دار طوائف کے فرشی سلام سے لے کر نوچی کی بھولی بھالی باتون تک تمام چیزین لوازم امارت مین داخل تھین، منظم فروغ صرف مرثیہ گوئی کو حاصل ہوا ـ جس کے محرکات بھی مذہبی ہین اور جس کے نتائج بھی ادبی ہونے کے باوصف مذہب سے اپنے ڈانڈے ملاتے ہین ـ

تحریک احیائے علوم (European Renaissance) کے مورخون نے بڑی نکتہ طرازی سے کام لے کر کہا تھا کہ مذہب اور آرٹ مین چولی دامن کا ساتھ ہے ـ ڈیوڈ کا مجسمہ اور آخری عشائے ربانی کی تصویر آج تک نہ صرف نگاہون کو خیرہ کرتی ہے بلکہ دلون کو حیرت مین لاتی ہے ـ لکھنؤ مین یہ ساتھ، یعنی مذہب اور ادب کا اشتراک مین ممکن ہے

---

(۱) ماخوذ از حیات دبیر صفحات ۳۲ تا ۳۵ و ۸۸ تا ۱۰۰ جلد ۱ ـ

که فرار کے وسیلہ کی حیثیت ہی سے شروع ہوا ہو لیکن جب مرثیہ گوئی نے اپنے قدم جمالئے
تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ ادب غیرمانوس ماحول مین نہین، بلکہ نہایت مناسب موزون اور مانوس
زمین مین جڑین پکڑ رہا ہے۔ مرثیہ گوئی کی ادبی اہمیت صرف اسی اعتبار سے نہین کہ جس
چیز کو یہ موضوع سخن بناتی ہے، وہ حزنیہ کے نہایت کامیاب عناصر اپنے اندر مخفی رکھتی
ہے۔ بلکہ اس لئے بھی ہے کہ مرثیہ نگاری کے کچھ آداب پیدا ہوئے اور رفتہ رفتہ ان آداب
نے ایک مختلف اور مستقل صنفی حیثیت اختیار کرلی — مثال کے طور پر سلام پڑھنا یا رباعیات
پڑھنا، مرثیہ خوانی کا جزو لازم نہ تھا — لیکن ایک فضا قائم کرنے کے لئے اور تاثر کا ایک سوچا
دائرہ بنانے کے لئے سلام اور رباعیاں لکھی گئین — ظاہر ہے کہ مدّاحِ شہ ذی رجاہ، امراء اور
کبرا کا مداح نہین ہوسکتا تھا — اس سے طبیعت مین جو استغنا اور تخلیقی لگن مین
صناعانہ بے پروا ہی پیدا ہوتی ہے، وہ سلام اور رباعی کی جان ہے — بالفاظِ دیگر لکھنؤ کی
ثقافتی زندگی نے صرف مرثیہ ہی پیدا نہین کیا، بلکہ مرثیہ کے وہ لوازم بھی تخلیق کئے، جنہین
ہم سلام اور رباعیان کہتے ہین — آج اگر مرثیہ گو شعراء کی رباعیات، اردو کے دامنِ مالا مال
سے خارج کردی جائین تو باقی کیا رہے گا ؟ اس کا جواب یہ ہے، کہ جو رہے گا اس کی
حیثیت نہ ہونے کے برابر ہوگی — بالفاظ دیگر صنفِ رباعی کا فروغ و ارتقا خالصۃً" لکھنوی
ثقافت، مذہبی تحریکات اور مرثیہ نویسی کا نتیجہ ہے۔ جن لوگوں نے عزا کی مجلسین سنی ہین،
وہ اس بات کے شاہد ہون گے کہ سوز خوانی سے پہلے چھوٹے چھوٹے بچے نہایت سلیقے سے
رباعیات پڑھتے ہین۔ خود مرثیہ نگار بھی رباعی سے اس چیز کا کام لیتا ہے جیسے یونانی ڈرامہ
مین (prologue) یا ابتدایہ کہتے تھے — جب مرثیہ خوان، سلام کا یہ شعر پڑھتا ہے

غیر کی مدح کرون شہ کا ثنا خوان ہوکر — مجرئی اپنی ہوا کھوؤن سلیمان ہوکر

تو ہم پر عظمت اور ایک ہیبت کا شعور طاری ہوتا ہے، اور ہم اس فضا مین داخل ہوجاتے
ہین، جہان مرثیے کو اپنا صحیح کام کرنا ہے، بالفاظ دیگر مرثیہ نویسون نے لکھنوی ثقافت کے
اخلاقی اقدار کو نہایت خوبی سے رباعیون اور سلامون کے ذریعے اردو مین منتقل کیا — اگر
کوئی شخص یہ دعوی کرے کہ لکھنوی معاشرت زوال پذیر تھی اس لئے یہ سلام اور رباعیان
معاشرت کی تخلیق نہین ہین، تو وہ یہ دعوی کررہا ہوگا کہ انیس دبیر اور دوسرے مرثیہ گو
شعرا ذہنی طور پر دیانت دار نہین ہین۔ اس دعویٰ کو قبول کرلینے سے یہ دعوی قبول
کرلینا کہین بہتر ہے کہ محرم کے ایام ہی مین سہی، لکھنؤ والے اعلیٰ اخلاقی اقدار کی تبلیغ

کی طرف متوجہ ضرور ہوتے تھے ۔ کیا یہ بات حیرت انگیز نہیں کہ تقسیم ملک کے بعد لکھنؤ میں مطلقاً* فرقہ دارانہ فساد نہیں ہوا ۔ اس دعوی کے نتائج و عواقب پر غور کرنے کی ضرورت ہے ۔ یہ ایک ایسے ذہنی خلا ملا کی خبر دیتے ہیں، جس میں ہندو اور مسلمان برابر کے شریک تھے اور اس امر پر یقین ہوجاتا ہے کہ انسان اقدار سے زندہ رہتا ہے روپے سے نہیں ۔ روپے کے ذریعے انسان صرف سانس لیتا ہے اور زندگی سانس لینے سے بالکل مختلف چیز ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزی میں بے شعور زندگی بسر کرنے کو ویجی ٹیٹنگ (Vegetating) کہتے ہیں کہ سانس تو نباتات بھی لیتے ہیں ۔

خود مرثیہ گو شعراء کی زندگی ان کے سلاموں اور ان کی رباعیات کی اقدار کی ترجمان ہوتی تھی ۔ شعراء کے متعلق کیسی کیسی فضیحتوں کا ذکر زبانوں پر آیا، لیکن مرثیہ گو شعراء کا دامن ان بیہودگیوں سے پاک رہا ۔ ان کے سلام، ان کی رباعیاں فی الواقع ان کی اخلاقی اقدار کی ترجمان ہوتی تھیں ۔ یہ ممکن نہیں کہ ایک گروہ کا گروہ تو فی الواقع مخصوص اخلاقی اقدار کے ضبط کا حامل رہے اور ثقافتی پیراہن اس رنگ سے خالی رہے ۔ اس اعتبار سے انیس و دبیر اور دوسرے مرثیہ گو شعراء کی کاوشیں نہایت اہم اخلاقی قدر و قیمت کی حامل ہیں، کہ انہوں نے ثقافت کے تانے بانے میں سے موسیقی کی دلچسپی کو کم کرکے عوام کو مرثیہ کی خوبصورتی کی طرف متوجہ کیا ۔ یہ بالکل اور سوال ہے کہ جن اقدار کے یہ سلام اور رباعیات ترجمان تھے ان کا اثر بالعموم لوگوں پر کیا ہوا، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ جو چیز پہلے موسیقی کی سُرتیوں سے شروع ہوتی تھی وہ مہذب ہوکر سلاموں کی دھنوں پر ابھری ۔ اس تنقیہ اور تہذیب کا سہرا مرثیہ نگاروں کے سر ہے ۔

بے تکلف یہ دعوی کیا جاسکتا ہے کہ اگر یہ مرثیہ نگار اپنے سلام، مرثیے اور رباعیات لے کر میدان میں نہ آتے تو آج آپ صرف کرشن اور گوپیوں کی ٹھمریاں اور غزل سنتے اور اودھ کا ثقافتی تنقیہ بالکل ناممکن ہوجاتا ۔ یوں تو اس جاگیردارانہ تہذیب کو مرنا تھا، مرگئی اور مٹ رہی ہے لیکن جن اقدار کو جنم دے گئی، وہ اب تک زندہ اور پائندہ ہیں ۔ موسیقی کا شوق، شعر کا ذوق، سلام و رباعی اور مرثیہ نویسی کی بدولت زندہ رہا ۔ غزل کی اہمیت سے انکار نہیں ہے لیکن آخری دور کے لکھنوی شعراء کی غزل بلکہ مثنوی میں بھی جذبات کا توازن معدوم ہوچکا تھا ۔ صحیح شعری ذوق اور سلیقہ، جو مرثیہ گو شعراء کے ہاں ہے دوسرے کے ہاں اگر نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب گردش روزگار نے یہ ناممکن بنادیا کہ ڈیرہ دار طوائفوں کے نخرے اٹھائے جائیں تو اہل دل نے جن کے کانوں میں رس بھری

شروع گونجتی تھین ۔ مرثیے سلام اور رباعی کی طرف رجوع کیا ۔یہی وجہ ہے کہ لکھنؤ مین دیر تک یہ سلسلہ جاری رہا اور اب تک وہان کے مرثیہ گو پنجاب مین یا ملک کے دوسرے خطون مین مرثیہ پڑھنے کے لئے پہنچتے ہین ۔ روایت کی اپنی تہذیب اور اس کا اتنا تسلسل اور تواتر صرف لکھنوی مرثیہ گویون کے ذریعے ممکن ہوا ہے،جب یہ لوگ باقی نہ رہے،تو سیماب اور جوش جیسے چوٹی کے شعراء منقبت و مرثیہ لکھنے لگے ۔اگر یہ لکھنؤ کا اثر نہین تو پھر کس چیز کا اثر ہے ؟ ۔

مختصر یہ کہ اودھ کی ثقافتی زندگی کی تہذیب اور اس کا تنقیہ مرثیئے کے ذریعے ہوگیا ۔فرمان روایان اودھ نے مضحکانہ حرکات بھی کین،لیکن ان سے عومی زندگی کے کوائف مین کوئی فرق نہین پڑتا ۔

انیس اور دبیر کی مقبولیت : شاہی خاندان سے دونون حضرات کو توسل حاصل تھا ۔غازی الدین حیدر، مرزا دبیر کو خود بلواکر سنتا تھا ۔(۱) اور واجد علی شاہ نے تو اس قدر عزت افزائی کی،کہ دوران مرثیہ خوانی اپنے ہاتھ سے چتر تھامے رکھا ۔(۲)

میر انیس کے خاندان کو نواب بہو بیگم(۳) کے زمانہ ہی سے حکمرانان اودھ کی سرپرستی حاصل تھی ۔خود انیس کو واجد علی شاہ کی مجلس خاص میں مرثیہ پڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی اور بادشاہ نے خوشنودی کا اظہار کیا ۔(۴)

زندہ دلانِ لکھنؤ کے مزاج مین شعر و سخن کے معرکون اور مقابلون کے تماشا کا ذوق انشاء اور مصحفی کے معرکون کی بدولت پیدا ہوا ۔ایک وقت مین خلیق اور ضمیر اور پھر ضمیر اور دبیر کو بھڑوادیا گیا،تو دبیر و انیس کی معرکہ آرائی کیون نہ ہوتی ؟ مگر خدا کا شکر ہے کہ یہان بھی مرثیہ گو شعراء کی سلامتِ طبع کی وجہ سے ہجونگاری تک نوبت نہ پہنچی ۔(۵) بلکہ اس سے کچھ فائدہ حاصل ہوا ۔مقابلہ کا شوق،عمدہ مضمون کی

---

(۱) حیات دبیر جلد ۱ ص ۲۹

(۲) شمس الضحی ص ۱۶۶ ۔

(۳) بہو بیگم سسرال کا لقب تھا اصلی نام امۃ الزاہرا بیگم تھا ۔موتمن الدولہ محمد اسحاق خان خوشتری کی بیٹی تھین جو عہد محمد شاہی مین میرآتش تھے ۔بادشاہ نے امۃ الزاہرا کو اپنی لڑکی بناکر شجاع الدولہ سے بیاہ دیا تھا ۔آصف الدولہ انہین کے بطن سے تھے ۔

(۴) حیات انیس اشہری ص ۳۰

(۵) سکینہ ص ۲۲۹ مزید برآن میر انیس اور مرزا دبیر کبھی ایک مجلس مین یکجا نہین پڑھے حیات دبیر ص ۳۱۹ ۔

تخلیق کا باعث ہوا اور مرثیہ کو جلا حاصل ہوئی اور یہ صنفِ سخن روز بروز منجھتی چلی گئی۔ (۱)

دونوں کے تلامذہ معتقدین اور نیازمندوں کی کثرت کے باعث، لکھنؤ دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ مرزا دبیر کے مداح 'دبیریے' اور میرانیس کے پیرو 'انیسئے' کہلانے لگے۔ دونوں گروہ اپنے اپنے ممدوحین کی تعریف اور تائید میں بڑی سرگرمی دکھاتے تھے۔ ان کے معرکوں، ایک دوسرے پر اعتراضات اور ان کے جوابات کے بالتفصیل مطالعے سے اُس وقت کے لکھنوی عوام کے ذوقِ سخن فہمی، علم و فضل، فن شعر کی جزئیات میں دلچسپی، دقت نظر اور سلامت طبع کا پتہ چلتا ہے۔ (۲)

میرانیس اور مرزا دبیر کے انداز سخن کی طرف اجمالی اشارہ

مرثیہ کو اردو ادب کی ایک خاص صنف کی حیثیت عطا کرنے میں، میرضمیر کے بعد دبیر اور انیس دونوں کی خدمات کو یکساں اہمیت حاصل ہے۔ دونوں بلاشبہ اپنے وقت کے عظیم فن کار تھے۔

دبیر کی عمر ابھی بمشکل سات برس کی تھی، جبکہ وہ اپنے والد کے ہمراہ دہلی سے لکھنؤ چلے آئے۔ (۳) ان کی والدہ بھی لکھنوی تھیں۔ تعلیم و تربیت، مشق سخن کا آغاز اور شہرت اسی شہر میں ہوئی۔ جوانی اور بڑھاپا یہیں کٹا۔ اس لئے قدرتی طور پر ان کے کلام میں لکھنؤ کے خاص رنگ، یعنی صنائع بدائع کے تکلفات، محسنات شعر کا اہتمام، تشبیہات و استعارات کی فراوانی اور ادبی روایات کا تحفظ، میر انیس سے مقابلتاً زیادہ ہے۔

لیکن اس کے مقابلے میں انیس کی ولادت فیض آباد میں ہوئی (۴) جب وہ لکھنؤ میں منتقل ہوئے تو ان کی عمر چالیس سال سے متجاوز تھی۔ (۵) شعر و سخن میں ان کے

---

(۱) خمخانۂ جاوید (لالہ سری رام) جلد اول صفحہ ۲۹۲۔

(۲) تفصیل کے لئے دیکھیں آب حیات (آزاد) المیزان (فوق) حیات دبیر، سبع مثانی (ثاقب لکھنوی) حیات انیس (اشعری) واقعات انیس (مہدی حسن احسن) اور انیس کی مرثیہ نگاری (مرزا جعفر علی اثر)۔

(۳) دیباچہ سبع مثانی (ثاقب لکھنوی) ص ۱۱۔

(۴) ۱۲۱٦ ھ واقعات انیس (مہدی حسن احسن) ص ۲۲۔

(۵) وہ لکھنؤ میں امجد علی شاہ کے عہد (۱۲۵۸ ھ تا ۱۲٦۳ ھ) میں منتقل ہوئے۔ (پیدائش ۱۲۱٦ ھ ہو تو نقل سکونت کے وقت عمر بیالیس اور سینتالیس سال کے درمیان ہوتی ہے)

خاندان کی اپنی روایات تھین ـ زبان کا تحفظ اور محاورہ اور روزمرہ کا فنکارانہ استعمال ان کے خاندان کے ادبی فرائض مین شامل تھا ـ نتیجۃً لکھنوی تکلفات کا اہتمام ان کے کلام مین نسبتاً کم ھے ـ وہ سادہ زبان استعمال کرتے ھین ـ

دبیر کے کلام مین، انیس سے زیادہ تکلفات باردہ کے اہتمام کی ایک وجہ یہ بھی ھے کہ جب انھون نے لکھنؤ کے معصیت آلود معاشرے مین اخلاقی اور مذھبی شاعری کا چراغ روشن کیا(۱)، اس وقت تک انہین تکلفات کو کلام کی خوبی اور زیور سمجھا جاتا تھا ـ عوام سیدھی سادی بے تکلف نظم کے ابھی عادی نہین ہوئے تھے ـ لہذا قدرتی طور پر انہین اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے دبیر نے مقبول عام طرز سخن کا سہارا لیا ـ اور انہین حسن و خوبی سے استعمال کرکے اپنے وقت مین بے پناہ مقبولیت حاصل کی ـ(۲) (۳)

لیکن، جب میرانیس کی مرثیہ گوئی کا آغاز ہوا تو اسٹیج تیار ہوچکی تھی ـ ضمیر، خلیق، فصیح اور دبیر نہ صرف مرثیہ گوئی کے نئے انداز اور روایات قائم کرچکے تھے، بلکہ مرثیہ کسی مقبولیت عام ہوچکی تھی اور وہ لکھنوی تمدن کا ایک خاص عنصر بن چکا تھا ـ لہذا میرانیس اپنی خاندانی روایات یعنی صحت محاورہ، تسلسل بیان اور سلاستِ زبان کے سہارے آگے بڑھے، اور جلد ھی اس شہرت مین برابر کے شریک ہوگئے جو مرزا دبیر اپنے لئے حاصل کرچکے تھے ـ

نفسِ مضمون کے لحاظ سے مرثیہ کا وصف سے گہرا تعلق ھے ـ(۴) قصائد کے لئے شکوہ الفاظ، ہماری شعری روایات مین ایک لازمی امر سمجھا جاتا رہا ھے، یہی وجہ ھے کہ سودا، بہترین قصیدہ گوؤن مین شمار ہوتے ھین ـ شکوہ الفاظ کے ساتھ وصف کی دوسری بڑی خوبی مبالغہ سمجھی جاتی رھی ھے ـ دبیر کے کلام مین یہ دونون عناصر، انیس سے زیادہ ھین ـ گو مغربی نظامِ تنقید کے زیرِ اثر آج یہ کلام کے نقائص سمجھے جاتے ھین ـ

---

(۱) دبیر نے انیس سے قریباً تیس سال پہلے مرثیہ گوئی مین شہرت حاصل کی ـ واقعات انیس ص ۲۶ ـ ۲۷

(۲) تعجب ھے کہ دبیر کے اجداد مین ایک بزرگ ملا ھلی شیرازی بھی اپنے عہد مین صنائع بدائع کے استعمال مین ماہر خصوصی سمجھے جاتے تھے ـ تفصیل دبیر کے بزرگون کے حالات مین ملاحظہ ہو ـ

(۳) انیس نے مرثیے مین کوئی ایجاد نہین کی انھون نے مرثیے کی مقبولیت سے فائدہ اٹھایا لکھنؤ اور ادب (آل احمد سرور) مطبوعہ بہترین ادب ۱۹۵۰ع ص ۲۷ ـ

(۴) مرثیہ نگاری اور انیس (محمد احسن فاروقی) ص ۲۸ ـ

مگر دبیر اپنے عہد میں ان نقائص کی بنا پر ہی انیس سے زیادہ مقبول تھے ۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں، کہ دبیر کا سارے کا سارا کلام روایاتی صنائع بدائع کا حامل اور دقیق ہے ۔ نہیں ! ایسا ہرگز نہیں ! ! انھوں نے آغازِ مشق کے وقت آسان اور بے تکلف زبان استعمال کی ۔ پھر ماحول کے زیر اثر پر تکلف اندازِ بیان اختیار کیا، مگر جب زمانہ کی روپلٹی اور صاف اور سلیس کلام بھی بار پانے لگا تو انھوں نے آسان، سلیس، بے تکلف اور رواں زبان استعمال کی ۔ چنانچہ ان کے مجموعہ میں ثانی الذکر نوع کے کلام کا بھی معتدبہ ذخیرہ موجود ہے، جسے اگر انیس کے کلام میں ملا دیا جائے تو تمیز نہ ہوسکے ۔

لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ نقائص جن کی بنا پر آج دبیر کو مطعون کیا جاتا ہے انیس کا کلام ان سے مبرا ہے رطب و یابس اور ماحول کے اثرات سے کوئی نہیں بچ سکتا ۔ (1)

لکھنؤ کے معاشرہ نے جس طرح نثر میں فسانۂ عجائب (سرور) مثنوی میں گلزار نسیم (پنڈت دیاشنکر نسیم) غزل میں آتش و ناسخ پیدا کئے اسی طرح مرثیہ گوئی میں دبیر بھی اس ماحول کا خاص نمائندہ ہے ۔

اردو انتقاد کی ایک عجیب خصوصیت دو ہمعصر شعرا کا موازنہ ہے ۔ موازنہ فی نفسہ کوئی بری چیز نہیں ۔ مگر اس مقصد کے لئے اشعار منتخب کرتے وقت ایک کو گھٹانے اور دوسرے کو بڑھانے کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے اور یہ بہت آسان ہے کہ اپنے ممدوح کے عمدہ اور دوسرے کے مقابلتاً "گھٹیا اشعار چن لئے جائیں اس طرح ایک کو آسمان پر اور دوسرے کو تحت الثری میں پہنچا دیا جائے کیونکہ

گر سخن اعجاز باشد بے بلند و پست نیست
در ید بیضہ ہمہ انگشتہا یکدست نیست

اور اس کے ساتھ نظام نسبتی (System of reference) کو بھی نظرانداز کردیا جائے تو اس بے انصافی کا احتمال بہت بڑھ جاتا ہے ۔

بے چارے دبیر کے ساتھ بالکل ایسا ہی ہوا ۔ اسے بدقسمتی سے ایسا نقاد ملا جس کی شخصیت بہت بھاری بھرکم اور چھاجانے والی تھی ۔ فی الواقع مولانا شبلی اپنے

---

(1) حیات انیس (اشعری) ص ۲۶۵ ۔ ۲۶۶ پر انیس کے اس نوع کے کلام کی مثالیں دی گئی ہیں ۔ نیز ملاحظہ ہو گل رعنا ص ۲۹۹ ۔

وقت مین تنقید کے ڈکٹیٹر تھے (۱) ان کے زورِ قلم نے دبیر کے کلام کی اہمیت کو بالکل ختم کردیا ۔ گو موازنہ انیس و دبیر کے جواب مین بہت کچھ لکھا گیا، مگر مولانا کی شخصیت کے سامنے کسی کا چراغ نہ جل سکا ۔ نتیجۃً "آج بہت کم لوگ یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار ہین کہ دبیر جو مدت العمر انیس کا حریف اور مدمقابل رہا فی الواقع اس قابل بھی تھا کہ اسے انیس کے مقابلے پر لایا جائے (۲)

---

(۱) مقدمہ مقدمہ دیوان حالی ڈاکٹر وحید قریشی ص ۵۳ مطبوعہ مکتبہ جدید لاہور

(۲) مندرجہ بالا بیان کی تائید مین سید رضاعلی صاحب کی خود نوشت سوانح عمری 'اعمالنامہ' سے مندرجہ ذیل اقتباسات پیش کئے جاتے ہین، جو خالی از دلچسپی نہین :۔

" دبیر کی طرف ابھی ملک کی توجہ نہین معلوم ہوتی ۔ ملک کے ادبی مذاق کو بھیڑ چال کہنا چاہئے ۔ بھیڑون کے گلہ کا قاعدہ ہے کہ جدھر ایک یا دو آگے چلنے والی بھیڑین جاتی ہین باقی بھیڑین بھی وہی راستہ چلتی ہین ۰۰۰۰ مولانا شبلی کی کتاب موازنہ انیس و دبیر کا عوام پر یہ اثر ہوا کہ دبیر انیس کے ہم پلہ نہ رہے ۰۰۰۰۰

مولوی شبلی ایسے زبردست ادیب اور ناقد سخن تھے اور مین ان کی جامعیت سے اِس درجہ متاثر ہون کہ جو فیصلہ انھون نے کیا ہے، اس کی صحت کے تسلیم نہ کرنے کو ادبی بدعت سمجھتا ہون ۔ اگر مین اس بدعت کا ارتکاب کرون، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ موازنہ کے وقت انیس کا بلند اور بہت بلند اور دبیر کا پست اور بہت پست کلام ان کے پیش نظر تھا ۔ موازنہ کا صحیح معیار یہ ہونا چاہئے کہ ایک حریف کے بلند کلام کا دوسرے حریف کے بلند کلام سے اور پست کلام کا پست کلام سے مقابلہ کیا جائے ۔ مقابلہ ہم مرتبہ اشخاص یا اشیا کا کیا جاسکتا ہے ۰۰۰ کسی شاعر کا سارا کلام ہموار اور یک وزن نہین ہوسکتا بڑے سے بڑے شاعر کو لے لیجئے اگر خود اس کے بلند کلام کا پست کلام سے مقابلہ کیا جائے تو زمین آسمان کا فرق نظر آئے گا ۰۰۰۰۰ اگر انیس کے بہترین کلام کا دبیر کے بہترین کلام سے مقابلہ کیا جائے تو میری ناچیز رائے مین ترجیح کا تاج بلا تامل کسی ایک کے سر پر رکھ دینا دشوار کام ہوگا " ۔ اعمال نامہ (سر رضاعلی) ص ۵۰ ۔ ۵۱

اس بحث کی تائید خود مرزا دبیر اور میرانیس کے کلام سے ہوتی ہے : دبیر کی اپنے کلام کے متعلق رائے

گلزار ہے یہ نظم و بیان بیشـــہ نہین ہے   باغی کو بہی گلگشت مین اندیشہ نہین ہے

ہر مصرعۂ برجستہ ہے پہل تیشہ نہین ہے   یان مغز سخن کا ہے رگ و ریشہ نہین ہے

صحت مری تشخیص سے ہے نظم کے فن کی

مانند قلم ہاتھ مین ہے نبض سخن کـــــی

گر کاہ ملے فائدہ کیا کوہ کنـــــی ہے   مین کاہ کو گل کرتا ہون رنگین سخنی سے

خوش رنگ ہین الفاظ عقیق یمنی سے   یہ ساز ہے سوز غم شاہ مدنی ســــے

آہن کو کرون نرم تو آئینہ بنالون

پتھر کو کرون گرم تو مین عطر نکالون

(جلد ۱ نولکشور ۱۹۲۷ ع ص ۲۲۵ مرثیہ کس شیر کی آمد ۰۰)

اس کے برعکس میر انیس اپنی طرز تکلم کو اس طرح واضح فرماتے ہین :

جد و آبا کے سوا اور کی تقلید نہ ہو

لفظ مغلق نہ ہو گنجلك نہ ہو تعقید نہ ہو

وہ مرقع ہو کہ دیکھین اسے گر اہل شعور   ہر ورق مین کہین سایہ نظر آئے کہین نور

نل ہو یہ ہے کشش ہو قلم طرہ حــــور   ایک اك حرف مین ہو صنعت صانع کا ظہور

کوئی ناظر جو یہ نایاب نظیرین سمجھے

نقش ارژنگ کو کاواك لکیـــرین سمجھے

قلزم فکر سے کھینچون جو کسی بزم کا رنگ   شمع تصویر پہ گرنے لگین آآ کے پتنگ

صاف حیرت زدہ مانی ہو تو بہزاد ہو دنگ   خون برستا نظر آئے جو دکھادون صف جنگ

رزم ایسی ہو کہ دل سب کے پھڑك جائین ابھی

بجلیان تیغون کی آنکھون مین چمك جائین ابھی

روز مرہ شرفا کا ہو سلاست ہو وہـــی   لب و لہجہ وہی سارا متانت ہو وہی

سامعین جلد سمجھ لین جسے صنعت ہو وہی   یعنی موقعہ ہو جہان جس کا عبارت ہو وہی

لفظ بھی چست ہو مضمون بھی عالی ہووے

مرثیہ درد کی باتون سے نہ خالی ہووے

ہے کجی عیب مگر حسن ہے ابرو کے لئے — سرمہ زیبا ہے فقط نرگس جادو کے لئے
تیرگی بد ہے مگر نیک ہے گیسو کے لئے — زیب ہے خال سیاہ چہرۂ گلرو کے لئے

دانند آنکس کہ فصاحت بہ کلامے دارد
ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد

(مرثیہ نمک خوان تکلم ہے فصاحت میری — جلد ۱ ص ۲۰۷ مطبوعہ لاہور ۱۹۵۹ء)

دونون اساتذہ کے متذکرہ بالا بندون کے مطالعہ سے دونون کے مطمح ہائے نظر اور معیار سخن پر روشنی پڑتی ہے — جہان دبیر اپنے کلام کو گلزار سے تشبیہ دے کر کاہ کو بھی اپنی رنگینی سے گل بنانے کا دعوی کرتے ہین، وہان میرانیس روز مرہ، سلاست، لب و لہجہ کی متانت اور قریب الفہم صنعت کے استعمال پر اپنی قدرت کا بجا ادعا فرماتے ہین — اتحاد مقاصد کے باوجود یہان سے دونون راستے جدا ہوجاتے ہین — اس مین کوئی شک نہین کہ جسے امتحان زمان (Test of the time) کہا جاتا ہے، اس مین میرانیس، مرزا دبیر کے مقابلے مین بہت زیادہ کامیاب ہین — آج بہت کم لوگ ایسے ہین جو ثانی الذکر کے کلام کا مطالعہ محض طبعی رجحان اور لطفِ شعر کے لئے کرتے ہون — اس کی وجہ صاف ہے کہ دبیر نے ایک خاص قسم کی کلاسیکی شاعری مین کاوش کی، جس کی اس عہد مین بہت مانگ تھی — لیکن وہ کاوش بے حقیقت یا گناہِ بے لذت کے نام سے تعبیر نہین کی جا سکتی — وہ عقیقِ معنی بدخشان جیسے خوش رنگ الفاظ تراشتے ہین، تو نہ صرف یہ کہ اس سے زبان کا دامن مالا مال ہوتا ہے، بلکہ مغزِ سخن مین بھی اضافہ ہوتا ہے — الفاظ کا تصور بغیر معنی کے تو کوئی چیز ہی نہین — ہان فرق صرف انداز بیان کا ہے ایک آپ کو شراب شعر سفید آبگینے مین پیش کرتا ہے دوسرا مرصع جام مین — سرور اور کیف دونون کے ہان موجود ہے —

اس دعوی کے ثبوت مین دونون کے کلام سے ہم مضمون بند پیش کئے جاتے ہین :-

حضرت عباس کی آمد

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے
رستم کا جگر زیر کفن کانپ رہا ہے
ہے قصرِ سلاطین زمن کانپ رہا ہے
رن ایک طرف چرخ کہن کانپ رہا ہے
شمشیر بکف دیکھ کے حیدر کے پسر کو
جبریل لرزتے ہین سمیٹے ہوئے پر کو

آمد ہے جگر بند شہ قلعہ شکن کی
لشکر مین تلاطم ہے زمین ہلتی ہے رن کی
سرداروں پہ ثابت ہے جدائی سروتن کی
سستی ہین رگین خوف سے شیرون کے بدن کی
ہے تیغ بکف قوت بازوشہ دین کا
تھمتا نہین ملحی پہ قدم گاو زمین کا

بجائے: ہے قصرِ سلاطین زمن کانپ رہا ہے

مرزا دبیر

ہیبت سے نہ قلعہ افلاک کے در بند
جوزا فلک بھی نظر آتا ہے نظر بند
وا ہے کمر چرخ سے جوزا کا کمر بند
سیارے ہیں غلطان صفت طائر پربند
انگشت عطارد سے قلم چھوٹ پڑا ہے
خورشید کے پنجے سے علم چھوٹ پڑا ہے
النشر کا ہنگامہ ہے اس وقت حشر میں
الصور کا آوازہ ہے اب جن و بشر میں
الہجر کا ہے تذکرہ باہم تن و سر میں
الوصل کا غل ہے سقر و اہل سقر میں
الحشر جو مردے نہ پکاریں تو غضب ہے
الموت زبان ملک الموت پہ اب ہے
ص۲۲۶ جلد ۱ نولکشور ۱۹۳۷ء

میر انیس

غل ہے علم دار حسین آتا ہے رن میں
ہے تہلکہ مصر و حلب و روم و ختن میں
مردے بھی تہ خاک لرزتے ہیں کفن میں
پھرتے ہیں ہرن چوکڑی بھولے ہوئے بن میں
غازی کی سواری نہیں خیمے سے بڑھی تھی
شیروں کو نیستان میں تپ لرزہ چڑھی تھی
رنگ رخ خورشید ہوا جاتا ہے تغییر
جوبا ہے ستاروں کی زرہ کا فلک پیر
سہما ہوا مخفی شکم قوس میں ہے تیر
مہ کے قلعے سے چھٹی جاتی ہے شمشیر
جمعیت عالم کے یہی نشر کا دن ہے
سیاروں پہ ثابت ہے کہ یہ حشر کا دن ہے
مراثی انیس جلد ۱ ص۹۷۔۹۸
مطبوعہ لاہور ۱۹۵۹ء

حضرت عباس کا شمر کے حواریوں سے خطاب

شبیر سے کہ شہر ہیں یہ شہر خدا کے
تو کیا ہے بھلا شیر تو ہو سامنے آکے
چاہیں تو ملا دیں یہ طبق ارض و سما کے
ہر تابع فرمان ہیں یہ رب دوسرا کے
ثابت ہیں قدم منزل تسلیم و رضا میں
سر ہاتھ پہ رکھے ہوئے ہیں راہ خدا میں
ص۸۲ جلد ۱ نولکشور ۱۹۳۷ء

تم کون ہو حسین ہے مختار خشک و تر
ان کے سوا ہے کون شہنشاہ بحر و بر
دیکھو فساد ہوگا بڑھو گے اگر ادھر
شیروں کا یاں عمل ہے تمہیں کیا نہیں خبر
سبقت کسی پہ ہم نہیں کرتے لڑائی میں
بس کہ دیا کہ پاوں نہ رکھنا ترائی میں
مراثی انیس جلد ۲ ص ۲۵ مطبوعہ لاہور
۱۹۵۹ء

ان لوگوں سے کہ دیں نہ ہمیں غیظ میں لائیں
مہمانوں کے خیموں کو نہ دریا سے ہٹائیں
فردائے قیامت کی عطش بھول نہ جائیں
دنیا کے لئے ہاتھ سے عقبیٰ نہ گنوائیں

چھوڑیں نہ زمیں کو جو گرے سر پہ آسمان
بڑھ کر ہٹا نہیں کبھی اس فوج کا نشان
جب تک کہ دم میں دم ہے نہ جائے گی آن بان
رتی پہ ہم بپا کریں خیمے خدا کی شان

اس دھوپ کی برداشت نہیں لائیں گے بچے | مرجائیں وہ جو ساتھ کئی شیر خوار ہیں
کے ہے آپ تڑپ کر ابھی مرجائیں گے بچے | فی الواقع ہم ایسے ہی تقصیر خوار ہیں
(ص ۸۲ جلد ۱ نولکشور ۱۹۳۷ء) | (مراثی انیس جلد ۲ ص ۲٦ مطبوعہ لاہور ۱۹۵۹ء)

حضرت کا اپنی ذات کے متعلق ارشاد

دبیر (حضرت کفار کے سامنے رجز خوان ہیں)	انیس (حضرت امام خدا سے مخاطب ہیں)
نانا سے پیمبر کے ہے افضل میرا نانا	نانا تو دیا اشرف ذریت آدم
سو کون وہ ہے ختم رسل شافع عقبیٰ	بابا شہ مردان سا دیا فخر دو عالم
بابا سے علی کے مرا بابا بھی ہے اعلیٰ	ماں سیدہ کون و مکان ثانی مریم
وہ کون شہ قلعہ شکن سید بطحیٰ	بھائی وہ کہ تو جس کی بزرگی سے ہے محرم
ماں میری بضاعت ہے رسول عربی کی	دنیا میں کسی اور کا رتبہ ہے کب ایسا
ایسی تو نہ مادر تھی رسولوں میں کسی کی	نام ایسا گھر ایسا نسب ایسا حسب ایسا
مرثیہ: کیوں چرخ میں گردوں کی طرح رن میں زمین ہے نسخہ قلمی مملوکہ مرزا صادق صاحب (اس بند میں دبیر کا رنگ نسبۃً زیادہ نمایاں ہے)	مراثی انیس جلد ۳ مطبوعہ لاہور ۱۹۵۹ء ص ۲۲٦ ـ

فریق مخالف کے لشکر سے خطاب

دبیر	انیس
میکال و روح نام مرے خادموں کے ہیں	حاکم ہوں میں سب خلق خدا ہے مرے تابع
حاکم خدا کے حکم سے ہم حاکموں کے ہیں	میں باب اجابت ہوں دعا ہے مرے تابع
فتوے ہمارے قتل پہ کن عالموں کے ہیں	مختار قدر ہوں میں قضا ہے مرے تابع
یہ کام عالموں کے نہیں جاہلوں کے ہیں	آتش مری محکوم ہوا ہے مرے تابع
دنیا خراب ایسوں کی عقبیٰ زبون ہے	قبضہ ہے مرا خاک کے ہر گنج نہاں پر
خون محمد عربی میرا خون ہے	جاری ہے مرا حکم روان آب رواں پر
ص ۳۲ جلد ۱ نولکشور ۱۹۳۷ء	ص ۲۳۱ جلد ۳ لاہور ۱۹۵۹ء

حر حضرت امام علیہ السلام کی طرف سے جنگ مین جاتے ہین

اس شیر پہ اسوار جو آیا وہ صف شکـــــــن
یون دفعۃ کھڑے ہوئے اعدا کے موئے تن
جون صورت زرہ ہوئے سوراخ پیسر ہین من
بسمل کی نبض بن گئے سرتاقدم بـــــدن
میدان سے پانون اٹھ گئے اور خود بھی گر گئے
مارا طمانچہ خوف نے منہ سب کے پھر گئے

ص ۳۱۰ جلد ۲ نولکشور ۱۹۳۶ع

لہ رعد تھرا گیا نعرے جو سنے ضیغم کے
استخوان کانپ گئے زیر زمین رستم کے
تہ و بالا ہوئین لشکر کی صفین جھجم
برق شمشیر سے ڈر ڈر کے فرس بھی چمکے
نوبت جنگ نہ آئی تھی کہ دل ٹوٹ گئے
بیرقین گر گئین ہاتھون سے نشان چھوٹ گئے

ص ۱۰۸ جلد ۲ لاہور ۱۹۵۹ع

بین

(حضرت عباس کی شہادت پر)

سر پیٹ کے سب بیبیون نے دھوم مچائی
شہ رن کو چلے کہ کے یہ ہے ہے مرے بھائی
سر ننگے سکینہ بھی یہ کہ کر نکل آئی
مارا مرے سقے کو محمد کی دھائی
ہے ہے یہ ضیافت ہے نئی لشکر شر کی
فاقہ تو نہ توڑ وایا کمر توڑی پدر کی
بھائی کہا اور بھائی سے لپٹے شہ والا
ہونٹوں سے ملے ہونٹ دھن پیار سے چوما
رو رو کے کہا آنکھ تو کھولو میرے شیدا
کچھ باتین کرو ہم سے کہو دل کی تمنا
ہے ہے یہ میرے سامنے کیا ہوتا ہے بھائی
تم مرتے ہو شبیر تمہین روتا ہے بھائی

ص ۱۰۲ و ۱۰۳ جلد ۲
نولکشور ۱۹۳۶ع

ڈیوڑھی پہ حرم کرنے لگے گریہ و زاری
عباس کی زوجہ نے ردا سر سے اتاری
بیتابی مین ڈیوڑھی سے سکینہ یہ پکاری
کیون آئی نہ اب تک میرے عمو کی سواری
مین اپنے چچا کو نہ اگر پاون گی بابا
سر پیٹتی دریا پہ چلی آون گی بابا
چلائے یہ لاشے سے لپٹ کر شہ عالم
ہیہات ترے ہاتھ گئے اے مرے ضیغم
جعفر کا یہ ماتم ہے علی کا ہے یہ ماتم
عباس ترے داغ سے جینے کے نہین ہم
تنہائی مین بھائی کی کمر توڑ چلے ہو
لہ انتیس برس بعد ہمین چھوڑ چلے ہو

ص ۲۲۰ جلد ۲ لاہور ۱۹۵۹ع

حضرت علی اصغر کی شہادت پر

مرزا دبیر

بانو نے آگے بڑھ کے یہ شور بکا کیا
والی کہو مرے علی اصغر کو کیا کیا
رو کر حسین بولے کہ نذر خدا کیا
امت کے شیر خواروں پہ ان کو فدا کیا
بی بی یہ تیرے منسلیوں والے کی قبر ہے
بانو یہ تیرے گود کے پالے کی قبر ہے
سنتا تھا یہ کہ زانو و سر پیٹنے لگی
تربت پہ کہ کے ہائے پسر پیٹنے لگی
کبری ادھر سکینہ ادھر پیٹنے لگی
اکر بتول خستہ جگر پیٹنے لگی
سیری نہ پیٹنے سے ہوئی سانس اٹک گئی
آنے لگا جو غش تو لہو سے لپٹ گئی
بولی پسر سے پیار میں اصغر اٹھو اٹھو
بس سوچکے مزار میں اصغر اٹھو اٹھو
آو مرے کنار میں اصغر اٹھو اٹھو
بہنیں ہیں انتظار میں اصغر اٹھو اٹھو
اکدم کے دم میں ہائے یہ سامان ہوگئے
غش آیا تیر کھایا لحد میں بھی سوگئے

میر انیس

مڑ کر شہ والا نے جو دیکھا تو یہ دیکھا
اک حشر مزار علی اصغر پہ ہے بپا
سر کھولے ہوئے پیٹتی ہے دختر زہرا
کہتی ہے سکینہ میرے بھیا مرے بھیا
بانوئے حزیں چاک گریباں کئے ہے
چھاتی کے تلے ننھی سی تربت کو لئے ہے
چلاتی ہے اصغر مجھے آواز سنا و
تربت میں اندھیرا ہے میری گود میں آو
قربان گئی ننھے سے ہاتھوں کو اٹھاو
مرجائے گی ماں خاک سے منہ کو نہ چھپاو
تھا میں نے سبط شہ لولاک کو سونپا
شبیر نے ہاں لا کے تمہیں خاک کو سونپا

دونوں کے کلام کے تطبیقی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں دبیر اپنے مرثیوں میں بین پر زیادہ زور دیتے ہیں اور اسے طویل تر لکھنے کی کوشش کرتے ہیں، انیس ایسا نہیں کرتے اور بین کو دوچار بندوں میں ختم کردیتے ہیں ۔ دبیر مرثیہ کے آغاز ہی سے مُبکیہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے ۔ انیس واقعات کے بیان کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور انہیں سے حزنیہ اثرات پیدا کرتے ہیں ۔ دونوں کی طبیعت کے مخصوص انداز ہیں ۔ راقم الحروف کے خیال میں اسی میں میر انیس کی مقبولیت کا راز ہے اگرچہ اس امر کا امکان ہے کہ وہ لوگ جو مرثیہ کا واحد مقصد گریہ و ماتم ہی سمجھتے ہوں، دبیر کو انیس پر ترجیح دیں ۔

حصہ دوم (سوانح)

حصّہ دوم

سوانح

حصہ دوم (سوانح)

باب اول (دبیر کے ابتدائی حالات)

دبیر کا خاندان ۔ دبیر کا خاندان اور کاغذ فروشی اور اس کی تحقیق ۔ دبیر کی استعداد علمی اور ذہانت ۔ دبیر کے کلام کے منازل ارتقا ۔ آغاز شاعری

ملا ہاشم شیرازی نثار (برادر یعنی ملا اہلی شیرازی صاحب
مثنوی سحر حلال)

مرزا محمد رفیع متخلص بہ رفیع

مرزا غلام محمد

مرزا غلام حسین (متولد ۱۱۹۰ھ)

دختر میر بیرعلی بجنوری کو منسوب ہوئیں
متولدہ دہلی

دختر متولدہ دہلی
حکیم میر محمد حسین عزیز کو
منسوب ہوئیں اور لاولد رہیں

مرزا غلام محمد نظیر ولادت
دہلی وفات ۱۲۹۱ھ

میر فضل حسین

میر بسم اللہ

دختر

دختر

دختر
منسوبہ میر جید رحسین

کاظم

محمد تقی محمد

محمد عباس سفیر

مرزا محمد

میر محمد صولت

دختر
زوجہ حکیم آغا حسین

مرزا سلامت علی دبیر
ولادت ۱۱ جمادی الاولی ۱۲۱۸ھ
دلی محلہ بلی ماران
وفات ۳۰ محرم ۱۲۹۲ھ نخاس لکھنو

(آگے دیکھئے دبیر کی اولاد کے حال میں)

باب اول

دبیر کا خاندان | آزاد نے "آب حیات" مین دبیر کے حالات "خاندانی شاعر نہ تھے" کے جملہ سے شروع کیے مین اور حاشیہ پر یون رائے زنی کی ہے :-

"تذکرہ سراپا سخن مین لکھا ہے کہ ان کے والد مرزا آغا جان کاغذ فروش تھے ـ پھر ایک جگہ اسی کتاب مین لکھتے مین ـ دبیر ولد غلام حسین متعلقانِ مرزا آغا جان کاغذ فروش سے ہین ـ مصنف موصوف کو شوق ہے کہ ہر شخص کے باب مین کچھ نہ کچھ نکتہ طنز کا نکال لیتے ہین اس لئے خاندان کے باب مین نہ یقین ہے نہ شک" (۱)

مندرجہ بالا تحریر سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آزاد دبیر کے خاندانی حالات کے متعلق کماحقہ تحقیق نہ کرسکے ـ نیز تذکرہ سراپا سخن (میرمحسن علی) کے بیان کی صحت پسر بلکہ صاحب تذکرہ کی ثقاہت پر بھی انہین یقین نہ تھا ـ مگر مزید ذرائع کی عدم موجودگی کی وجہ سے جو کچھ انہین معلوم ہوسکا انھون نے لکھ دیا اور "نہ یقین ہے نہ شک" کے جملہ کے اضافہ سے خود ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کردیا ـ تذکرہ مذکور کی زیر بحث عبارت حسب ذیل ہے :-

"دبیر تخلص، مرزا سلامت علی ولد مرزا غلام حسین، کاغذ فروش، شاگرد مظفرحسین ضمیر، مرثیہ اچھا کہتے ہین، مگر ایسا نہین کہ عیوبِ شاعری سے پاک ہو ـ راقم نے ان کو عظیم آباد مین دیکھا ہے" (۲)

اسی تذکرہ مین دوسری جگہ مندرجہ ذیل عبارت مرقوم ہے :-

"مرثیہ گوئی مین طاق، صف آرائی اور مضمون خیزی مین شہرۂ آفاق مرزا سلامت علی دبیر ولد مرزا غلام حسین، متعلقانِ آغاجان، کاغذ فروش سے، باشندۂ لکھنو ارشد تلامذۂ میر مظفرحسین ضمیر مرثیہ گو" (۳)

---

(۱) آب حیات (آزاد) ص۵۳۷

(۲) سراپاسخن (میرمحسن علی) نولکشور ۱۲۹۱ھ ص۲۱۵ ـ

(۳) سراپاسخن مذکور ص ۲۱۵

مجموعۂ سخن اور سخن شعراء مین علی الترتیب پہلی اور دوسری عبارت نقل ھے ۔اس کے بعد مرزا حیرت دھلوی نے دبیر کو نومسلم کائستھ قرار دے کر میدان تحقیق مین ایک حیرت انگیز مثال قائم کردی (١)

کسی فن کار کے خاندانی شاعر نہ ہونے اور کاغذ فروش کو اپنا ذریعۂ معاش بنانے سے اس کی عظمت اور عزت پر کوئی حرف نہین آتا ۔اس کی عظمت اس کی تخلیق مین ھے ۔ ارباب کمال معاشرہ کے کسی خاص طبقہ سے مخصوص نہین ۔اگر فی الواقع دبیر کے والد کاغذ فروش یا نومسلم کائستھ ھی ھوتے پھر بھی بحیثیت ایک شاعر کے اس کے مقام مین کوئی نقص واقع نہ ھوتا اور بظاھر ان مختلف روایات کی تائید یا تردید کی ضرورت نہ تھی مگر بغیر چھان بین اور تحقیق کے کسی بیان کی صحت اور ضعف کے متعلق فیصلہ دینا نامناسب ھے ۔

مرزا دبیر کے مورثِ اعلی، ملا ھاشم شیرازی (٢) تھے،جو ملا اهلی شیرازی کے حقیقی بھائی تھے ۔مولف حیاتِ دبیر نے ملا اهلی مذکور کے متعلق " مجالسِ المومنین[٣] " کے حوالہ سے بیان کیا ھے :

" ملا اهلی، شعراءِ فضلا مین مشہور اور فقر و مسکنت اور بے التفاتی اهل دنیا مین معروف ھین ۔اکثر شاعرون سے مہارتِ فن شعر کے سبب سے امتیاز رکھتے تھے ۔ ھر وقت شعر کہتے تھے ۔ایسی مثنوی سحرِ حلال کہی ھے کہ ھر شعر مین دو قافیہ ھین اور

---

(١) چراغ دھلی (مطبوعہ ١٩٣٠ع) ص ٢٣
(نیز دیکھئے مرآۃ الشعراء محمد یحیی تنہا عالمگیر الیکٹرک پریس لاھور ١٩٢٥ع جلد اول ص ٢٧١ " مرزا سلامت علی نام دبیر تخلص تھا لڑکپن مین مرثیہ پڑھتے تھے اس شوق نے منبر کی سیڑھی سے مرثیہ گوئی کے آسمان پر پہنچا دیا ۔ خاندانی شاعر نہ تھے ۔ان کے والد مرزا آغاجان کاغذ فروش تھے ..... ")

(٢) المیزان اور حیات دبیر مین انہین نثر مین " وحید دوران " لکھا ھے مگر کسی تذکرہ سے اس کی تائید اور تردید نہ ھوسکی ۔ اور نہ ھی ان کی کوئی تصنیف دستیاب ھوسکی معلوم ھوتا ھے کہ شاھان دھلی کی درباری تحریرون کے علاوہ کوئی نظم یا نثر مین یادگار نہ چھوڑی ۔

(٣) (مجالس المومنین) ٩٩٠ ھ مطابق ١٥٨٢ع مین لکھی گی تھی یعنی سید نوراللہ ابن شریف المرعشی شوستری کی مجالس المومنین ۔ ان کو ١٠١٩ ھ (١٦١٠ع یا ١٦١١ع) مین غالی شیعہ ھونے کے الزام مین ھندوستان مین قتل کردیا گیا تھا ...

(بقیہ حاشیہ برصفحہ آیندہ)

ہر شعر دو بحروں میں پڑھا جاتا ہے ۔پڑھنے والے کی عقل حیران ہے۔سلطان سلوجی کے مشہور قصیدۂ صنعتی کے جواب میں ایک قصیدہ میر علی شیر (۱) کے نام پر کہا ۔اس میں چند صنعتیں قصیدۂ سلمان سے بھی زیادہ ہیں ۔ خود میر علی شیر نے دادِ انصاف دے کر کہا کہ سلمان سے بہتر کہا ہے " (۲)

ڈاکٹر براؤن نے ملا اہلی شیرازی کے متعلق حسب ذیل رائے کا اظہار کیا ہے :۔

"۰۰۰۰۰۰۰ وطن شیراز اور سال وفات ۹۲۲ھ مطابق ۱۵۲۵ء ۔ ۱۵۳۶ء ان دونوں کا تعلق (اہلی ترشیزی کا واقعتا اور اہلی شیرازی کا معنا ") ہرات کے اس حلقۂ مشاہیر سے ہے،جو سلطان حسین اور میر علی شیر کی قدردانیوں کی وجہ سے وہاں قائم ہوگیا تھا ۔ باکمالانِ ہرات کا یہ جمگھٹا جس سے ظہوری ترشیزی (وفات ۱۰۲۴ھ مطابق ۱۶۱۵ء) کا تعلق بھی تھا،صرف اپنے ہی زمانے میں خراسان میں مشہور ہوا ۔ بقیہ ایران نے کبھی اس کی شہرت تسلیم نہ کی ۔لیکن ہندوستان میں اسے کافی شہرت حاصل ہے جہاں ظہوری کو جس کا ایران میں کوئی نام تک نہیں جانتا بدیع اور مرصع نگار کی حیثیت سے غیر معمولی (اور میری رائے میں ناجائز (۳)) شہرت حاصل ہے ۔اہلی شیرازی کا خاص کمال تجنیسات اور دیگر صنائع وبدائع لفظی پر اس کی بڑی قدرت ہے "۔ (۴)

(حاشیہ گذشتہ سے پیوستہ)

اس کے بارہ ابواب میں علماء کے علاوہ ہر شعبہ کے شیعہ مشاہیر کے حالات بھی دیئے ہوئے ہیں ۔نیز اثناعشری حضرات کے علاوہ اس میں ان سب لوگوں کے حالات بھی موجود ہیں جو حضرت علی کی خلافت بلافصل کے معتقد ہیں (تاریخ ادبیات ایران در عہد جدید پروفیسر براؤن ترجمہ سید وحاج الدین احمد کنتوری مطبوعہ انجمن ترقی اردو دہلی ۱۹۳۹ء) ص ۷۹

(۱) میر علی شیر نوائی وزیر ابوالغازی حسین تیموری سلطان (تاریخ ادبیات ایران مذکور) ص ۱۳۲ ۔

(۲) حیات دبیر ص ۳ ۔

(۳) ڈاکٹر براؤن کی رائے میں ۔

(۴) ڈاکٹر براؤن تاریخ ادبیات ایران مذکور ص ۳۳۷ ۔

موتمن نے ملا اهلی شیرازی کا ذکر ان الفاظ مین کیا هے :-

" ...... وملا اهلی شیرازی که بنا بگفته صاحب تذکره نصرآبادی در معمی (۱) ولغز (۲) واشعار مصنوع و موشح بے مثل بوده وصاحب ذوقان دیگر دراین فن هنرنمائی ها کرده اند اینان غالبا در مجامع ادبی که معمولا در قهوه خانه ها تشکیل می شد جمع می گشتند ومعمیات خود را مطرح می کردند و هریك بحل معما می دیگری می کوشید وازاین راه بریك دیگر سبقت می جستند پاره ای ازاین شاعران بقدری دراین رشته تخصص حاصل می کردند که بمعمائی شهرت می یافتند " (۳)

میرزا اهلی شیرازی کی ایك غزل کا مطلع ؎

جانم بروز واقعهٔ پهلوئے اوکید　　　اوقبله من است رخم سوئے اوکید

"اوقبلهٔ من است اور رخم سوئے اوکید" کا معمٰی اس وقت حل هوا جب مرزا اهلی شیرازی کو خواجه حافظ شیرازی کے پهلو مین جگه ملی اور سنگ مزار پر یهی غزل کنده هوئی ـ رحلتِ حافظ کی تاریخ "خاك مصلی" (۷۹۲ ھ) اور رحلتِ اهلی کی تاریخ "پادشاه شعراء بود"

---

(۱) معمی شعری را گویند که شاعر نام شخص یا چیز و موضوع مورد نظر را بانواع تعمیت وابهام ازقلب وتصحیف خواص حساب وکنایات واشارات ومبهمه دیگر دریك یا چند بیت بنوعے بپوشاند که جز بتامل و دقت بسیار حل آن دست ندهد ـ (شعر وادب فارسی موتمن مطبوعه کتب خانه ابن سینا طهران) ص ۲۱۵ ـ

(۲) لغز بفتح وضم ثانی بمعنی پیچیدگی وراه کج وانصراف ازراه راست است ودر اصطلاح ادبیات شعری را گویند که شاعر چیزی را درنظر گیرد وصفات ومشخصات و خصوصیات آن را درکسوت عباراتی مشکل ومشابه بدون ذکر نام بیان نماید وکشف آن را ازخواننده بخواهد ـ این قسم شعر را که بطریق خطاب وسئوال واغلب بالفظ چیست آن　شروع می شود درفارسی چیستان هم می گویند شعر وادب فارسی مذکور ص ۲۱۲ اردو مین اسے بجهارت یا پهیلی کهتے هین مولف

(۳) شعر وادب فارسی مذکور ص ۲۱٦ ـ

اعلیٰ" (۱) (۹۲۲) اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایران میں ڈیڑھ سو برس تک ایک شخص بھی اس اہلیت کا نہ مل سکا کہ حافظ کے پہلو میں جگہ پاتا ـ اس کا اہل صرف اہلی شیرازی تھا جو عالمِ غیب میں آج تک حضرت لسان الغیب سے غیب کی باتیں کر رہا ہے" (۲)

"مرزا صاحب کے آباؤ اجداد شیراز میں ہمیشہ بڑے بڑے عہدوں اور منصبوں پر سرفراز و ممتاز رہے پھر زمانہ کی ناموافقت کے سبب سے دہلی و اکبرآباد (آگرہ) میں وارد ہوئے ـ (۳)

ملا اہلی جس طرح نظم میں یکتائے زمان تھے، اسی طرح نثر میں ملا ہاشم وحید دوراں تھے زمانہ بھی اتفاق سے موافق پایا ـ ہندوستان میں آکر شاہانِ مغلیہ کے عہدۂ جلیلہ میر منشی پر معین و سرفراز ہوئے ـ (۴)

مرزا عنایت اللہ خان، مرزا ابوظفر خان جو مرزا غلام حسین (والدِ دبیر) کے حقیقی نانا تھے، صوبۂ کشمیر کے ناظم تھے اور ان کے صاحبزادہ مرزا شہامت علی خان (مرزا غلام حسین کے ماموں) شہزادگان دہلی کے استاد اور خطِ نستعلیق لکھوانے پر مامور تھے (۵)

دبیر کے پردادا مرزا محمد رفیع (۶) شاہانِ مغلیہ کے دربار میں میر منشی کے عہدہ پر سرفراز تھے ـ ان کے بعد یہ عہدہ ان کے لڑکے مرزا غلام محمد کو منتقل ہوا ـ مرزا غلام محمد (دادا دبیر) نے یادِ الٰہی کے لئے گوشۂ نشینی اختیار کی اور اس موروثی عہدہ کو چھوڑ دیا ـ شاہ عالم ثانی، از راہِ قدردانی چار ہزار سات سو اکیس روپے سالانہ بموجب فرمان محررہ

---

(۱) قطعۂ تاریخ وفات ملا اہلی جو ملا میرک کی تصنیف ہے حسب ذیل ہے :-

درمیان شعرا و فضلا	بہر باصدق و صفا بود اہلی
رفت با مہر علی از عالم	پیرو آل عبا بود اہلی
سال فوتش زخرد جستم و گفت	بادشاہ شعرا بود اہلی

۹۲۲ھ حیات دبیر ص ۲

(۲) رسالہ ندیم گیا بہار نمبر ۱۹۳۵ء مضمون س ش ص از وصی بلگرامی ـ

(۳) حیات دبیر ص ۵ ـ نیز دیکھیں شمس الضحیٰ (مولوی صفدر حسین) و تنقید آب حیات (میر محمد رضا ظہیر) ـ

(۴) دیباچہ سحر شانی (ثابت لکھنوی) ص ۱۰ ـ

(۵) حیات دبیر شمس الضحیٰ و تنقید آب حیات مذکور ـ

(۶) مرزا محمد رفیع صاحب رفیع کا ایک قصیدہ روضۂ رضوان میں طبع ہوا ہے جس کا مطلع یہ ہے :

اے شہنشاہ دنی ملک و تدفی کشور والضحیٰ روئے و قمر طلعت و والنجم افسر

۳ رجب المرجب ۱۱۷۵ ھ مقرر فرمادی ـ فرمان کی عبارت حسب ذیل ہے :ـ

چون بعرض مقدس و معلی رسید که فضیلت و شرعیت مآب و صلاح دستگاه غلام محمد ابن ملا محمد رفیع ولد ملا محمد هاشم شیرازی مناصب جلیله سرکار از خیال مآل اخری رضینه برضائے جناب باری عز اسمه و مابدولت و اقبال بانتهائے تدین و کمال رسانیده باکراه ثانی از ترکب مناصب متعلقه و تعلقات حادث از مزید شوق طاعت واجب الکلا الوجود اعتکاف ساخته ـ لہذا بصواب دید قدامت عنایت الله خان ابن ابو ظفر خان ناظم صوبه کشمیر جد مادری معزالیه و شهامت علی خان حال استاد شهزاده هائے عطیون و ملا محمد هاشم مرحوم جد پدری شان برضا جوئی خلاق عالم و کسب ثواب اخری که خاصه سلاطین و فرمان روایان پیشین بوده است ـ بنظر مراتب صدر چهارلك و هشتاد و هشت هزار و یك صد و بست دام بتعداد چهار هزار هفت صد و سی و یك روپیه از پرگنه حویلی دارالخلافت شاهجهان آباد در وجه مدد معاش متعلقان مشار الیه بافرزاندان بطریق التمغا از نصف خریف پارس تیل حسب الضمن مقرر باشد ـ باید که فرزاندان کامگار والا تبار و امرائے عالی مقدار و متصدیان مهمات و جاگیرداران و کروریان حال و استقبال وجه مذکورا نسلا بعد نسل و بطنا بعد بطن بتصرف فرزندان و متعلقان مشار الیه بازگذارند و از جمیع وجوه عوارض مرفوع القلم شمارنده درین باب هر سال مجدد نه طلبند ـ

سیوم شهر رجب المرجب ۱۱۷۵ ھ
مطابق ۳ جلوس والا تحریر یافت (۱)

---

(۱) شمس الضحی تنقید آب حیات و حیات دبیر (ان ایام مین جبکه یه فرمان جاری ہوا شاہ عالم ثانی جھانسی کی جنگ مین به نفس نفیس موجود تھا اور اس واقعه کے ۹ سال بعد (۲۹ رمضان ۱۱۸۵ ھ تك) وہ دلی نه آسکا اس لئے فرمان ندا پر عمل درآمد ممکن ہے نه ہوسکا ہو) نجم الغنی تاریخ اودھ ج ۲ ص ۶۲ و مقدمه نادرات شاہی و تاریخ هندوستان ذکا ءالله مطبوعه ۸۹۸ ج ۹ ص ۲۹۸ تا ۳۲۳ ـ

جب مرزا غلام حسین (ولد مرزا دبیر) پیدا ہوئے تو اسی بادشاہ (شاہ عالم ثانی) نے مندرجہ ذیل فرمان کی رو سے ایک سو روپیہ ماہوار مرضعہ کے مصارف کے لئے شاہی خزانہ سے مقرر فرمائے :-

"درین وقت میمنت اقتران از وقائع مولود فرزند ملا غلام محمد نوادہ ملا ہاشم شیرازی و نام نہاد بمسمی غلام حسین بسمع ہمایون رسید، حکم جہان مطاع عالم مطیع بنام خلافۃ خازن خزانۂ عامرہ سلطانی بارشاد ماموری یکصد روپیہ سکہ کہن ماہانہ مصارف مرضعہ ولیعرھم شرف صدور فرمودہ، حاسبان دفتر دیوانی سرکار معلی سوائے ماہانہ ملا غلام محمد محسوبہ سنین پیشین ماہانہ ھذا بمصارف مرضعہ ھا ولیعرھم غلام حسین مولود حال بخازن خزانۂ خاقانی بمجرائے مجدد، مجرا دادہ قبض مہری غلام حسین بہ دفتر داشتہ باشند ـ درین باب ہر سال سند مجدد نہ طلبند ـ

هفتم شہر رمضان المبارک ۱۱۹۰ ھ مطابق ۱۸ جلوس والا تحریر یافتہ (۱)

۱۲۱۵ ھ میں مرزا غلام حسین کے متعلق چھان بین ہوئی اور ایک استشہاد مرتب کیا گیا جو شمس الضحی اور اس کے حوالے سے تنقید آب حیات اور حیات دبیر میں مندرج ہے جس کی عبارت سے مرزا غلام حسین کے بچپن کے حالات اور دیگر کوائف معلوم ہوتے ہیں لہذا اسے بجنسہ یہاں نقل کیا جاتا ہے :-

"گواہی مے طلبد بصدق و شہادت می خواہد بحق از روسائے لکھنو و شاہجہان آباد و اکبرآباد تنگ و عاردارین مسمی بہ غلام حسین ابن مرزا غلام محمد خلف مرزا رفیع ولد ملا ہاشم شیرازی برادر عینی ملا اعلی شیرازی حشر ہما اللہ مع الائمۃ المعصومین علیہم السلام بدین مضامین صداقت آگین از قدیم الایام بزرگان ابا عن جدا احقرالعباد در شیراز کہ موطن و مولد آنہا بودہ، ہموارہ بمناصب جلیلہ و مدارج رفیعہ ممتاز بودند چون بسبب نامساعدت ایام جلائے وطن ساختہ وارد اکبرآباد شدند مرزا عنایت اللہ خان ابن مرزا ابوظفر خان جد مادری آنم ناظم صوبہ کشمیر و ماموں صاحب مرزا شہامت علی خان بنوسایدن خط نستعلیق باستادی

---

(۱) ملاحظہ ہو شمس الضحی تنقید آب حیات ـ حیات دبیر و مضمون س ش ص ارومی بلگرامی رسالہ ندیم گیا بہار نمبر ۱۹۳۵ ع

شهزادگان منصوب وجد امجد بعهدهٔ منشی گیری سرفراز و ممتاز گردیدند وتامدت مدید عرصه
بعید بهمین مناصب جلیله خوش گذران ماندند ووالد مغفور نیز صاحب اقتدار بودند ــ لاکن
چون والدهٔ ماجده مستشهد از دار فانی بعالم بقا انتقال نموده والد مرحوم عقد دیگر ساختند
حقیر که درآن ایام نه ساله بود ــ در مکتب خانه تحصیل علم می نمود و والد مرحوم حسب ارشاد
شاهی اکثر بسفر می ماندند مادر نامهربان بوجه مغائرت بطن بانواع واقسام ایذا مـــی
رسانید ــ چنانچه روزی زهر هم در طعام داده معلم حقیر ازین دشمنی آگاه گشته حقیر را
از اکبرآباد به شاهجهان آباد بخانه مرزا فتح علی خان ابن مرزا افضل علی خان که باپدر
حقیر صیغه اخوت و روابط قدیم میداشتند آورد وحال مهربانی مادر نامهربان حالی ساختـــه
جناب خانصاحب موصوف متاسف گشته مثل بزرگان سلف که فرزند آشنا را فرزند خود می دانستند
حقیر را بخانه خود به هزار شفقت و محبت نگاه داشتند ــ چون والد مرحوم از کار سرکار انفراغ
یافته مراجعت نمودند جوبائے حقیر گشتند ــ مادر نامهربان نسبت آوارگی و بد افعالی باین
بیقصور نموده ــ لاکن باین همه والد مغفور بسبب مهرپدری بیتاب گشته برائے تلاش حقیـــر
بشاهجهان آباد آمدند وبخانهٔ خان صاحب ممدوح سراغ یافته حقیر را دربر کشیدند وچند
روز مهمان خان صاحب مانده حقیر را همرا خود بردند هرچند که خان صاحب ممدوح نام بنده
گرفته بوالد ماجدم تفهیم نمودند که ایشان را درخانهٔ بنده بگذارید که خانه خانهٔ شماست و
درخانه شما یقین هلاکت ایشان است که مادر جدید نامهربان است ــ والد بنده باقتضائے
حمیت عذر نمودند ومفارقت این جانب گوارا نساختند ــ چند سال باز بنامهربانی هائے مادر
نامهربان بسر بردم ــ چون والد ماجدم بسن سیزده سالگی حقیر از دنیا رخت سفر آخرت
بستند واقربائے مادر نامهربان مال واسباب وجمیع اشیائے والدم از حقیر پوشیده بقبض وتصرف
آوردند ــ حقیر که محض بے دست وپا بود ــ چارو نچار بخانه فتح علی خان باز آمده بسکونت
درزید درآن ایام خلط خان صاحب ممدوح هم مبتلائے عسرت بودند ــ لاکن مهمانداری حقیر
از اول زیاده تر نمودند ــ از انجا که شهر مذکور بسبب تاراج وغارت خواطر قابل نماندن نماند
عزیمت لکهنو فرمودند ــ بنده نیز همراه معظم الله وارد لکهنو گردید ــ حقیقت حال این ست
که بقید رقم آورده ــ هرکس که درین شهر از آبا واجداد بنده آگاهی کماهی داشته باشـــد
حسبة لله مهر وگواهی زیب تحریر نماید وچون استشهاد نامه هذا در اکبرآباد وشاهجهان
آباد بنظر روسائے شهرین مذکورین بگذرد هرقب که قربـــه الی الله از روئے یقین کالشمس
فی النهار طالعا مواهیر شهادت خود ثبت نمائند که عندالله ماجور وعندالناس مشکور خواهد

بود ـ

تحریر فی التاریخ هفتم رجب المرجب ۱۲۱۵ هجری الهندی النبوی ـ

اس استشهاد کی پیشانی پر مندرجہ ذیل عبارت اور شاہ عالم ثانی کی مہر ثبت ہے :ـ

"فی الحقیقت بزرگان مستشهد از شرفائے شیراز و بسرکار ما بعهد هائے جلیله ممتاز بوده اند "

بادشاہ کے علاوہ استشہاد مذکور کی تصدیق دیگر چندرہ اکابرین نے کی ہے جن کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں :ـ

(۱) آفتاب جنگ نواب محمد نوراللہ خان بہادر ضیاء الدولہ منیرالملک

" حقا که جناب صداقت مآب اخی مرزا غلام حسین صاحب خلف الصدق مرزا غلام محمد صاحب طاب ثراه از شرفائے ذوی الاقتدار و نجبائے عالی تبار خطه پاک شیراز هستند ـ و جده ما در مغتنم الیه و جدهٔ ایشجانب هر دو خواهر عینی بوده اند "

(۲) سید دلدار علی صاحب (مجتهد اول)

"بگواهی ثقات سیما بشهادت مرزا کاظم علی صاحب محقق گشته و بیقین پیوسته که لاریب جناب مستشهد صداقت مآب اخی نجیب الطرفین عالیمناقب مرزا غلام حسین صاحب خلف مهین جناب مرزا غلام محمد صاحب ولد مرزا رفیع ابن ملا هاشم شیرازی از شرفاء نجبائے جلیل القدر شیراز و روسائے ممتاز اکبرآباد آباد هستند کتبه احقرالعباد سید دلدار علی "

(۳) حسن رضا خان "لا ریب فیه "

(۴) کاظم علی شهدی فیه

(۵) سید فرزند علی ساکن مغلپوره " و انی علی ذلك من الشاهدین "

(۶) مرزا رحمت علی خان "آنچه درهن است حق است "

(۷) نواب محمد مسیح اللہ خان صاحب اعجاز خسروی متخلص به مسیح

"گواه محضر هذا مسیح است صحیح است وصحیح است وصحیح است

(۸) امجد علی خان بہادر "بخدا که عالی نسبی و والی حسبی مستشهد اظهر من الشمس و امین من الامس "

(۹) نواب مختار خان برادر زاده نعمت علی خان عالی که باوالد مستشهد صیغهٔ اخوت دارد

" لا ریب فیه که قره باصره شرافت وغیره ناصیه شرافت جناب مستشهد ممدوح نجیب الطرفین است "

(۱۰) خان بہادر اللہ ساکن اکبرآباد "واللہ باللہ کہ آنچہ درحق است حرفاً حرفاً و لفظاً لفظاً از والد مرحوم بارہا شنیدہ ایم"۔

(۱۱) فضل علی عرف آغا جان ابن فتح علی خان "واللہ ثم باللہ کہ جناب مستشہد بعوض احسان مہمانداری چند روزہ کہ والد مغفور بر معظم اللہ نمودہ اند احسانات فراوان بر من فرمودہ و میفرمائند ۔چنانچہ درین ایام در مکان مکرم اللہ سکونت میدارم"

(۱۲) امین الدین علی داروغہ دیوان خانہ حضرت شاہ عالم و عالمیان خلداللہ ملکہ "حدین دارالخلافت خاندان مستشہد جلیل الشرافت از آفتاب روشن تر است"

(۱۳) علی مردان خان بہادر "الا مر کذالک"

(۱۴) مرزا محمد باقر "فی الواقع کہ جناب مستشہد ممدوح از خاندان جلیل و از دود مان نجیب و اصل است"

(۱۵) سید احسن اللہ "حقیر معتقد عزیز را درس داہ است"

مرزا غلام حسین کے چاروں بچے (دو لڑکیاں مرزا نظیر اور سلامت علی دبیر علی الترتیب) دلی ہی میں پیدا ہوئے (۱) ۔ دلی میں انھوں نے غالباً اپنی سب جائداد فروخت کردی اور اس کی جگہ لکھنو میں آکر مکانات وغیرہ خرید لئے جو آج تک لکھنو میں موجود ہیں اور وہ گلی کوچۂ دبیر (محلہ نخاس) کہلاتی ہے (۲) ۱۲۳۵ھ (۳) میں وہ واپس لکھنو آئے اور یہیں مستقل طور پر بس گئے ۔

مرزا غلام حسین نے واپس لکھنو آکر بھی کوئی ملازمت نہ کی یہ سعادت علی خان کا عہد تھا جبکہ متعدد آسامیاں تخفیف میں آچکی تھیں اور ملازمت کا دائرہ تنگ ہوچکا تھا

---

(۱) حیات دبیر ص ۱۲ ۔

(۲) ایضاً ۔

(۳) دیباچہ سبع مثانی (ص ۱۱) میں مذکور ہے کہ جب مرزا غلام حسین مستقل طور پر لکھنو منتقل ہوئے تو اس وقت دبیر کی عمر سات سال تھی چونکہ دبیر کی پیدائش ۱۲۱۸ھ کی ہے اس لئے یہ واقعہ ۱۲۲۵ھ کا ہوا ۔ اور چونکہ مرزا غلام حسین کی پیدائش ۱۱۹۰ ہے لہذا اس موقعہ پر ان کی عمر پینتیس سال ہوئی ۔

مولف حیاتِ دبیر کا یہ خیال غلط ہے کہ "یہ نواب آصف الدولہ کا عہد تھا اور اس وقت ملازمت سہل الحصول تھی " (۱) نواب آصف الدولہ ۱۲۱۲ ھ مین وفات پا چکے تھے ۔ جبکہ مرزا غلام حسین کی عمر بائیس سال سے بھی کم تھی اور یقین سے یہ دعوی نہین کیا جا سکتا کہ مرزا غلام حسین اس وقت لکھنو مین موجود تھے ۔ آصف الدولہ کی وفات اور مرزا غلام حسین کے دوبارہ لکھنو آنے اور مستقل رہائش اختیار کرنے کے درمیان تیرہ سال کا زمانہ ہے جو انھون نے بیشتر دلی مین گذارا (۲) ۔ لہذا ملازمت اختیار نہ کرنے کی وجہ ان کی بے نیازی کی بجائے ملازمت کا نہ ملنا معلوم ہوتی ہے ۔

لکھنو مین مرزا غلام حسین کی مالی حالت اور وجۂ معاش

لکھنو مین مرزا غلام حسین کی وجۂ معاش کیا تھی اور ان کی مالی حالت کیسی تھی ؟ اس کے متعلق عجیب متضاد آراء سے سابقہ پڑتا ہے ۔ ایک تو وہی صاحب تذکرہ سراپا سخن کی کاغذ فروشی والی روایت ہے مگر وہ انہین ایک جگہ از متعلقان آقا جان کاغذ فروش کہتا ہے ۔ لیکن دبیر کے خاندان مین کسی آقا جان نام کے آدمی کا ذکر نہین ۔ ہان اس استشہاد پر جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے ایک شخص فضل علی خان عرف آقا جان ابن فتح علی خان کی مہر ثبت ہے اور ساتھ یہ عبارت منقول ہے :-

"واللہ ثم باللہ کہ جناب مستشہد بعوض احسان مہمانداری چند روزہ کہ والد مغفور بر معظم الیہ نمودہ اند احسانات فراوان برمن فرمودہ میفرمایند چنانچہ درین ایام در مکان مکرم الیہ سکونت می دارم " (۳)

مہمانداری کے حوالہ سے یہ یقین ہوجاتا ہے کہ یہ آقا جان انہین فتح علی خان کے لڑکے ہین جن کے پاس مرزا غلام حسین نے اپنا بچپن کا زمانہ بسر کیا جس کی تفصیل استشہاد مذکور مین درج ہے ۔ ہوسکتا ہے کہ یہ بزرگ کاغذ کی تجارت کرتے ہون مگر استشہاد کے متن مین فتح علی خان کے متعلق لکھا ہے کہ وہ آخر عمر مین "مبتلائے عسرت" تھے جس کی تصدیق مہر کے ساتھ والی عبارت سے بھی ہوتی ہے کیونکہ آقا جان اپنے مرزا غلام حسین کے پاس مقیم ہونے کا ذکر ممنونیت کے انداز سے کرتے ہین ۔ اس لئے مرزا مذکور کا

---

(۱) حیات دبیر ص ۱۲ نیز حاشیہ ۳ صفحہ مذکور

(۲) کم از کم ۱۲۱۲ ھ تا ۱۲۲۵ ھ وہ دلی مین رہے جہان چارون بچے پیدا ہوئے اور سب سے چھوٹے بچے کی عمر سات سال ہوگی ۔

(۳) شمس الضحی

آقا جان کے متعلقین (١) سے ہونا ثابت نہیں ہوتا ۔ اس خاندان سے جو فائدہ مرزا غلام حسین کو پہنچا وہ ان کی ابتدائی عمر کے ساتھ ختم ہوگیا ۔ آقا جان نے بھی صرف "مہماندارئ چند روزہ" کا تذکرہ کیا ہے رشتہ داری یا کسی کاروباری شراکت کا ذکر نہیں ۔ اسی طرح اپنے متعلق بھی وہ ان کے گھر پر صرف سکونت کا ذکر کرتے ہیں اور وہ بھی نیازمندی کے ساتھ ۔ اگر وہ کوئی کاروبار یا تجارت کرتے ہوتے تو انہیں اس نیازمندی کی ضرورت نہ تھی ۔ اس سلسلہ میں مولف حیات دبیر کی رائے بھی ملاحظہ کے قابل ہے :۔

"میں نے لکھنؤ کے بعض معمر آدمیوں سے سنا ہے کہ وہ آقا جان اور مرزا غلام حسین یہ دونوں صاحب بزرگوں کے وقت کا اسباب خانہ داری، دوشالہ، ہتھیار، ظروف نقرہ، وطلا وغیرہ، جو بہت کچھ تھا بیچ بیچ کر کھایا کئے ۔ اس زمانہ میں کاغذ بھی بہت قیمتی ہوتا تھا ۔ خصوصا ایرانی و کشمیری کاغذ بہت ہی قیمت پاتا تھا ۔ ممکن ہے کہ ان صاحبوں کے ساتھ کچھ کاغذ بھی ہو اور وہ بیکار سمجھ کر بیچ دیا ہو" (٢)

لیکن مرزا غلام حسین تو استشہاد مذکور میں یہ لکھ چکے ہیں :۔

"چون والد ماجدم بسن سیزدہ سالگی حقیر از دنیا رخت سفر آخرت بستند و اقربائے مادر نامہربان مال و اسباب وجمیع اشیائے والدم از حقیر پوشیدہ وتصرف آوردند حقیر کہ محض بے دست وپا بود چارو ناچار بخانۂ فتح علی خان بازآمدہ بسکونت درزید"

جب مال و اسباب سوتیلی ماں کے رشتہ داروں نے قابو میں کرلیا تھا تو ظروف نقرہ وطلا و ہتھیار وغیرہ کہاں سے آگئے ؟ لہذا مولف حیات دبیر کا یہ خیال کہ وہ بزرگوں کا مال و اسباب بیچ بیچ کر گذارہ کرتے تھے درست معلوم نہیں ہوتا ۔ اس کے ساتھ ہی جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مرزا مذکور کی مالی حالت بڑی حد تک اطمینان بخش تھی اور وہ سینکڑوں روپے بطور خمس و زکواۃ ادا کرتے تھے جیساکہ حجۃ الاسلام مولانا سید دلدار علی صاحب کے مندرجہ ذیل خط مطبوعہ شمس الضحی سے ظاہر ہے :۔

---

(١) ورنہ سنویت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا ۔ نیز یہ صاف طور پر لکھا ہے کہ مرزا غلام حسین آقا جان کے والد کے پاس بطور مہمان رہے تھے جن سے ان کے (مرزا غلام حسین کے) والد کا بھائی چارہ (صیغۂ اخوت) تھا ۔

(٢) حیات دبیر ص ۵۵۵ ۔ ١١

"جناب مرزا صاحب کرمفرمائے دوستان مستجمع الطاف و احسان عالی مراتب والا مناقب مرزا غلام حسین صاحب دام مجدہ ـ بعد سلام مسنون الاسلام واضح رائے شریف باد ـ که مبلغ پانصد روپیه زکوۃ و خمس که بدست مس غلام حیدر فرستادند رسید انشاءالله تعالی بمستحقین مومنین تقسیم کردہ خواھد شد زیادہ والسلام ـ مرقومه چهارم شهر رمضان ۱۲۱۶ هجری نبوی ـ "

سید دلدار علی ۱۲۱۰ ھ

یه بھی مسلمه ھے که لکھنئو آکر مرزا موصوف نے کوئی ملازمت نہین کی ـ لہـذا ھین ان کی مرقع الحالی کے پیش نظر صاحب تذکرہ سراپا سخن کی یه رائے درست معلوم ھوتی ھے که مرزا غلام حسین کاغذ کی تجارت کرتے تھے ـ جو بذات خود نہائت معزز پیشه ھے ـ البته "کاغذ فروش" کے لفظ مین تحقیر کا پہلو موجود ھے جس کے استعمال پر میر محسن علی (صاحب تذکرہ سراپا سخن) ضرور مورد الزام ھین ـ اس کی بجائے تاجـر یا سوداگر کا لفظ استعمال کیا جاسکتا تھا ـ *

دبیر کی پیدائش مولف حیات دبیر ایک تحریری شہادت کی بنا پر بیان کرتے ھین که مرزا کی پیدائش ۱۱ جمادی الاول ۱۲۱۸ ھ کو ھوئی (ص ۲۰) اور سلامت علی نام تجویز ھوا ـ

دیباچه صبح شانی ص ۱۱ مین میر افضل حسین ثابت رقم طراز ھین که جب دبـیر کی عمر سات سال کے قریب تھی تو مرزا غلام حسین معه خاندان لکھنئو منتقل ھوگئے ـ اور پھر وھین کے ھو رھے ـ وھین آپ کی تعلیم و تربیت کا آغاز ھوا ـ

استعداد علمی اور ذھانت دبیر کے علم و فضل کے سب قائل ھین ـ تمام کتب درسیـه منقول و معقول، عربی و فارسی، اپنے وقت کے مستند اساتذہ سے پڑھی تھین صرف و نحو منطق ادب و حکمت وغیرہ مولوی غلام ضامن (۱) صاحب سے اور

---

(۱) "مولوی غلام ضامن صاحب رتبے کے فاضل تھے ـ ایک دن غزل لئے کر (مرزا فاخر مکین کے پاس) گئے که مجھے شاگرد کیجئے اور اصلاح فرمائیے ـ مرزا فاخر نے ٹال دیا ـ مولوی صاحب نے پھر کہا ـ انھون نے پھر انکار کیا اور کج خلقی کرنے لگے ـ جو عجز و انکسار تھے سب مولوی صاحب نے ادا کئے ایک نه قبول ھوا ـ ناچار یه شعر پڑھ کر اٹھ کھڑے ھوئے ـ

مرزا مکین ما نشود چون بکین ما کین است جزو اعظم مرزا مکین ما آب حیات ص ۱۶۹

* تحفۂ جاوید (جلد سوم ص ۱۵۱ مطبوعہ دہلی ۱۳۲۵ھ) میں لالہ سری رام صاحب جو حالات مرزا دبیر کے بزرگوں کے درج کئے ہیں وہ تمام کے شمس الضحیٰ سے ماخوذ ہیں ... اس لئے مرزا غلام حسین صاحب کے اثاث البیت کو بیچ بیچ کر گزارہ کرنے کی روایات بطور شہادت پیش نہیں کی جاسکتی

کتب دینیہ فقہ حدیث تفسیر اصول وغیرہ مرزا کاظم علی (۱) سے تحصیل کین ۔ ان کے علاوہ ملا مہدی مجتہد مازندرانی اور مولوی گلشن علی صاحب اخباری (۲) سے بھی شرف تلمذ تھا ۔

آغاز شاعری گیارہ برس کی عمر مین انہین، ان کے والد میر ضمیر مرحوم کی خدمت مین لے گئے اور عرض کیا کہ انہین اہل بیت کی مداحی کا بہت شوق ہے ان کی تربیت فرمائیے ۔ انہون نے ان کی تحصیل علمی کے متعلق پوچھنے کے بعد کہا کہ اگر کچھ اشعار موزون کئے ہون تو سنائین ۔ دبیر نے مندرجہ ذیل اشعار سنائے :-

کسی کا کندہ نگینے پہ نام ہوتا ہے　　کسی کی عمر کا لبریز جام ہوتا ہے
عجب سرا ہے یہ دنیا کہ اس مین شام و سحر　　کسی کا کوچ کسی کا مقام ہوتا ہے

میر ضمیر اس کم سن کے منہ سے اتنا عمدہ کلام سن کر بے حد متاثر ہوئے اور دبیر تخلص تجویز فرماکر حلقہ تلمذ مین شامل کرلیا (۳) ۔

---

(۱) مرزا کاظم علی ایک مشہور عالم اخباری شیعہ تھے ۔ فخر الدولہ مرزا محمد رضا برق صاحب شاہ اودھ انہین کے فرزند ارجمند تھے جو ناسخ کے ارشد تلامذہ مین سے تھے (حیات دبیر ص ٦ حاشیہ ۲) ۔

(۲) مرزا صاحب مرحوم کے کئی استاد اخباری تھے ۔ بعض حضرات مرزا صاحب کو بھی اخباری مسلک سمجھتے تھے مگر تحقیق یہ ہے کہ مرزا صاحب ایک محتاط اصولی شیعہ تھے ۔ حیات دبیر ص ۲٦ ۔

(مذہب اصولی آج کل بھی رائج ہے مگر اخباری مذہب اگرچہ کسی زمانے مین بہت مشہور تھا لیکن آجکل کچھ ایسا زیادہ قابل اعتنا نہین رہا ہے ۔ ان دونون مذاہب کے پیروؤن مین ہمیشہ سے شدید مخالفت رہی ہے ۔ اصولی مذہب جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے ان عام اصولون کی پیروی کرتا ہے جو قرآن اور معتبر احادیث سے مستنبط ہوتے ہین اور استخراج نتائج مین قیاس کو دخل دیتا ہے برخلاف اس کے اخباری مذہب مین صرف اخبار کی پیروی کی جاتی ہے اور قیاس کو مطلق دخل نہین دیا جاتا (تاریخ ادبیات ایران در عہد جدید ص ۵۰٦ مطبوعہ انجمن ترقی اردو ہند دھلی ۱۹۳۹ ع)

(۳) حیات دبیر ص ۲۱ تا ۲۳ ۔

بقیہ حاشیہ برصفحہ آئندہ)

دبیر کی ذہانت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ اٹھارہ انیس سال ہی کی عمر تک نہ صرف یہ کہ فارغ التحصیل ہوچکے تھے بلکہ مرثیہ گو کی حیثیت سے خاصی شہرت حاصل کرچکے تھے ۔ حافظہ بلا کا تھا جو ایک دفعہ پڑھا مدت العمر یاد رہا "
(۱) ۔

(حاشیہ گذشتہ سے پیوستہ)

(اودھ اخبار مورخہ ۱۲ مارچ ۱۸۷۵ء مین مرقوم ہے کہ "پشکہ پندرہ سولہ برس کا سن تھا کہ شوق مافوق سلام اور مرثیہ گوئی کا ہوا اور اصلاح میان دلگیر شاعر بے نظیر سے لی ..... بعد ازان مرثیہ گوئی وغیرہ مین نام عالی پیدا کیا ..... میان دلگیر ایسا شاگرد پاکر خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے سوائے ان کے اور کسی کو دل لگا کر نہ بتاتے تھے رفتہ رفتہ ایسا نام پیدا کیا کہ سرکارون مین پہنچے ۔ میان دلگیر کی شاگردی سے دبیر نے خود انکار کیا ہے ملاحظہ ہو حیات دبیر ص ۲۷ ۔ بہرحال اخبار نویس کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہوگیا اور ۱۷ مارچ ۱۸۷۵ء کا کے شمارہ مین اس غلطی کی تصحیح کردی اور لکھا کہ شرف تلمذ صرف میر ضمیر سے تھا ۔)

(۱) حیات دبیر ص ۶۱ تا ۶۳ ۔

باب دوم

(دبیر کی شہرت و ترقی کے اسباب)

بیگمات اور شاہان اودھ کی ضعیف الاعتقادی ۔ دبیر شاہی عزا خانے میں ۔ استاد سے ناچاقی ۔ دبیر اور غزل گوئی دبیر کا اہتمام کہ اس کا کلام غزل باقی نہ رہے ۔ دبیر کے پڑھنے کا انداز ۔ دبیر کے شاگرد ۔ شاگردوں کے کلام پر اصلاح دینے کا طریق ۔ انداز تصنیف ۔ واجد علی شاہ اور دبیر

اسباب ترقی | یہ غازی الدین حیدر کا عہد تھا جو نواب وزیر کا خاندانی خطاب ترک کرکے کمپنی کی طرف سے بادشاہی کا خطاب حاصل کرچکے تھے دہلی کی بار بار تباہی اور معاشی بدحالی کی وجہ سے ارباب کمال لکھنؤ مین جمع ہو رہے تھے ۔ حکمرانون کا تعلق مذہب امامیہ سے تھا ۔ دکن کی تباہی کے بعد شیعہ عقائد کو یہان آزادانہ فروغ و ترویج کے مواقع حاصل ہوئے ۔ فرنگی محل کے سنی علما کی جگہ خاندان اجتہاد مسند قضاۃ پر جلوہ گر ہوچکا تھا ۔ خود بادشاہ اور ان سے زیادہ بیگم نہایت ضعیف الاعتقاد قسم کے شیعہ تھے (۱) نتیجۃً مرثیہ گوئی کو فروغ حاصل ہوا الناس علی دین ملوکہم کے مصداق سنی صوفی بلکہ ہندو بھی شہدائے کربلا کی یاد مین مجالس منعقد کرنے لگے ۔ ذاکرون اور مرثیہ گویون کی مانگ بڑھی بلکہ انہین مذہبی پیشواون کا رتبہ حاصل ہوگیا ۔ لوگ نہایت عزت و احترام سے ان کی خدمت مین نذرانے پیش کرتے تھے ۔

میر ضمیر کے ہمراہ دبیر بھی مجالس مین جاتے اور اپنا کلام سنانے لگے ۔

دبیر شاہی عزاخانے مین | کلام مین روانی تاثیر اور صنائع بدائع کے اہتمام کی وجہ سے جو اس عہد مین کمال فن سمجھا جاتا تھا ان کی شہرت غازی الدین حیدر شاہ اودھ تک پہنچی اور اس نے انہین اپنے عزاخانہ خاص مین پڑھنے کے لئے چوبدار بھیج کر بلوایا ۔ مرزا نے حاضر ہوکر حمد و نعت و منقبت کے بعد مندرجہ ذیل بند پڑھا جو راستہ مین کہ لیا تھا : ۔ (۲)

واجب ہے حمد و شکر جناب الہ مین فضل خدا سے آیا ہون کِس بارگاہ مین
مجھ سے گدا اور انجمنِ بادشاہ مین چرچا یہ لوگ کرتے ہین اس وقت راہ مین
ذرے پر چشم مہر ہے مہر منیر کو
حضرت نے آج یاد کیا ہے دبیر کو

اور پھر وہ مرثیہ پڑھا جس کا مطلع یہ ہے ؎

داغ غم حسین مین کیا آب و تاب ہے (۳)

---

(۱) گذشتہ لکھنؤ (شرر) (۲) حیات دبیر ص ۳۰ ، خمخانۂ جاوید جلد ۳
(۳) یہ مرثیہ دفتر ماتم کی جلد اول مین درج ہے ۔

جب سکینہ بنت حسین کی زبان سے یزید کے دربار مین بطور فریاد مندرجہ ذیل بند پڑھا تو بادشاہ شدت تاثر کی وجہ سے دھاڑین مار مار کر رونے لگا :۔

جب روز کبریا کی عدالت کا آئے گا — جبّار بادشاہون کو پہلے بلائے گا

انصاف و عدل ان سے بہت پوچھا جائے گا — تو آج داد دینے کی کل داد پائے گا

گل کردیا ہے دونون جہاںؐ کے چراغ کو

لوٹا ہے تیرے عہد مین زہرا کے باغ کو

بادشاہ نے یہ بند مکرر پڑھوا کر سنا اور اتنا اثر ہوا کہ رات بھر نیند نہؔ آئی ۔ بار بار کہتے تھے کہ خدا نے مجھے بھی بادشاہ بنایا ہے جب مجھ سے اپنی رعایا کے معاملات کے متعلق پوچھا جائے گا تو کیا جواب دون گا ۔ غالباً یہی واقعہ دبیر کی شہرت کا موجب ہوا اور وہ مرثیہ گوئی کی فضا پر چھا گئے (۱) چنانچہ فسانہ عجائب مین (جو عہد غازی الدین حیدر مین شروع ہوکر عہد نصیرالدین حیدر مین تمام ہوا) جن مشہور مرثیہ گو شعرا کا ذکر ہے ان مین دبیر کا نام بھی شامل ہے (۲) اس کا دوسرا اثر یہ ہوا کہ اکثر روسائے لکھنؤ اور محلات شاہی ان کے شاگرد ہوگئے (۳) ۔

استاد سے ناچاقی | اس کے بعد ایک ناخوش گوار واقعہ نواب افتخارالدولہ (۴) کے مکان پر پیش آیا جس کی وجہ سے دبیر کے تعلقات اپنے استاد میر ضمیر سے کچھ عرصے کے لئے خراب ہوگئے ۔ یہ واقعہ آب حیات مین اس طرح مذکور ہے :۔

" لکھنؤ کے لڑانے اور چمکانے والے غضب تھے ۔آخر مرزا کا عالم شباب تھا اور کمال بھی عین شباب پر تھا نواب شرف الدولہ (۵) میر ضمیر کے بڑے قدر دان تھے ان سے

---

(۱) حیات دبیر (ثابت لکھنوی) ص ۳۰ و دیباچہ سحر شانی ص ۱٦ ۔

(۲) فسانہ عجائب مطبوعہ نولکشور (سرور) ص ۸ اور واقعات انیس (مہدی حسن احسن) ص ۲٦ ۔

(۳) تاریخ ادب اردو (سکینہ ص ۲۲۹) مفصل تذکرہ دیکھئے دربار حسین (مولفہ ثابت لکھنوی)

(۴) ان کا ذکر پہلے ہوچکا ہے ۔

(۵) حیات دبیر اور دیباچہ سحر شانی مین نواب افتخارالدولہ لکھا ہے جو مصنف کی قربت مکانی کے باعث زیادہ درست معلوم ہوتا ہے ۔

ہزاروں روپے کے سلوک کرتے تھے ابتدا میں ان کے سبب سے اور پھر مرزا کے جواہر کمال کے باعث سے ان کی بھی قدردانی کرتے تھے ۔ان کی مجلس میں اول مرزا ۔بعد ان کے میر ضمیر پڑھا کرتے تھے ۔

ایک موقعہ پر مرزا نے ایک مرثیہ لکھا جس کا مطلع ہے ؎

دست خدا کا توت بازو حسین ہے (۱)

میر ضمیر کے سامنے جب پیش ہوا تو اس کے نئے خیالات اور طرز بیان اور ترتیب مضامین پسند آئی ۔اسے توجہ سے بٹایا اسی اثنا میں نواب کے ہاں مجلس ہونے والی تھی ۔رشید شاگرد سے کہا کہ بھئی اسی مرثیہ کو ہم اس مجلس میں پڑھیں گے یہ تسلیم کرکے تسلیم بجالائے اور مرثیہ انہیں کو دے دیا ۔

گھر میں آئے تو بعض احباب سے حال بیان کیا ۔مسودہ پاس تھا وہ بھی سنایا (۲) ۔کچھ تو یاروں کا چمکانا کچھ اس سبب سے کہ ذوق و شوق کے پھول ہمیشہ شبنم تعریف کے پیاسے ہیں اور نواب کو خبر پہنچ گئی تھی ادھر کے اشاروں میں انعام کی ہوا آئی غرض انجام یہ ہوا کہ استاد مرثیہ صاف کرکے لے گئے کہ وہی پڑھیں گے ۔

بموجب معمول کے اول مرزا صاحب منبر پر گئے اور وہی مرثیہ پڑھا ۔بڑی تعریفیں ہوئیں اور مرثیہ خوب سرسبز ہوا ۔استاد کہ ہمیشہ شاگرد کے پڑھنے پر باغ باغ ہوا کرتے تھے اور تعریفیں کرکے دل بڑھاتے تھے اب خاموش بیٹھے ہیں کچھ غصہ کچھ بے وفائی زمانہ کا کچھ اپنی محنتوں کا افسوس اور فکر یہ کہ اب میں پڑھوں گا تو کیا پڑھوں گا ۔ اور اس سے بڑھ کر کیا پڑھوں گا جس میں استادی کا رتبہ بڑھے نہیں تو اپنے درجہ سے گرے بھی نہیں ۔غرض ان کے بعد یہ پڑھے اور کمال کی دستار صحیح سلامت لے کر منبر

---

(۱) حیات دبیر (ثاقب لکھنوی) میں "ذرہ ہے آفتاب در بوتراب کا" والے مرثیہ کا ذکر ہے ۔دیباچہ سبع مثانی میں یہی مرقوم ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی آزاد کو سہو ہوا ہے اور سنی سنائی پر بھروسہ کیا ہے کیونکہ آگے چل کر جن صفات کا ذکر کیا ہے وہ اسی مرثیہ میں زیادہ ہیں ۔

(۲) حیات دبیر وغیرہ میں مرثیہ نصف نصف کرنے کا ذکر ہے جو اس لحاظ سے قرین قیاس ہے کہ جب مرثیہ استاد کو دے آئے تھے تو اپنے پاس دوبارہ مسودہ کہاں سے آگیا یا یہ ماننا پڑے گا کہ استاد کی اصلاح سے قبل ہی دو نقول کرلی تھیں جو ~~خلاف~~ قیاس ہے ۔ (بھی قرین)

سے امی لیکن اس دن سے دل پھر گیا ۔ یار لوگون نے شاگرد کو نقطۂ مقابل کرکے بجائے خود استاد بنادیا ۔ اور وہی صورت ہوگئی کہ ایک مجلس مین دونون کا اجتماع موقوف ہوگیا زمانہ نے اپنے قاعدے کے بموجب چند روز مقابلون مین شاگرد کا دل بڑھایا ۔آخر بڑھاپے کی سفارش سے استاد کو آرام کی اجازت دی (۱)

حیات دبیر کی روایت کے مطابق وزیر اودھ نواب علی تقی خان مرحوم کی مجلس مین جب مرزا نے

اے عرش بریں تیرے ستارون کے تصدق (۲)

والا مرثیہ پڑھا اور حاضرین نے تعریف کی تو دبیر نے از راہ انکساری اپنے استاد کی طرف اشارہ کرکے (جو اس مجلس مین موجود تھے) کہا کہ سب انہین کے فیض و تلطف کا نتیجہ ہے ۔استاد کے دل سے غصہ رفع ہوگیا اور دوبارہ تعلقات استوار ہوگئے (۳) گو شاگرد کو اب اصلاح و مشورہ کی ضرورت نہ تھی ۔

قطع نظر اس کے کہ اخلاقی لحاظ سے مرزا دبیر حق بجانب تھے یا نہین اس واقعہ کا قدرتی نتیجہ بہرحال یہ نکلا کہ دبیر کی شہرت کو چار چاند لگ گئے ۔

دبیر اور غزل گوئی | آزاد نے لکھا ہے کہ کسی اتفاقی سبب سے کوئی غزل یا شعر کہا ہو (۴) "ورنہ نہین ۔لیکن یہ بات درست نہین ۔دبیر نے نہ صرف ابتدا مین کثرت سے غزلین کہین بلکہ بھاکا مین بھی کچھ ٹھمریان وغیرہ کہین جوان

---

(۱) آب حیات ص ۵۳۸ ۔ ۵۳۹ دیگر کتب (حیات دبیر دیباچہ سبع مثانی وغیرہ) مین یہ لکھا ہے کہ مرثیہ کا جس قدر حصہ استاد کو دیا تھا وہ مرزا نے نہ پڑھا اگر یہ بیان مان لیا جائے تو جھگڑے کی کوئی وجہ نہین رہتی ۔جھگڑا بہرحال ضرور ہوا اور اس کی توجیہ یہ بتائی گئی ہے کہ بشیر تخلص ایک شاگرد نے میر ضمیر کو اکسایا کہ مرثیہ کا جو حصہ آپ کے پاس ہے وہ سست ہے اور دوسرا چست ۔لہذا بہتر ہے کہ دبیر اپنا حصہ بھی نہ پڑھین اور کوئی دوسرا مرثیہ پڑھ لین جو دبیر کے لئے ممکن نہ ہوا کیونکہ وہ کوئی اور مرثیہ اپنے ساتھ لے نہین گئے تھے ۔

(۲) دفتر ماتم کی جلد ہفتم پہلا مطلع ہے ۔ قران ۶ سے فضیلت درومرجان کی عیان ہے

(۳) حیات دبیر ص ۳۷ ۔ ۳۸ و تاریخ ادب اردو (سکسینہ ص ۲۲۹) یہی واقعہ تفصیل سے

(۴) آب حیات ص ۵۳۷ ۔

کے ورثا کے پاس محفوظ ہین (۱) ۔

ان کی غزل گوئی کے متعلق حیات دبیر (ثابت لکھنوی) مین مندرجہ ذیل واقعات درج ہین :-

"غزلین بھی ابتدا مین مرزا صاحب نے کہین اور کثرت سے کہین مگر خود ہی ان کے عدم شہرت کی کوشش کی اور اس کوشش مین وہ کامیاب ہوئے ۔ دنیا کے شاعر متمنی رہتے ہین کہ ارباب نشاط ان کی غزلین گائین مگر مرزا صاحب اس سے بھاگتے رہے ۔ سنا ہے کہ مرزا صاحب کی غزلون کے تین دیوان (۲) تھے ۔ ان مین سے ایک یا دو دیوان میر بادشاہ علی بتا مرحوم اسی زمانہ مین مانگ لئے تھے جب وہ مشق سخن کرتے تھے ۔ باقی ایک یا دو دیوان مرزا صاحب نے تلف کر دیے ۔ وہ دو یا ایک دیوان بھی میر بادشاہ علی صاحب مرحوم کے یہان (مکان لکھنئو شاہ گنج مین) جب آگ لگی تھی اور اسباب کے ساتھ جل گیا آج مجھ کو ایک غزل بھی معتبر ذرائع سے نہین ملی جو مین بایقین کلام دبیر مرحوم کہ کر ناظرین کے سامنے پیش کرون ۔ ان کا دل نہین چاہتا تھا کہ ان کی غزلین گائی جائین چنانچہ نانا مرحوم فرماتے تھے کہ قبل غدر ۱۸۵۷ء ایک شادی مین جناب مرزا صاحب بھی شریک تھے مین بھی تھا ازبس کہ محفل مین ارباب نشاط بھی تھے ۔ صاحب خانہ نے ثقہ آدمیون کے واسطے علیحدہ ایک مکان تجویز کردیا تھا باقی ہمہ شما سب محفل رقص و سرود مین تھے ۔ مرزا صاحب ثقہ آدمیون مین تھے ۔ مجھے دس بجے رات کو بلا بھیجا ۔ مین دوسری محفل مین سے گیا تو دیکھا کہ شعر و شاعری کے نکات بیان ہو رہے ہین ۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر اور مرزا صاحب کو اس بحث مین محو دیکھ کر پھر دوسری محفل مین چلا آیا ۔ جب باتون سے مرزا صاحب کو فراغت ہوئی رات کا ایک بج گیا تھا پھر آدمی میرے بلانے کو بھیجا ۔ مجبور مین پھر محفل رقص و سرود مین سے گیا ۔ فرمایا ہم تو تم کو جنت کی طرف کھینچتے ہین تم بھاگے ہو ۔ مین ان جناب کی خدمت مین بہت گستاخ تھا ۔ عرض کی کیا یہ محفل جنت ہے ۔ فرمایا اس وقت ایسی ایسی باتین ہوئین کہ تم سنتے تو روح خوش ہوجاتی

---

(۱) دیباچہ سبع مثانی ص ۲۳ ۔

(۲) مرزا صاحب جیسے پرگو شاعر کے لئے غزلیات کے تین یا زیادہ دیوان کہ لینا ناممکن نہین ۔

مین نے عرض کیا حضرت (حضرت) انما الاعمال بالنیات — خدا پاک نواز ہے — وہ چاہے تو
وہان بھی بخشش کا وسیلہ پیدا کردے — فرمایا توبہ کرو — استغفراللہ — محفل رقص کی
نسبت ایسا کہتے ہو — الغنا اشد من الزناء — مین نے عرض کی، سنئے تو سہی، مین تو خدا
کی رحمت کا ذکر کرتا ہون وہ چاہے تو اسی جگہ وسیلۂ بخشش پیدا کردے — فرمایا بھلا
مجھے سمجھائیے تو، وہان کیونکر وسیلۂ بخشش ہوسکتا ہے — مین نے عرض کی مثلاً آپ کا کلامِ
منظوم کوئی طوائف گائے اور ہمارا دل کسی شعر پر خدا کی طرف متوجہ ہوجائے، تو فرمائیے —
خدا دل کو دیکھتا ہے ظاہر کو نہین دیکھتا — ممکن ہے گناہ بخش دے — فرمایا یہ تو بنائے
فاسد علی الفاسد، ہوئی — جب گانا حرام ہے، تو جو اشعار گائے جائین گے، چاہے وہ معرفت
ہی مین ہون، باعث مغفرت نہین ہوسکتے — اور یہ کیا آپ نے فرمایا، کیا میری غزل کسی طوائف
نے گائی تھی؟ مین چپ ہوگیا — فرمایا سچ کہو — مین نے کہا، جی ہان — اور اس غزل کا
مطلع سنا کر کہا، یہ غزل حسین باندی، طوائف، نے گائی تھی — مرزا صاحب یہ سن کر خاموش
ہوگئے اور کچھ وظیفہ پڑھ کر نمازِ شب پڑھنے کے لئے کھڑے ہوگئے — خیر رات گئی بات
گئی — دوسرے دن جو مین نو دس بجے پہنچا تو ان کے آدمی نے کہا کہ دیوان خانہ مین
مرزا صاحب ہین — اور حسین باندی طوائف سے کچھ باتین کر رہے ہین — اب آپ کو اختیار
ہے چاہے جائیے، چاہے نہ جائیے — مین الٹے پاؤن پھر آیا — مگر دل مین کہتا تھا کہ یا تو
مرزا صاحب نے میرے قول کی تصدیق کی غرض سے حسین باندی کو بلایا ہوگا یا اس سے سیدھے
سادے طور پر اپنی غزل سنی ہوگی — دوسرے روز جو مین شاہ گنج مین ہوکر نکلا تو حسین باندی
کا لڑکا ملا — اس نے حسین باندی کا یہ پیام دیا کہ آپ اجازت دین، تو مین کسی وقت حاضر ہون
مین نے کہا اچھا، پانچ بجے شام کو آجانا — شام کو جب وہ آئی، تو مجھ سے کہا، میر صاحب!
آپ نے مرزا صاحب سے یہ ذکر کردیا کہ آپ کی غزل حسین باندی نے گائی — مین بولا ہان
باتون باتون مین مین نے کہا تو تھا — پھر کیا ہوا؟ کہا مرزا صاحب نے اول تو مجھ سے
پوچھا، تم کو میری کے غزلین یاد ہین؟ مین نے جواب دیا بس ایک غزل — انھون نے مطلع
پوچھا — مین نے مطلع پڑھ دیا — پوچھا کے شعر یاد ہین؟ مین بولی نو دس شعر —
پوچھا رات کو یہ غزل گائی تھی — مین نے کہا جی ہان — یہ سن کر وہ گھر مین اٹھے ہوئے
چلے گئے اور ایک توڑہ پانسو روپیہ کا ایک رومال مین باندھ کر لائے — مجھ سے فرمایا — یہ
روپیہ تم اپنی ڈولی مین رکھ لو — آج سے اس غزل کو نہ گانا — مین نے بہتیرا کہا مین آئندہ

اس غزل کو نہ گاؤں گی۔ آپ روپیہ رہنے دیجئے ۔ اس کی ضرورت نہین ۔ فرمایا نہین اب مین روپیہ نکال چکا تم اس کو کسی کار خیر عزاداری وغیرہ مین صرف کردینا ۔ جب قسم دے کر مجھے مجبور کردیا تو مین وہ روپیہ ڈولی مین رکھ کرلے آئی " (۱)

مرزا صاحب کے اساتذہ مین جیساکہ پہلے ذکر ہوچکا ہے مرزا کاظم علی خان سلطا بھی تھے ۔ قدرتی طور پر دبیر اپنے استاد کے والد مرزا محمد رضا برق کا بہت لحاظ کرتے تھے برق صاحب نے جب ایک دھوم دھام کا مشاعرہ کیا اور دبیر کو بھی اس مین پڑھنے کے لئے مجبور کیا تو مرزا صاحب نے اپنی مشہور غزل جس کا مطلع یہ ہے ؎

دفن کرنا مجھ کو کوئے یار مین قبر بلبل کی بنے گلزار مین (۲)

راقم الحروف نے بھی اس معاملہ مین بہت تجسس کیا کہ مرزا دبیر کے غزلیات کے کچھ اشعار مل جائین تو مقالہ مین شامل کردیے جائین، مگر صرف دو مطلعے اور ایک غزل مل سکی جن مین سے ایک مطلع اوپر درج ہوچکا ہے دوسرا یہ ہے :۔

مے سے توبہ کی ستم گر نے مقدر دیکھو
جبکہ تیار مری خاک سے پیمانہ ہوا (۳)

تذکرہ نادر مؤلفہ کلب حسین نادر شاگرد ناسخ مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب ص ٦٦ پر دبیر کی مندرجہ ذیل غزل درج ہے اس غزل کے بارے مین مؤلف تذکرہ نے لکھا ہے "یہ وہ غزل ہے جو مرزا صاحب نے مشاعرہ فتح الدولہ بعہد مرزا غازی الدین حیدر شاہ اودھ کے پڑھی تھی "گویا ابتدائی مشق کا کلام ہے :۔

اگر وہ غیرت شمشاد جائے سیر گلشن کو
گلوے سرو مین پہنا دے قمری طوق گردن کو
گلون کی بے ثباتی پر جوان کا دھیان جاتا ہے
تو کیا روتی ہے شبنم منہ پہ رکھ کر گل کے دامن کو

---

(۱) حیات دبیر جلد اول (عابد لکھنوی) ص ۸۷ ۔ ۸۸ ۔

(۲) دیباچہ سبع مثانی ص ۲۳ ۔

(۳) یہ مطلع جناب سالک مسلک دبیر سید سرفراز حسین صاحب خبیر کی عنایت سے ملا ۔ موصوف لکھنو محلہ نخاس مین رہتے ہین اور مرزا اوج خلف مرزا دبیر کے لائق تلامذہ سے ہین ۔ خود بھی مرثیہ بہت عمدہ کہتے ہین ۔ استفسار پر انھون نے علاوہ دیگر قیمتی مشورون کے دونون مطلعے بھی ارسال فرمائے ۔ سبع مثانی کی مرتب بھی وہی ہین ۔

دلا ان تنگ چشمون سے نہ چشم مہر تو رکھیو
کسی کے حال پہ روئے نہ دیکھا چشم سوزن کو
سوادنامۂ اعمال کیا یہ اشک دھوئین گے
نہ شبنم نے کیا تبدیل رنگ برگ سوسن کو
دبیر آئے گا کب وہ بھول کر گور غریبان مین
جو اکثر روندتا ہے ناز سے پھولون کے خرمن کو ٭

افسوس ہے کہ مرزا صاحب نے اپنے کلام غزل کو تلف کرکے اردو غزل کو ایک معتدبہ اضافہ و سرمایہ سے محروم کردیا ۔ اگرچہ ان غزلیات کی حیثیت تبرک سے زیادہ نہیں - ممکن ہے کہ عمدہ کلام بھی کہا ہو ۔

دبیر کے پڑھنے کا انداز

دبیر کی آواز بھاری اور پاٹ دار تھی ۔ فطری طور پر اگر ہاتھ کہین خود بخود اٹھ جائے تو بہتر ورنہ "بتانے" ٭ کو معیوب خیال کرتے تھے آنکھ اور ابرو وغیرہ کے اشارات سے بھی حتی الوسع پرہیز کرتے تھے ۔ وہ بتانے کو "ارتھ" کے متبادل سمجھ کر اسے موسیقی مین داخل جانتے تھے (۱) اس سلسلہ مین ان کا نقطۂ نظر مندرجہ ذیل رباعی مین واضح ہوتا ہے :-

ناحق کا نہ چھٹنا نہ چلاتا ہے ۔ بیکار نہ ہر بند پہ بتلاتا ہے
ابن شہِ مردان کا ثنا خوان ہون مین ۔ صد شکر کہ پڑھنا مرا مردانہ ہے (۲)

مرزا صاحب کے پڑھنے مین عجب وقار تھا ۔ بین تو وہ اس طرز سے پڑھتے تھے کہ مجلس مین روتے روتے اکثر آدمی بے ہوش ہوجاتے تھے (۳) ظاہر ہے کہ بین کے موقعے پر زیادہ بتانے سے تاثیر کم ہوجاتی ہے اور پڑھنے والا تماشا بن کر رہ جاتا ہے ۔

آواز کو اونچا نیچا کرنے سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے، مرزا جیسا صاحبِ کمال مرثیہ گو اس سے بے خبر نہین ہوسکتا تھا ۔ حیاتِ دبیر مین لکھا ہے کہ ایک موقعہ پر جب انھون نے "کھچتی ہے ذوالفقار جناب امیر کی" کڑک کر کہا تو ایک انیسئے حضرت جو داد دینا خلافِ وضعداری سمجھتے تھے، تڑپ اٹھے ۔ اسی طرح ایک دوسرے موقعے پر لکھا ہے کہ مرزا نے

٭ بتانا اردو کی اصطلاح میں مرثیہ گوئی کے وقت ہاتھوں سے اشارے کرنا ۔ اور اس طرح اپنے کلام میں زور پیدا کرنا کہلاتا ہے

(۱) حیات دبیر ص ۵۶
(۲) دفتر ماتم جلد ۲۰
(۳) دیباچہ سبع مثانی ص ۲۶ ۔

٭ لالہ سری رام نے یہ شعر مزید نقل کئے ہیں بہ ترتیب شعر ۲ کے بعد :-

رواں کرتا تھا خنجر گاہ گاہے روک لیتا تھا ۔ عجب ناز و ادا سے اس نے کاٹا میری گردن کو
میں کشتہ ہوں کسی گل کے مسی آلودہ دنداں کا ۔ چڑھانا باغباں تربت پہ میری برگ سوسن کو

ایک مجلس مین اپنا یہ مصرع تین مختلف لہجون مین پڑھا اور ہر دفعہ مختلف معانی پیدا کئے ۔ حضرت زینب اپنے بچون پر شمر سے بات کرنے کی وجہ سے خفا ہو رہی ہین

١ ۔ کیون ! تم نے میرے بھائی کے قاتل سے بات کی (گھرکی کے لہجہ مین)

٢ ۔ کیون ؟ تم نے میرے بھائی کے قاتل سے بات کی ؟ (استفہام)

٣ ۔ کیون ! تم نے میرے بھائی کے قاتل سے بات کی ! ! (تعجب اور تاسف)

مرزا صاحب کا یہ انداز بین مین جو مرثیہ کی اصل غرض ہے، بہت کامیاب ہوتا تھا (١) ۔

دبیر کے شاگرد مرزا صاحب کا حلقۂ تلامذہ بہت وسیع تھا کہ دبیر کے بزرگ شاہزادگان دہلی کے استاد تھے ۔ شاید اسی وجہ سے یا مرزا صاحب کے ذاتی کمالات کے باعث اکثر شاہزادگان اودھ کو ان سے شرف تلمذ حاصل تھا ۔ ان مین نواب اقتدار الدولہ، مستقیم الملک، جو نواب سعادت علی خان کے فرزند اور مرزا غازی الدین حیدر شاہ اودھ کے بھائی تھے خاص طور پر قابل ذکر ہین (٢) دوسرے نواب ممتاز الدولہ (٣) تیسرے نواب والا قدر عرف وزیر (یہ بھاکا مین ٹھمریان خوب کہتے تھے اور ان پر بھی مرزا سے اصلاح لیتے تھے) (٤) چوتھی ملکہ زمانی، زوجہ محترمہ نواب نصیر الدین حیدر پانچوین ان کی صاحبزادی سلطان عالیہ سلطان (زوجہ نواب ممتاز الدولہ) چھٹی حاجی بیگم صاحبہ دختر محمد علی شاہ (سوئم شاہ اودھ)۔ ان سب افراد خاندان شاہی کو مرزا سے شرف تلمذ حاصل تھا ۔

مرزا صاحب کے شاگردون مین سے جن لوگون نے آگے چل کر شعر و ادب کی سرزمین مین اپنا مقام پیدا کیا ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہین :-

---

(١) حیات دبیر ص ٥٥ ۔ ٦٠

(٢) ان کا مفصل تذکرہ دربار حسین ص ١١٥ مطبوعہ مطبع اثنا عشری دہلی ١٣٣٨ ھ پر ملاحظہ ہو ۔ جو نواب مرتضیٰ حسین خان صاحب شرطی حسین آباد کے حوالے سے درج ہے یہ عمر مین دبیر سے بھی بڑے تھے ان کی تاریخ پیدائش ١٢١٣ ھ ہے ۔ مجمع کمالات تھے یعنی و انتظار تخلص تھا ۔

(٣) ان کا ذکر پہلے آچکا ہے ۔

(٤) لکھنئو مین ایک سوک والا قدر روڈ ابھی تک ان کے نام پر مشہور ہے ۔ دربار حسین ص ١٠٧ (فایت)

مولوی فقیر حسین صاحب عظیم، مولانا سید علی محمد شاد عظیم آبادی، میر فرزند علی احمد صغیر بلگرامی، صاحب جلوۂ خضر، منشی سید اولاد حسین صاحب مداح پھپھوندوی، مولوی ظفر مہدی صاحب اثیم، جرولی، مولوی غلام عباس صاحب ھنر اور میر زکی بلگرامی (۱) اور منیر شکوہ آبادی (۲) ۔

شاگردون کے کلام پر اصلاح دینے کا طریقہ

شاگردون کے کلام پر اصلاح دینے کا عام طریقہ یہ تھا کہ شاگرد اپنا کلام سناتے جاتے ۔ مرزا صاحب اگر کسی مقام پر اصلاح دینا موزون سمجھتے تو مرثیہ اپنے ھاتھ مین لے کر بنا دیتے تھے ۔ اور شاگرد کو اصلاح کی غرض و غائت اور وجوہ سمجھا دیتے ۔ اگر شاگرد موقعہ پر موجود نہ ھوتا تو اس کا کلام خود دیکھ لیتے اور وجوھات اصلاح مجمل یا مفصل حاشیہ پر لکھ دیتے (۳) اور ایسے لفظ رکھ دیتے، گویا سادہ کار نے انگوٹھی پر نگینہ جڑ دیا ہو (۴) ۔

مولف حیات دبیر نے مندرجہ ذیل واقعہ، میر واجد حسین کی زبانی نقل کیا ہے جس سے دبیر کی اصلاحات کی خوبی اور دقت نظر کا پتہ چلتا ہے :۔

" ایک مرثیہ کسی شاگرد کا کہا ہوا مجھے مرزا صاحب نے دیا ۔ کہ اس کو صاف کر دو ۔ حضرت عباس کے حال کا مرثیہ تھا اس موقعہ پر جب حضرت عباس کے حال کا خیمے سے باھر برآمد ہوتے ہین ۔ مرزا صاحب نے اصلاحاً یہ ٹیپ لکھی تھی :

آپ آتے ہین عورت نہ کوئی سامنے آئے
اقبال سے کہ دو کہ عنان تھامنے آئے (۵)

---

(۱) دربار حسین مذکور ص ۹۳۵ ۔ مرزا صاحب کے شاگردون کا مفصل تذکرہ ہے ۔
(تذکرہ یادگار ضیغم ص ۲۹ پر ان کے استاد کا نام مرزا ببر علی لکھا ہے جو مہمل خمخانہ جاوید ج ۳ ص ۶۲۲ پر آپ کو دبیر کا شاگرد ظاہر کیا گیا ہے)۔
(۲) تفصیل کے لئے دیکھئے میرا مضمون منیر شکوہ آبادی مطبوعہ صحیفہ شمارہ ۷ ۔
(۳) جلوۂ خضر (میر فرزند احمد صغیر بلگرامی) جلد دوم (صغیر بلگرامی غزل مین غالب اور سحر لکھنوی اور مرثیہ مین دبیر کے شاگرد تھے حیات دبیر ص ۵۳) ۔
(۴) یہ مرثیہ نظیر برادر دبیر کا ہے اور دبیر کا اصلاح کردہ ہے ۔ نولکشور کے مطبوعہ مراثی دبیر جلد اول مین یہ مرثیہ دبیر کے کلام مین چھپ گیا ہے جو درست نہین ۔

مجھے جو شرارت سوجھی تو مین نے دوسرا مصرعہ یون لکھ دیا " ھان فتح سے
کہ دو کہ ھان تھامنے آئے " مین گردن جھکائے ہوئے لکھ رھا تھا کہ مرزا صاحب آھستہ
آھستہ آکر پیچھے کھڑے ہوگئے ۔مجھے خبر نہ ہوئی ۔اس ٹیپ کو پڑھ کر ھنسے اور
فرمایا " واہ میر واجد حسین صاحب ! آپ نے تو مجھے بھی اصلاح دے دی "۔ اب مین
نے گردن اٹھائی ۔دیکھا کہ مرزا صاحب کھڑے ہوئے ھین ۔مین چُپ ۔فرمایا " کیا اقبال
سے آپ فتح کو اس موقعہ پر ترجیح دیتے ھین "؟ مین نے عرض کی جی نہین ۔اس وقت
میرے خیال مین یونہی آگیا ۔مین اب اس کو شائے دیتا ہون ۔کپڑا پانی مین ڈوبا ہوا سامنے
رکھا تھا ۔مین نے اٹھایا ۔فرمایا " ذرا ٹھیرو، سمجھ تو لو ۔لفظ فتح مین کیا برائی اور
اقبال مین کیا خوبی ھے " ۔ مین نے کہا فرمائیے ۔فرمایا ۔اقبال اردو مین مذکر اور فتح
مونث ھے ۔پس جب شاعر اچھے شگون کے خیال سے یہ کہتا ھے کہ عورت نہ کوئی سامنے
آئے تو' فتح' کا' جو مونث ھے سامنے آنا کب مناسب ہوگا ۔ اس کے سوا اقبال کے لفظی معنی
پر بھی غور کرو ۔اقبال کے خود معنی آگے آنے کے ھین ۔لفظ فتح مین یہ بات کہان ؟" مین
نے عرض کی "درست ھے " ۔فرمایا " اکثر بزرگوار (ذاکر) ازبسکہ میرے مرثیون مین الفاظ
کی خوبی اور اثر کو نہین سمجھتے ۔اپنی سمجھ کے موافق الفاظ کو بدل دیتے ھین ۔
دیکھنے والا سمجھتا ھے مصنف نے یونہی کہا ہوگا ۔وہ اعتراض کرتا ھے ۔اس کو کیا خبر
کہ اصلاح دینے والے بے انتہا ھین " (۱)

نواب والا قدر شہزادہ اودھ، جو بھاشا مین شعر کہتے تھے ۔وہ بھی اپنا کلام
مرزا کو دکھاتے تھے ۔ایک کمال ان مین یہ تھا کہ شاگرد کی طبیعت جس رنگ کی ہوتی
اسی طرز کی اس کو اصلاح دیتے تھے ۔چنانچہ اپنے بڑے بھائی نظیر کے کلام پر اصلاح
دینے مین ویسے الفاظ بنا دیتے تھے جو انیس کے ساتھ مخصوص تھے اور خود مرزا صاحب
انہین اپنے کلام مین استعمال نہین کرتے تھے جیسے " شہُ بے پر، کڑیل جوان وغیرہ "۔

شیخ گوھر علی مشہر، جو اپنے عہد کے مشہور ھرسیہ* گو تھے ان کے کلام مرثیہ مین،
ویسے بازاری محاورے اور الفاظ رکھ دیتے تھے جو اس صنف سخن کے لئے بھی مناسب ھین
مرزا صاحب کا اپنا اس رنگ کا کلام نہین ملتا لیکن وہ بھی مشہر ھی کو بخش دیا ہو ۔

---

(۱) حیات دبیر (ثابت لکھنوی) ۔

* ھرسیہ، اس نظم کو کہتے ہیں جس میں اصحاب ثلاثہ پر سب و شتم کیا گیا ہو۔

نواب شہید سید اسد علی صاحب حسن کے نوحون مین ایسے موزون الفاظ لا تے جن سے نوحون کی تاثیر اور خزینہ انداز بڑھ جاتا (۱) ۔

تصنیف کا انداز

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرزا مرثیہ گوئی کو جزو عبادت سمجھتے تھے ۔ اکثر باوضو جا نماز پر بیٹھ کر فکر شعر کرتے تھے ۔ بالعموم نماز عشا کے بعد اور کبھی کبھی صبح کی نماز کے بعد یا دوپہر کے کھانے کے بعد اس شغل مین مشغول ہوتے ۔ دوران فکر مین بعض اوقات خود جھومنے لگتے ۔

زود گوئی کی مثال مین مولف حیات دبیر نے میر باقر حسین پھپرسری کی زبانی مندرجہ ذیل واقعہ نقل کیا ہے :

" مین مرزا صاحب کی خدمت مین (ایک مرثیہ کی نقل لینے کے لئے) پہنچا ۔ دوپہر یعنی دن کے بارہ بج چکے تھے ۔ مرزا صاحب خاصہ نوش فرماکر پلنگ پر استراحت فرماتھے ۔ دو کاتب پلنگ کے ادھر ادھر بیٹھے ہوئے تھے ۔ مین نے بعد اداب کے میر وزیر حسین صاحب کا پیغام عرض کیا ۔ فرمایا بیٹھ جاو ۔ مرثیہ لے جانا ۔ مین بیٹھ گیا ۔ مرزا صاحب کاتبون کی طرف متوجہ ہوئے اور دونون کاتبون کو نو تصنیف دو مرثیے لکھوانے لگے ۔ کبھی اس کاتب کو دو تین مصرعے بتا دیتے تھے، کبھی اُس کاتب کو ۔ بعض مصرعہ یا بیت پر ان کو ایسا جوش آجاتا تھا کہ بیٹھ جاتے تھے ۔ چار بجے تک یہی سمان رہا ۔ چار بجے نماز (ظہرین) کے واسطے اٹھے ۔ تو معلوم ہوا کہ ہر کاتب نے ساٹھ ساٹھ بند دو مرثیون کے لکھے ہین ۔ ایک مرثیہ حال حضرت علی اکبر مین اور دوسرا امام حسین کے حال مین تھا " (۲)

---

(۱) ماخوذ از حیات دبیر دیباچہ سبع شانی و دربار حسین (ثاقب لکھنوی)

دیباچہ سبع شانی مین ایک واقعہ مذکور ہے کہ جب منشی سید اسمعیل منیر کالے پانی سے رہا ہوکر آئے تو مرزا صاحب کو اپنی غزلین سنانے لگے ۔ ایک غزل کا مطلع یہ تھا ؂

چھرّا چلا فلک پہ بت خانہ جنگ کا چھوٹا سنکے نیل گاو پہ کتا تفنگ کا

بچے جو نزدیک ہی کھیل رہے تھے مطلع کے دوسرے مصرعے کو زور زور سے دہرانے اور دوڑنے لگے ۔ مرزا نے منیر سے کہا کہ آپ لوگ اس مبتذل رنگ کو کیون ترک نہین کرتے ۔ دیکھئے بچے تک ہنستے ہین ۔ بہتر ہے اس مطلع کو حذف کردیجئے ۔ انھون نے تعمیل کی اس (۲۳ ۔

۲ ۔ حیاتِ دبیر ص ۲۵ جلد ۱

ایک اور مثال کتاب مذکور سے نقل کی جاتی ہے :-

"مرزا صاحب، میر محمد رضا بلگرامی سے باتین کر رہے تھے کہ یکایک ایک صاحب آئے اور بعد معمولی آداب و تسلیمات کے انھون نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی، کہ مجھے اسوقت بارہ تیرہ بند اس حال مین کہ دیجئے کہ علی اصغر کی والدہ ان کی شہادت کے بعد ان کی قبر پر جاتی ہین - مین آج ہی ان پر سوز رکھ کر، کل کسی رئیس کے ہان پڑھون گا - اس نے مجھے اس حال کا مرثیہ پڑھنے کی فرمائش کی ہے - مرزا صاحب نے عذر کیا - کیونکہ وہ اس وقت داروغہ میر واجد علی کے ہان مرثیہ پڑھنے جا رہے تھے - اس نے دوبارہ عرض کی کہ حضور میرے رزق کا معاملہ ہے اگر ایسا مرثیہ نہ پڑھون گا تو شاید مجھے نقصان پہنچ جائے - فرمایا - تو اچھا لکھتے جائیے - کھڑے کھڑے چودہ یا پندرہ بند کہدیے وہ سوزخوان لکھتے گئے اور ان کے ساتھ ساتھ مین (میر محمد رضا بلگرامی) بھی لکھتا گیا - مرزا صاحب نے اپنے پاس اس کی کوئی نقل نہین رکھی - چنانچہ وہ بند نہ تو دفتر ماتم مین چھپے ہین اور نہ ہی مرزا اوج (فرزند و جانشین مرزا دبیر) کے پاس ہین (۱)

دبیر واجد علی شاہ کے دربار مین | مرزا دبیر ان چند خوش قسمت شعراء مین سے ہین جنہین اپنی زندگی ہی مین شہرت و عزت نصیب ہوئی - زمانے کی قدر دانی کہین یا مداحی اہل بیت کا اثر کہ مرزا اپنی زندگی ہی اپنی محنت کا ثمر حاصل کرچکے تھے - ان کی آمدنی لاکھون روپیہ سالانہ تھی (۲) - قدردانی کا یہ عالم تھا کہ بادشاہ وقت سلطان واجد علی شاہ مرحوم خدمت کو اپنی سعادت سمجھتے تھے - چنانچہ مذکور ہے :

"روزے در مجلس بالائے منبر بحضور اعلیٰ حضرت بخواندن مرثیہ اتفاق افتاد - ناگاہ شامیانہ کہ بازئے منبر همچو ابر رحمت سایہ گستر بود، از ہوا پراگندہ گشتہ، یکسو شد و عکس آفتاب بر روئے آنجناب (۳) افتاد - فی الفور ظل اللہ چتر خود گرفتہ قریب منبر استادہ تا اختتام مرثیہ سایہ افگن ماند " (۴) -

---

(۱) حیات دبیر ص ۵۲ - ۵۳

(۲) اخبار اودھ شمارہ ۱۷/۱۲ مارچ ۱۸۷۵ع و حیات دبیر ص ۶۵

(۳) مرزا دبیر

(۴) شمس الضحیٰ (مولوی صفدر حسین) ص ۱۶۶ -

باب سوم

(دبیر کی شخصیت)

عام لوگون سے تعلقات

فیاضی

وضعداری

ایفائے عہد

فنون جنگ مین مہارت

زہد

مدّاحین

باب سوم
(دبیر کی شخصیت)

عام لوگوں سے تعلقات و سلوک مرزا صاحب وقت کے بہت پابند تھے ۔ نو بجے شام تک نماز اور وظائف سے فارغ ہوجاتے اور بارہ بجے تک احباب اور شاگردوں کا ہجوم رہتا ۔ بڑے بڑے نواب، حکام، امرا اور شہزادگان، در دولت پر حاضر ہوتے تھے ۔ اکثر علمی مباحثے اور گفتگو جاری رہتی مگر گفتگو اس میں بھی احتیاط یہ تھی کہ کسی کی غیبت کا پہلو پیدا نہ ہو ۔ اگر کوئی شخص ایسی حرکت کرتا تو اسے فوراً روک دیتے ۔ ہاں اگر معاملہ خالص علمی اور فنی ہوتا مثلاً کسی کے شعر پر خالص فنی لحاظ سے کوئی اعتراض کیا جاتا، تو اسے ایک علمی فریضہ سمجھ کر خود جواب دیتے یا کسی شاگرد کو اشارہ کردیتے اور خود سنتے رہتے ۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ ان کی مجلس میں کوئی میر انیس کی تنقیص کرے (۱) ۔ بلکہ مرزا دبیر کو میر انیس کی ذات سے ایک خاص عقیدت والفت تھی اور ہمیشہ ان کا حد درجہ ادب و احترام فرمایا کرتے تھے اور اپنے شاگردوں کو ناگوار مباحثوں سے محترز رہنے کی فہمائش کیا کرتے تھے (۲) ۔

جو چاہیں بزرگوار ارشاد کریں   ہم کاہے کو گھر حیا کا برباد کریں
اس واسطے بھولا ہوں بدی سب کی دبیر   مر جاؤں تو نیکی سے مجھے یاد کریں (۳)

سر رضا علی، راقم ہیں کہ دبیر بڑے سادہ مزاج اور مرنجان مرنج آدمی تھے ۔ ساری عمر کبھی کسی سے اکڑ کر بات نہیں کی ۔ مرحمت کا یہ عالم تھا کہ لوگوں کا چاروں طرف ہجوم رہتا تھا ۔ کسی کی درخواست تھی کہ مجھے مرثیہ لکھ دیجئے کوئی سلام لکھانے کی خاطر مرزا صاحب کا مجرئی بنا تھا ۔ کوئی رباعی لکھا کر اپنے حواسِ خمسہ درست

---

(۱) میر انیس کا بھی یہی حال تھا ۔ ان کی مجلس میں مرزا دبیر پر حرف زنی کی اجازت نہ ہوتی (حاشیہ حیات دبیر ص ٦٢) ۔

(۲) خم خانۂ جاوید (لالہ سری رام) ص ٢٩٧ جلد اول

(۳) دفتر ماتم جلد ۲۰

کرنا چاھتا تھا۔ کوئی آنکھون مین آنسو بھرے نوحہ کے لئے فریاد کرتا تھا ۔ مرزا صاحب حتی المقدور لوگون کی فرمائشین پوری کرتے تھے اور خود تکلیفین اٹھاکر دوسرون کے کام آتے تھے ۔ مرجعٔ خلائق بننے سے دبیر کا نام اس زمانہ مین بحیثیت مخیر اور حاجت روا انسان کے روشن ہوگیا ۔ (۱)

فیاضی اکثر شہزادے اور شہزادیان جیساکہ اوپر ذکر ہوچکا ھے مرزا صاحب کے شاگرد تھے ۔ ان کی وجہ سے لاکھون روپیہ سالانہ پاتے تھے اور سب اہلِ حاجت کو دے دیتے اور اپنے لئے صرف ضروری اخراجات کے لئے رکھ لیتے تھے (۲) ۔ بندگانِ خدا کی حاجت برآری مین کبھی دریغ نہ کرتے تھے ۔ کسی شاھزادی یا شاھزادے کے نام سفارشی خط دے دیتے یا ضروری سمجھتے تو خود چلے جاتے ۔

ایک مفلوک الحال، سید میر امجد حسین، شاگردِ انیس نے ایک دفعہ خواھش کی کہ انہین ملکہ زمانی (۳) کے ھان مرثیہ پڑھنے کا موقعہ دلوادین ۔ چنانچہ اپنے پاس سے انہین قیمتی شالی کپڑے پہنواکر اور علیحدہ ڈولی مین سوار کروا کر، ملکہ کے حضور مین لے گئے اور مناسب سفارش اور تعریف کے بعد پڑھوایا ۔ جہان سے انہین دوشالہ، شاھی رومال اور شاید پانچ سو روپے ملے ۔ گھر آکر وہ مرزا صاحب کے کپڑے اتارنے لگے تو انھون نے کہا کہ آپ نے شہزادی کا ھدیہ تو قبول فرمایا ھے، اب یہ فقیر کا ھدیہ کیون رد فرماتے ھین ۔ ان شال کپڑون کے ساتھ دو سو روپے اپنے پاس سے دئیے (۴) ۔

مولف حیاتِ دبیر نے اپنے نانا کی زبان سے ایک اور واقعہ نقل کیا ھے جس سے مرزا صاحب کی سخاوت کا پتہ چلتا ھے ÷

" نا نا مرحوم ناقل تھے کہ بعد غدر ۱۸۵۷ء میر محمد جعفر نام ایک میرے ملنے والے مجھ سے ایک روز بولے کہ بھائی ایک جِن ھمارے والد ماجد کے پاس چاندرات کے چاندرات آیا کرتا تھا ۔ اور ان کو پانچ روپے دیا دے جاتا تھا ۔ کل والد ماجد کا انتقال ہوگیا اب وہ آمدنی بھی غالبا گئی ۔ مین نے کہا کہ وہ جن شاید ان کے مرنے پر مطلع

(۱) اعمالنامہ (سر رضاعلی) ص ٦٠

(۲) حیات دبیر ص ٦٦

(۳) شاگرد دبیر ۔

(۴) حیات دبیر مذکور

نہ ہوا ہو۔آج چاندرات ہے ۔شاید آجائیے ۔کس وقت آتا ہے'وہ بولے ۔دوپہر رات گئے کے قریب قریب ۔ مین نے کہا آج تم ضرور جاگنا ۔وہ بولے بحثی مین اکیلا ڈرون گا ۔ تم میرے پاس آج رات یہین رہ جانا ۔مین رات کو ان کے پاس رہا ۔آدھی رات گئی ایک شخص نے زنجیر ہلائی ۔انھون نے چپکے سے مجھ سے کہا کہ تم دروازہ پر جاؤ ۔ مین پہنچا دروازہ کھلنے پر ایک ہاتھ اس نے بڑھایا ۔ مین نے اس ہاتھ کو پکڑ لیا ۔ روپیہ چھن سے زمین پر گرے ۔گھبراہٹ مین' مین نے ہاتھ پکڑ کر جو اس کو اس خیال سے گھسیٹا کہ یہ مجھی اڑا نہ جائیے تو وہ شخص گر پڑا ۔اب جو مین دیکھتا ہون تو مرزا دبیر مرحوم ہین ۔ فرمایا ہائین' میر محمد رضا'یہ کیا حرکت تھی ؟ مین نے ان سید کے مرنے کا حال کہا اور محمد جعفر نے اور مین نے عفو تقصیر چاہی ۔مرزا صاحب نے مجھے اور محمد جعفر کو قسم دی کہ جب تک مین زندہ رہون'اس واقعہ کو تم کسی سے ذکر نہ کرنا جب دوسرے دن تخلیہ مین مین نے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا کہ میر صاحب بڑے غیور فاقہ کش تھے ۔ اگر مین ان کو بظاہر دیتا تو نہ لیتے ۔اس لئے پوشیدہ طور پر دیا کرتا تھا ۔یہ واقعہ ظہیر مرحوم' مرزا مرزا صاحب کے مرنے کے بعد اکثر بیان فرمایا کرتے تھے (۱)

مرزا صاحب کی وقعت و عزت اہل کمال کے دلون مین اس قدر تھی کہ بڑے بڑے مجتہد' محدث' رئیس اور حکام ان کو اپنا بزرگ' قابل احترام سمجھتے تھے ۔چنانچہ ایک دفعہ سیدہ جلیلہ امام باندی بیگم کے دولتکدہ (پٹنہ) پر سید امداد امام اثر کے والد مرزا سے ملنے آئے ۔ سردی کا موسم تھا مگر موصوف (سید امداد امام کے والد) ٹھنڈا لباس (ایک چھ سوتی زیب کا کرتہ اور اس پر تن زیب کا انگرکھا) پہنے ہوئے تھے ۔مرزا صاحب پر ان کی خاندانی اور مالی وجاہت ظاہر نہ کی ۔وہ یہی سمجھتے رہے کہ شاید کوئی مفلوک الحال ہین'جو گرم کپڑون کی توفیق نہین رکھتے ۔صرف اسی قدر کھلا کہ سید ہین ۔ چنانچہ انہین الگ بلوا کر ایک لکھنو کی فرد روئی دار اور پانچ روپیہ اس پر رکھ کر کہا کہ مین مثل' سادات کا غلام ہون' یہ غلام کا ہدیہ قبول فرمائیے ۔انھون نے رضائی یہ کہ کر لے لی کہ حضور کا تبرک' مین عمر بھر رکھون گا اور مرنے سے پہلے اپنی اولاد سے وصیت کردون گا کہ میرے کفن مین رکھ دین ۔شاید غفور الرحیم اسی بہانے بخش دین ۔پانچ روپے یہ

---

(۱) حیات دبیر ص ٦٦ ۔ ٦٧

کہ کر واپس کردیے کہ اس کی مجھے ضرورت نہین اگر حاجت ہوتی توضرور رکھ لیتا ۔ واپس اگر منشی فرزند احمد صفیر سے تخلیہ مین یہ واقعہ دہرایا ۔ صفیر نے دوسرے وقت مرزا صاحب سے عرض کی کہ کل جس کو پانچ روپے اور رضائی مرحمت ہوئی وہ تو خاندانی امیرکبیر مین ۔ مرزا صاحب نے جواب دیا کہ بھئی مجھ سے غلطی ہوئی ۔ مین سمجھا کہ ان کے پاس سردی کا کوئی دگلہ نہین ہے (۱) ۔

وہ مرثیہ جس کا مطلع " کِس شہر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے " ہے مرزا صاحب کو بہت پسند تھا بالخصوص اس کا بین بہت عمدہ سمجھتے تھے ۔ اکثر ان کے شاگردون اور دوستون نے مانگا مگر کسی کو دینا پسند نہ کیا ۔ نواب محسن الدولہ (۲) مرحوم بھی اس مرثیہ کے بہت شائق تھے ۔ انھون نے یہ اعلان کر رکھا تھا کہ اگر کوئی یہ اصلی مرثیہ مجھے لا دے، تو مین اسے پانچ سو روپے بطور انعام دون گا ۔ مرزا صاحب کو بھی اس کی اطلاع ہوگئی ۔ وہ اپنے کلام کو بڑی احتیاط سے رکھتے تھے ۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد ایک سید صاحب آئے اور اپنی لڑکی کی شادی اور کربلا کے سفر کے لئے مبلغ پانچ صد روپیہ امداد دلوانے کے لئے کہا ۔ یہ زمانہ بڑی کساد بازاری اور تباہ حالی کا تھا مگر نواب محسن الدولہ کی مالی حالت اس وقت بھی تسلی بخش تھی ۔ مرزا صاحب نے وہ مرثیہ سید صاحب کو دے کر کہا کہ وہ نواب مذکور کے پاس جائین اور ان کے اشتہار کے مطابق انعام وصول کرلین ۔ چنانچہ انھون نے ایسا ہی کیا اور نواب صاحب نے خط پہچان کر مطلوبہ روپیہ ان کے حوالہ کردیا اور مرثیہ بھی واپس دے دیا ۔ (۳)

وضعداری مولفِ حیاتِ دبیر نے لکھا ہے کہ جو وضع مرزا صاحب نے ایک دفعہ اختیار کی آخر تک نباہ دی ۔ کبھی شہر مین پیدل نہین پھرے ۔ ہمیشہ پینس پر سوار ہوکر جاتے طبیعت مین متانت بہت زیادہ تھی ۔ علم و فضل مین یکتا ہونے کی وجہ سے لوگ انہین قبلہ و کعبہ اور محترم سمجھتے تھے ۔ حق گوئی اور بے باکی کو اپنا شعار سمجھتے تھے ۔

---

(۱) دیباچہ سحر شائی ص ۲۹

(۲) غازی الدین حیدر کے نواسے اور محمد علی شاہ کے داماد تھے ۔

(۳) حیات دبیر ص ۷۱ ۔

کبھی کسی غریب کے مقابلہ پر کسی امیر کی ناجائز طرفداری نہین کی ۔ نہ کبھی کسی بادشاہ یا رئیس کی خوشامد کی، نہ لباس درباری سے کہین گئے، نہ کسی بادشاہ کو کبھی خداوند کہا (۱) چنانچہ مولف مذکور نے علامہ جائسی کی روائت سے ایک واقعہ لکھا ہے کہ مرزا صاحب ایک مجلس مین واجد علی شاہ مرحوم کے روبرو جب گئے تو باتون مین انہون نے معمولی لفظ 'خداوند' (جو لکھنو کے درباریون کا تکیہ کلام تھا) سے بادشاہ کو مخاطب نہ کیا ۔ تو ایک صاحب نے تخلیہ مین بادشاہ سے کہا کہ شاید لفظ 'خداوند' کہنے مین مرزا صاحب کو کچھ اکراہ ہے ۔ بادشاہ نے اپنی عالی ظرفی کی وجہ سے بات ٹال دی ۔ دوسرے روز مرزا نے یہ رباعیان پڑھین (۲) ۔

رباعی

نادان کہون دل کو کہ خرد مند کہون	یا سلسلۂ وضع کا پابند کہون
اک روز خدا کو منہ دکھانا ہے دبیر	بندون کو کس منہ سے خداوند کہون

رباعی

حیدر کو غنی سب کو غرض مند کہون	بے حد ہین شرف ان کے مین تا چند کہون
ہے شیر خدا مین بخدا، شانِ خدا	اس بندے کو سو بار خداوند کہون

ایفائے عہد | انہی سید علی حسن صاحب جائسی کی زبانی، مولف حیات دبیر نے ایک روایت مرزا صاحب کے ایفائے عہد کے متعلق رقم کی ہے، کہ ایک مرتبہ مجلس مین مرزا صاحب نے ایک نیا مرثیہ پڑھا جس کا ایک مصرعہ یہ تھا ۔

اے طبع دلیر آج دکھا شیر کے حملے

علامہ جائسی کو بہت پسند آیا ۔ مرزا صاحب سے مانگا ۔ انہون نے جواب دیا کہ بروز روانگی وطن آپ کو ملے گا ۔ علامہ عشرۂ محرم، ہمیشہ جائس مین کرتے تھے ۔ آخر ماہ ذوالحج مین جب قصد روانگی کیا تو شہر کے ناکے پر اپنے پہنچنے سے پہلے مرزا صاحب کی پالکی موجود پائی وہ ملے تو وہی مرثیہ ہاتھ مین تھا (۳) ۔

---

(۱) حیات دبیر ص ۷۱ ۔

(۲) حیات دبیر ص ۹۷ ۔

(۳) حیات دبیر ص ۷۲ ۔

دوسرون کی دلجوئی کا بھی بڑا خیال رکھتے تھے اور دلشکنی کو بدترین خصائل ذمیمہ مین سے سمجھتے تھے۔ اپنے اس شعر پر ہمیشہ عمل پیرا رہے ؎

دشمن سے بھی ہم قطع نہین کرتے حیا کو
مانند غبار اٹھتے مین تعظیم ہوا کو

میر ضمیر سے جب لوگون نے بگڑ وادی، تو کبھی ان کی شان مین گستاخی کا لفظ منہ سے نہین نکالا ۔یہی حال میر انیس کے متعلق تھا ۔ (۱)

آن | اس سے پیشتر یہ لکھا جاچکا ہے کہ اس وقت مرثیہ گو اپنی ابتدائی شہرت کے لئے سوز خوانون کے محتاج تھے ۔میر علی اس عہد کے مشہور سوزخوان تھے (۲) ۔ جن کے در دولت پر بڑے بڑے حکام اور شہزادے سننے کو آتے تھے ۔منشی صاحب زیادہ تر دلگیر مرحوم (۳) کے سلامون اور مرثیون پر سوز رکھتے تھے کہ جن کے کلام مین قدرتی طور پر سوز بہت ہے ۔اکثر مرثیہ گو اپنے سلام اور مرثیے میر علی کے پاس لے جاتے جس شخص کا سلام سوز رکھ کر میر علی ایک دفعہ پڑھ دیتے تھے، دور دور اس کی شہرت ہوجاتی تھی ۔مرزا صاحب کی شہرت سن کر میر علی نے ایک دو مرثیے طلب کئے اور مرزا صاحب نے بقول مولف حیات دبیر غالباً مندرجہ ذیل تین مرثیے بھیجے :۔

۱ ۔ باغ فردوس سے یہ بزم عزا بہتر ہے
۲ ۔ بخدا تاج سر عرش خدا ہے شبیر
۳ ۔جب ہوئی ظہر تلک قتل سپاہ شبیر

اور میر علی نے سوز مین پڑھے ۔ اور خوب رنگ ہوا ۔ان مرثیون کی زبان اور بندش میر علی کو بہت پسند آئی ۔اتفاق سے ایک روز کسی درگاہ یا کربلا مین ان مرثیون مین سے ایک مرثیہ کسی شخص نے پڑھ دیا ۔میر علی سوزخوان کو یہ بات بہت ناگوار گذری اور دبیر کو پیغام بھیجا کہ آئندہ اگر تمھین یہ منظور ہو کہ مین تمہارا کلام پڑھون تو جو مرثیہ مجھے دو کسی دوسرے سوزخوان کو تین سال تک نہ دو ۔مرزا صاحب نے یہ جواب دیا ؎

---

(۱) حیات دبیر ص ۷۲ ۔

(۲) ملاحظہ ہو قدیم ہنر و ہنرمندان اودھ (سید اسرار حسین)

(۳) میان دلگیر کا کلام سوز خوانون مین بہت مقبول تھا ملاحظہ ہو عبارت خاتمہ کلیات مرثیہ دلگیر جلد سوم ص ۲۹۶ مطبوعہ لا نولکشور ۱۸۹۷ع

حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر است رفتن زپائے مردی همسایہ دربہشت

اس کے بعد نہ میر علی نے ان کا کوئی مرثیہ پڑھا اور نہ انھوں نے اسے دیا (۱) ۔

فنون جنگ مین مہارت دیباچہ صبح شانی مین لکھا ہے کہ ایک روز مرزا صاحب محلاتِ شاہی کے دفتر سے نکل کر آتے تھے کہ ایک ہاتھی مست بھاگا ہوا آیا ۔ اس کو مرزا صاحب نے اپنی طرف آتا ہوا دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ اور سب آدمی اس کے خوف سے بھاگ بھاگ کر چھپ گئے ہین ۔ دلیری کا کمال یہ تھا کہ حواس بجا رہے ۔ برابر چبوترہ تھا اس پر کچھ برچھے رکھے ہوئے تھے چبوترہ پر چڑھ کر ایک برچھا لیا اور جب وہ ہاتھی قریب آیا تو وہین سے اس کی مستک پر اس طرح تاک کر مارا کہ ہاتھی چنگھاڑ کر بھاگ گیا" اس دن لوگون کو معلوم ہوا کہ مرزا صاحب ان فنونِ جنگ مین بھی دخل رکھتے ہین (۲) ۔

زہد مرزا دبیر کے گو دو استاد اخباری فرقہ سے متعلق تھے مگر وہ خود ایک محتاط اصولی شیعہ تھے (۳) عابد، شب زندہ دار (۴) اور خوف خدا سے ڈرنے والے تھے ۔ سادات کے معتقد اور غلام تھے ۔ بلکہ اپنے آپ کو سادات کا غلام کہ کر فخر محسوس کرتے تھے ۔ آدھی رات کو جب احباب کا مجمع اٹھ جاتا تو نمازِ شب مین مصروف ہوجاتے ۔ یہ ٹھیک طور پر معلوم نہ ہوسکا کہ یہ سلسلہ کس وقت تک جاری رہتا اور کس وقت سوتے تھے ۔ صبح کی عبادت دو گھڑی دن گئے تک جاری رہتی ۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ مداحِ اہل بیت کو بھی عبادت خدا سمجھتے تھے اور اکثر تعقیبات کے وقت بھی مناقب و مصائبِ اہلِ بیت کہتے رہتے تھے (۵) ۔

---

(۱) حیات دبیر ص ۷۹ ۔ ۸۰

(۲) دیباچہ صبح شانی ص ۱۸ ۔

(۳) حیات دبیر ص ۲۶ ۔

(۴) اودھ اخبار شمارہ ۱۸ مارچ ۱۸۷۵ء

(۵) حیات دبیر ص ۶۲ ۔ " مرزا دبیر صاحب ۔ اہل اللہ فی جنتہ کا درجہ حوصلہ انسانی کا پست کردینے والا نظر آتا ہے ۔ آپ تمام تر صفات ملکوتی سے متصف اور لاریب خاصان خدا سے تھے ۔ اولیاء خدا کی خوبیاں واہب العطایا نے حضرت کو بخشی تھین ۔ آپ کی نماز سخاوت و ایثار شہرۂ آفاق ہے ۔ علم و فضل کے ساتھ توفیق عبادت کچھ خدائے پاک نے عطا فرمائی تھی ۔ اخلاق ~~(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)~~ غرض کہ آپ پورا نمونہ تھے ۔ جود و سخا علم و حصل بذل و عطا میں اپنا جواب آپ تھے ۔ طبیعت بے حد شریف اور منور پائی تھی ۔ منکسر مزاجی خاکساری اور فروتنی میں اپنا نظیر نہیں رکھتے تھے ۔ خوش مزاجی، خوش اخلاقی، خوش اوقاتی آپ پر ختم تھی عمر بھر کبھی کسی کی غیبت نہیں کی ناز لیت کسی سے ترشرو ہوکر نہیں بولے ۔ رفتار گفتار کردار سب میں یکتائے وقت تھے ۔ کاشف الحقائق، امداد امام اثر، ص ۵۳۸

حلقۂ مداحین ؎ علم و فضل اور زھد و عبادت کا قدرتی نتیجہ مزاج کی پاکیزگی ھے —
ھر انسان اپنے مزاج اور طبیعت کے مطابق دوست اور ساتھی تلاش
کرکے اپنی مرضی کے مطابق ماحول بنالیتا ھے — اس وقت کے لکھنئو مین اھل کمال کی
کمی نہ تھی — چنانچہ مرزا صاحب کے مداحون مین ھمین مندرجہ ذیل نام ملتے ھین :—

علامہ جائسی | ان کا نام مولوی سید علی حسن اور تعلق خاندانِ اجتہاد سے تھا —
مولف حیات دبیر کو سوانح کی ترتیب مین ان سے بڑی مدد ملی — ان ھی کی زبانی اس نے
لکھا ھے کہ مرزا کو خاندانِ اجتہاد مین بڑی مقبولیت حاصل تھی — انھین ان مجالس
مین پڑھنے کے لئے بلایا جاتا جن مین اس معزز خاندان کے جملہ مجتہدین کے علاوہ لکھنو
کے تقریباً تمام اھلِ کمال شرکت کرتے تھے — کسی مرثیہ گو کی خاندانِ اجتہاد مین مقبولیت اس
کے انتہائی کمال کی دلیل ھے —

شمس العلما مفتی میر عباس صاحب | ان کے متعلق کہا جاتا ھے کہ میر انیس اپنے کلام پر ان
سے اصلاح بھی لیتے تھے — انھین مرزا صاحب سے خصوصی تعلقات معلوم ھوتے ھین کیونکہ
مرزا صاحب کے ایک شعر کی تائید مین انھون نے اپنے رسالہ عشرہ کاملہ مین تقریباً تین
صفحات لکھے ھین وہ شعر یہ ھے ؎

اس رخش کے منہ پر کوئی دن چڑھ نہین سکتا
سرعت کا یہ عالم ھے کہ سِن بڑھ نہین سکتا (۱)

انیس و دبیر کے کلام کو ایک دوسرے پر فضیلت عطا کرنے کے سلسلہ مین ان کی رائے بڑی
دقیع اور مشہور ھے :—

"کلام مرزا دبیر دقیق و نمکین است و کلام میر انیس فصیح و شیرین و بوجہ
اختلاف ھر دو ذائقہ و ھر دو مزہ محل ترجیح نماندہ — زیرا کہ بعض مردم شیرینی را پسند
می کنند و بعض نمکین را " (۲)

(۱) تفصیل کے لئے ملاحظہ ھو رسالہ عشرہ کاملہ مطبوعہ مطبع حسینی اثنا عشری
لکھنئو مورخہ ۱۲ جمادی الاول ۱۲۹۷ ھ

(۲) رسالہ عشرہ کاملہ مذکور (بجواب مولوی مقرب علی خان) و خمخانۂ جاوید جلد اول
ص ۲۹۲ —

سید المتکلمین سید حامد حسین صاحب مصنف استقصاء الافہام و طبقات الانوار	یہ صاحب بھی مرزا اور دبیر دونون کے مداح تھے مرزا دبیر کے اس شعر کو خصوصیت سے پسند کرتے

تھے (۱) ؎

طے ہر قدم پہ ایک مہینے کی راہ ہے
روشن ہلال فعل کی اس پر گواہ ہے

مولوی عبد الحی صاحب فرنگی محلی	علمائے فرنگی محل کا خاندان کسی تعارف کا محتاج نہین ـ یہ خاندان اورنگ زیب کے عہد سے اپنے علم و فضل کی وجہ سے مشہور

ہے ـ ان لوگون نے لکھنؤ کو چند سال مین ہی یونیورسٹی بنا دیا تھا اور اس زمانہ مین تمام ہندوستان کے علم و فضل کا مرکز ان لوگون کا محلہ تھا (۲) ـ مولانا عبد الحی کے متعلق، صاحب حیاتِ دبیر نے مولوی سلیم الدین سیاح کی زبانی مندرجہ ذیل حکایت نقل کی ہے :-

"ایک مرتبہ، مین مولوی عبد الحی صاحب کی زندگی مین لکھنؤ گیا ـ مولوی صاحب سے حُسنِ عقیدت تھی ـ ان کی خدمت مین پہنچا ـ نہایت خلق و مروت سے پیش آئے ـ روز مرّہ حاضر ہوتا تھا ـ ایک روز مین نے عرض کیا کہ لکھنؤ کی وہ تمام چیزین جن کی مین تعریف سنتا تھا دیکھ چکا ـ دبیر و انیس کی شاعری (مرثیہ گوئی) کی بہت تعریف سنی تھی ـ افسوس وہ دونون کامل گذر گئے ـ اب آپ مجھے کسی ایسے شخص سے ملا دیجئے جو ان کا کلام صحیح مجھے سنا دے ـ فرمایا اچھا آج رات کو میرے پاس آئیے ـ رات کو حاضر خدمت ہوا تو بالکل تخلیہ تھا ـ مجھے یہ خیال تھا کہ شاید کسی ایسے شخص کو مولوی صاحب ممدوح نے بلایا ہوگا جو ان کا کلام مجھے سنا دے مگر وہان کسی اور کو نہ پایا ـ تھوڑی دیر بعد فرمایا دبیر و انیس کا کلام سنوگے ؟ مین نے عرض کی حضور دل تو بہت چاہتا ہے ـ فرمایا اچھا ایک جلد نکالی ـ اس مین سے دونون بزرگون کے مختلف مرثیون کے منتخب بند مجھے سنائے اور فرمایا کہ ایسے کامل شاعر ہندوستان مین تو کیا عرب و عجم مین بھی نہین نکلین گے ـ اور درحقیقت وہ تمام بند جو انھون نے ان دونون بزرگون کے پڑھے لاجواب تھے ـ" (۳) ـ

---

(۱) ردالموازنہ
(۲) گذشتہ لکھنؤ (شرر) ص ۹۵ ـ
(۳) حیات دبیر ـ

علم و فضل | مولانا اشہری کہتے ہین کہ مرزا صاحب کو عربی کے ادب سے خاص دلچسپی تھی ۔ اور فارسی کی اعلی تصنیفات ہمیشہ زیرِنگاہ رہتی تھین ۔ اس لئے عربی اور فارسی کی ترکیبون اور شکوہِ کلام نے ان کی شاعری مین ایک خاص طور کی آمد اور آورد کو جگہ دی تھی ۔ اور وہ اردو کے لفظون مین عربی اور فارسی کے بڑے بڑے مطالب لانا چاہتے تھے ۔ مرزا صاحب کے کلام سے بے اِنتہا اعلیٰ مطالب کا اقتباس کیاجاسکتا ہے (۱) ۔

جیساکہ اس سے پیشتر لکھاجاچکا ہے ۔ مرزا کو کتبِ معقول و منقول پر خاصہ عبور تھا اور وہ اپنے وقت کے مروجہ علوم مین منتہی تھے ۔ اس کی جھلک ان کے کلام مین بھی پائی جاتی ہے ۔ جو فرماتے ہین ؎

ہے استفادہ مجھ کو حدیثون کی سیر سے
واللہ ننگ و عار ہے مضمون غـــیر سے

مرزا صاحب کے کلام مین آیات قرآنی احادیث نبوی اور اقوال آئمہ کے مضامین کی خاصی تعداد مین ملتے ہین ۔ اس کے علاوہ اکثر مشہور عربی، فارسی اور اردو شعراء کے مضامین کو بھی اپنے کلام مین سمونے کی کوشش کی ہے ۔ ظاہر ہے کہ بغیر وسیع مطالعہ اور علم و فضل کے یہ ممکن نہ تھا ۔

---

(۱) بحوالہ مضمون " مرزا دبیر " (سید نظیرالحسن فوق) مشمولہ سبع شانی ص ۲۸ ۔

باب چہارم

انیس اور دبیر کی معاصرت

کلام دبیر کا تقدم زمانی (کلام انیس پر)

سلام کا قصہ

کون کس کی تقلید کرتا تھا ؟ اس سوال کا جواب
(مختلف روایات اور محاکمہ)

مولانا شبلی کا کتاب کے ہیرو کے متعلق غلط مفروضہ

میر انیس اور مرزا دبیر کی یکجا خواندگی
(مختلف روایات اور محاکمہ)

باب چہارم

انیس اور دبیر کی معاصرت | جیساکہ اس سے پہلے لکھا جاچکا ہے میر انیس کے فیض آباد سے ترکِ سکونت کرکے لکھنؤ آنے سے تقریبا پچیس سال پیشتر مرزا دبیر اقلیمِ مرثیہ گوئی میں اپنا سکہ رائج کرچکے تھے ۔ اور اس کی تائید نہ صرف فسانۂ عجائب (سرور) سے ہوتی ہے بلکہ میر صاحب خود فرمایا کرتے تھے کہ جب ہم نے لکھنؤ میں مرثیہ پڑھنا شروع کیا تو دو صاحب اس فن کے لکھنؤ میں نامی و گرامی تھے ۔ ایک تو میر مداری صاحب جو بہار میں رہتے تھے دوسرے مرزا سلامت علی دبیر۔(۱) ۱۲ مارچ ۱۸۷۵ء کے اودھ اخبار میں جو مرزا دبیر کے مختصر حالات چھپے ان میں بھی نصیرالدین حیدر سے واجد علی شاہ تک سب شاہان اودھ کے متعلق لکھا ہے کہ وہ دبیر کے قدردان تھے ۔

یہ بھی اس سے پہلے تحریر کیا جاچکا ہے کہ دونوں اصحاب کمال کے باہمی روابط بڑے خوش گوار تھے یہاں تک کہ ان کی محافل میں ایک دوسرے کی تنقیص میں کچھ کہنے کی کسی کو بھی اجازت نہ ہوتی تھی ۔ البتہ انیسیوں اور دبیریوں کے جھگڑے بڑے زور شور سے چلتے رہے (۲) اور دونوں گروہ اپنے اپنے ممدوح کی تعریف اور دوسرے کے کلام کی تنقیص پر کمربستہ رہتے تھے ۔ جیساکہ مشہور مرثیہ گو مشیر نے کہا ہے ؎

اب قصہ رہ گیا ہے انیس و دبیر کا

مگر کون سنتا تھا ۔ انشاء اور مصحفی کے عہد ہی سے اہالیانِ لکھنؤ کو شعراء کی چوٹیں سننے اور لطف لینے کی عادت ہوگئی تھی ۔ میر ضمیر اور میر خلیق کو یکجا پڑھا کر دیکھ چکے

---

(۱) واقعات انیس (مہدی حسن احسن) ص ۲۷ ۔ نیز ملاحظہ ہو حیات فریاد (شاد عظیم آبادی) ص ۱۷۵ " غدر سے دس بارہ سال پیشتر طلب معاش کی دھن میں لکھنؤ گئے وہاں مرثیہ گوئی کے بازار کو بہت بارونق پایا اس وقت بجز مرزا دبیر کے میر انیس صاحب کو کوئی جانتا بھی نہ تھا "

(۲) آزاد نے آب حیات میں ان جھگڑوں کی روئداد بڑے ڈرامائی انداز سے دی ہے ۔ اس سے بھی زیادہ تفصیل دیباچہ سبع مثانی میں ہے ۔

تھے[1] پھر ضمیر کو دبیر سے لڑوا کر دیکھ لیا تھا ۔ اب جبکہ انیس میدانِ مرثیہ میں اُترے اور دبیر کے مدِمقابل ٹھہرے' تو دونوں کے قدردانوں نے اپنے لئے علیحدہ علیحدہ کیمپ قائم کر لئے[2] اسی سلسلہ میں ایک سلام کا قصہ ہے جو کسی قدر منحرف صورت میں مشہور ہوگیا ۔ غالبا اس انحراف کی ابتدا مہدی حسن صاحب احسن' مولف واقعاتِ انیس سے ہوئی ۔ وہ لکھتے ہیں :

" میر انیس مرحوم نے کسی مجلس میں ایک سلام پڑھا (حسینوں کو مہ جبینوں کو) اس زمین میں میر صاحب کے ایک شعر کی عالم گیر شہرت ہوئی ؎

یہ جھریاں نہیں ہاتھوں پہ ضعف پیری نے
چنا ہے جامۂ اصلی کی آستینوں کو

مرزا صاحب مغفور کو یہ زمین پسند آئی ۔ انہوں نے بھی سلام کہا اور کسی مجلس میں پڑھے ۔ بیفکروں کو شگوفہ ہاتھ لگا' معمولی بات کو میر صاحب کے سامنے رنگ آمیزیوں سے بیان کیا ۔ رشکِ فن داخلِ' خواصِ شعراء ہے' خصوصا " ایسا شخص جس کی طبیعت قدرتا " تقابل پسند نہ ہو ۔ میر صاحب کی برھمی مزاج کے لئے یہ لطیفہ کافی تھا ۔ پھر تو دونوں جانب سے طبع آزمائیاں شروع ہوگئیں ۔ بلندپروازیوں نے زمینِ شعر کو آسمان پر پہنچا دیا ۔ دونوں صاحبوں کے سلام' کلیاتِ مطبوعہ میں موجود ہیں ۔ اس لئے میں یہاں ان کے لکھنے کی ضرورت نہیں دیکھتا ۔ اہلِ لکھنؤ فقط دلگی دیکھنے والے تھے ۔ اپنے شہر کے دو نامی شاعروں کی تحقیر منظور نہ تھی ۔ جب مقابلے کا لطف اٹھا چکے' تو آپ ہی اصلاح کی کوشش کی ۔ چونکہ میر و مرزا کی طبیعتیں بغض و نفسانیت سے پاک تھیں' صفائی ہوگئی اور قصہ رفع دفع ہوگیا ۔[3]

لیکن یہ حقیقت ہے کہ مرزا دبیر کے کلام میں ایسا کوئی سلام موجود نہیں ۔ اگر انہوں نے کہا ہوتا' تو کلام میں بھی ہوتا ۔ اصل واقعہ اس طرح ہے کہ میر انیس نے ایک سلام کہا

---

(۱) حیاتِ انیس (اشہری) ص ۱۷ ۔

(۲) میر قربان علی سالک (شاگرد مرزا غالب) اپنی بیاض میں ۱۸۶۱ع کی یادداشت لکھتے ہیں " میں دو مہینے سے لکھنؤ میں وارد ہوں ۔ دلی میں مرزا غالب اور استاد ذوق کی چوٹیں دیکھتا سنتا تھا مگر یہاں میر انیس اور مرزا دبیر کی معرکہ آرائی کا عالم نرالا ہے ۔ ایکِ طرف کا معتقد دوسری طرف کے والوں میں ایسا دیکھا جاتا ہے جیسے موحدین میں مشرک اور مسلمانوں میں کافر " (بحوالہ حیاتِ انیس (اشہری) ص ۲۵۳ ۔ ۲۵۴) ۔

(۳) واقعاتِ انیس صفحہ ۲۱ (مہدی حسن احسن) ۔

تھاجس کا مطلع یہ ہے ؎

سدا ہے فکر ترقی مآل بینوں کو ہم آسمان سے لائے ہین ان زمینوں کو

اس پر اور شعراء نے بھی سلام کہے – ایک سلام مرزا اوج (فرزند دبیر) نے بھی کہا اور نواب میر محمد حسین کی مجلس مین پڑھا – ایک سلام میر مونس نے بھی نواب ممتازالدولہ (شاگرد دبیر) کو مخاطب کرکے پڑھا جس مین یہ شعر بھی شامل تھا ؎

بھلا تردد بیجا سے ان مین کیا حاصل اٹھا چکے ہین زمیندار جن زمینوں کو

نواب مذکور کو اپنے استاد کی تحقیر کا پہلو دکھائی دیا اور اٹھ کر چلے گئے – پھر کیا تھا انیسیوں اور دبیریوں مین ایک جھگڑے کا سامان پیدا ہوگیا – دبیریوں کی طرف سے قدیم اساتذہ کے کلام سے اس زمین مین کہی ہوئی غزلین اور ایک دو سلام بھی دکھائے – مشہر نے یہ شعر کہا ؎

اساتذہ کی ہین غزلین سلام بھی اکثر نیا سمجھتے ہین پھر لوگ ان زمینوں کو

انیسیوں کو سب سے زیادہ "جامۂ اصلی کی آستینوں" کی نئی ترکیب پر ناز تھا – دبیریوں نے میر تقی میر کے کلام سے یہ شعر دکھادیا ؎

ہین ضعف سے جھریاں بدن پر پیری جامہ کو چن رہی ہے

کسی نے مطلع پر اعتراض کیا کہ دعویٰ تو ترقی کا ہے اور کہتے ہین:–

"ہم آسمان سے لائے ہین ان زمینوں کو" (۱)

اسے اس طرح ہونا چاہئے

"ملی ہے عرش پہ معراج ان زمینوں کو"

غرض ایک طوفان بدتمیزی برپا ہوگیا – بہرحال دبیر اور انیس دونوں نے اپنے اپنے شاگردوں اور عزیزوں کو ڈانٹا اور صلح صفائی ہوگئی –(۲)

---

(۱) اسی قسم کی بدذوقی کا مظاہرہ اس شخص نے بھی کیا تھاجس نے اقبال کے مصرعہ "فرش سے عرش پہ شعر ہوا نازل میرا" کو غلط قرار دیا تھا – دیکھین اقبال نامہ –

(۲) تردید موازنہ (شیخ محمد جان عروج فیض آبادی) و حیات دبیر و دیباچہ سبع شانی آخرالذکر مین نظیر (برادر دبیر) کے ایک مقطع کا بھی ذکر ہے –

طعنہ زن ہوتے ہین جو ہنس کے منبر پہ نظیر

کیا نہین جانتے وہ اہل زبان اور بھی ہین

یہ سلام کا قصہ کچھ تنہا نہ تھا ۔ اس قسم کی چوٹین اکثر چلتی رہتی تھین جو بڑی طولانی اور مزیدار ہوتی تھین ۔ جہان نقصان تھا وہان بہت سے مسائل علم و ادب بھی حل ہوجاتے تھے اور اس طرح ان مین حصہ لینے والے بلکہ تماشائیون کے ذوق شعر و سخن کی تربیت ہوتی رہتی ــــہ

خدا دراز کرے عمر عیب بینون کی
ہم ان کی شمع سے راہ صواب دیکھتے ہین

اسی سلسلہ مین ایک دلچسپ سوال مولانا شبلی نے پیدا کیا ہے کہ کون کس کی تقلید کرتا تھا وہ لکھتے ہین

" اگر یہ پتہ لگ سکتا کہ دونون حریفون مین سے اول کس نے میدان شاعری مین قدم رکھا (۱) اور خاص خاص مرثیے، بلکہ خاص خاص بند جو دونون کے ہان قریب المعنی پائے جاتے ہین اول کس نے کہے، تو شاعری کی تاریخ کے بہت سے دقیق نکتے حل ہوجاتے ہین لیکن افسوس ہے کہ باوجود بہت سی جدوجہد کے اس بارہ مین مجھ کو کچھ کامیابی نہین ہوئی ۔

دونون حریفون کے مرثیون کو دیکھو تو صاف نظر آتا ہے کہ ایک نے دوسرے کے کلام کو سامنے رکھ کر لکھا ہے لیکن زمانے کے تقدیم و تاخیر کے نہ معلوم ہونے سے یہ نہین متعین ہوتا کہ ایجاد کا فخر کس کو ہے اور کس نے کس سے کیا اثر لیا ہے ۔ میر انیس جابجا فخریہ شعرون مین اس بات کا اشارہ کرتے ہین کہ ان کے حریف ان کے کلام سے فائدہ اٹھاتے ہین مثلاً

لگا رہا ہون مضامین نو کے پھر انبار — خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینون کو

نوا سنجیون نے تری اے انیس — ہر اک زاغ کو خوش بیان کر دیا
ملتی ملتی نہین ہے دزدان معانی سے نجات — سچ ہے کہ مگس سے کب شکر بچتی ہے

---

(۱) تعجب ہے کہ مولانا جیسے محقق آدمی کو اتنا قریب العہد ہونے کے باوجود یہ پتہ نہ چل سکا کہ دونون مین سے مرثیہ گوئی کس نے پہلے شروع کی ۔ حالانکہ دبیر کا تقدم زمانی ایک مسلمہ امر تھا جیساکہ ۱۲ مارچ ۱۸۷۵ع اودھ اخبار مین جو حالات مرزا دبیر چھپے ان مین یہ صاف صاف ذکر موجود تھا ۔ نیز شمس الضحیٰ اور تنقید آب حیات بہت پہلے سے چھپ چکی تھین ۔

ان چوٹون کو سن کر مرزا دبیر صاحب برابر کا جواب نہین دیتے، یعنی یہ نہین کہتے کہ مین نہین میرا حریف سرقہ کرتا ہے، بلکہ صرف تبرا کرتے ہین، کہ مین اس جرم کا مرتکب نہین چنانچہ فرماتے ہین ؎

شکر خدا کہ سرقہ کی حد سے بعید ہون۔ ہر مرثیہ مین موجد طرز جدید ہون

ہے استفادہ مجھ کو احادیث و سیر سے۔ یعنی بری ہون سرقۂ مضمون غیر سے

اس سے اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ میر انیس، مرزا صاحب کے مقابلہ کا قصد نہین کرتے تھے، اور ان کے مرثیون کا جواب لکھنا نہین چاہتے تھے، ورنہ مرزا صاحب اس کا اشارہ کرتے اور ان کے جب بعض مرثیون سے صاف ثابت ہے کہ وہ ایک دوسرے کے مقابلہ پر لکھے گئے ہین تو خواہ مخواہ ماننا پڑتا ہے کہ مقابلہ اور ہم طرحی اور مسابقت کی کوشش مرزا صاحب کی طرف سے ہوتی تھی ۔ میر انیس نے اسی کی طرف ایک موقع پر اشارہ کیا ہے، چنانچہ کہتے ہین ؎ (1)

بھلا تردد بیجا سے اس مین کیا حاصل اٹھا چکے ہین زمیندار جن زمینون کو

مولٰینا کے بیان کا خلاصہ یہ ہے :۔

1) انہین یہ معلوم کرنے مین کامیابی حاصل نہین ہوئی کہ انیس اور دبیر مین سے کس نے پہلے کوچۂ شاعری مین قدم رکھا اور

2) قریب المعنی اشعار کس نے پہلے کہے ۔

3) انیس جابجا فخریہ اشعار کہ کر یہ دعوٰی کرتے ہین کہ ان کے حریف ان کے اشعار سے خوشہ چینی کرتے ہین ۔

4) مرزا دبیر برابر کا جواب نہین دیتے، بلکہ صرف سرقہ کے الزام سے اپنے آپکو بری قرار دیتے کہتے ہین ۔ الٹا الزام نہین لگاتے ۔

5) مولانا اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہین کہ دبیر ہی سرقہ اور تقلید کے مجرم ہین اور ان کا ہیرو اس الزام سے بری ہے ۔

---

(1) موازنہ انیس و دبیر (شبلی) ص ٢٦ ۔ ٢٧ اسی مضمون کو دوبارہ ص ٢٨٦ پر میر انیس اور مرزا دبیر کے متحد المضمون مرثیے کے عنوان کے ماتحت بحث تحریر فرمایا ہے ۔ (سلام کے قصے مین یہ پہلے لکھا جاچکا ہے کہ مرزا دبیر نے کوئی سلام اس زمین مین نہین کہا) ۔

جہان تک کوچۂ شاعری مین ورود کی تقدیم و تاخیر کا تعلق ہے، اب دبیر کے تقدم زمانی مین کوئی اختلاف نہین رہا ۔یہ کہنا حماقت ہے کہ انیس فیض آباد مین مشق سخن نہین فرمائے تھے مگر جہان تک بحیثیت مرثیہ گو ان کی شہرت اور دبیر کے مد مقابل بننے کا تعلق ہے، اس کا آغاز جیساکہ معتبر شہادتون کی بنا پر پہلے لکھا جاچکا ہے عہد امجد علی شاہ سے ہوتا ہے ۔حالانکہ دبیر تو نصیر الدین حیدر کے روبرو بھی اپنا کلام سنا چکے تھے ۔(1) ہان یہ معلوم کرنا فی الواقع ناممکن ہے کہ ہم معنی اشعار پہلے کس نے کہے ۔(۲)

یہ بھی درست ہے کہ انیس جابجا فخریہ اشعار کہ کر حریفون پر خوشہ چینی کا الزام لگاتے ہین مگر یہ درست نہین کہ دبیر برابر کا جواب نہین دیتے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ الزام دبیر، انیس سے کہین زیادہ شد و مد سے لگاتے ہین جیساکہ مندرجہ ذیل اشعار سے ظاہر ہے :۔

رباعی

ہے سست کہ چست پر کلام اپنا ہے — لا ریب خطا پوش امام اپنا ہے
جو بند کے بند قطع کرلیتے ہین — ان مرثیہ گیون کو سلام اپنا ہے

رباعی دیگر

سرقہ مضمون کا زبون ہوتا ہے — یعنی علم نظم نگون ہوتا ہے
پر ان مین جو مندرج ہے حال شہدا — اس سے مرے مرثیون کا خون ہوتا ہے

ایضاً

شہران مضامین کو کہان بند کرون — گونجین گے ڈکارین گے جہان بند کرون
خلاقی مضمون کا ہے دعویٰ سب کو — کھل جائے حقیقت جو زبان بند کرون (۳)

(۱) اس کی تائید مین فسانۂ عجائب (سرور) اخبار اودھ اور واقعات انیس کے حوالے دیے جاچکے ہین بلکہ خود میر صاحب کا اپنا قول بھی نقل کیا جاچکا ہے ۔

(۲) مولف حیات دبیر کا خیال ہے کہ مقابلہ کی کوشش میر صاحب کی طرف سے ہوئی ۔ کیونکہ مشہور آدمی کے اشعار کا عموماً جواب کہا جاتا ہے (ص ۲۹۹) ۔

(۳) یہ تینون رباعیان دفتر ماتم جلد بیس مین موجود ہین ۔

هین وقف همیشه مرے الفاظ و معانی — هان قلزم شہرت کا سبهی بهتے هین پانی
هرسحر مین هے بحرِطبیعت کی روانی — هے زورِ سخن شوریہ موجون کی زبانی

قطرے مین مگر بحث مین، مین صرف نہین هون
دریا هون سخن کا مین تنگ ظرف نہین هون (۱)

لاریب توارد سے بری کوئی کہان هے — افراطِ توارد هوتو سرقے کا گمان هے
جو مصرع موزون مرا مشہور جہان هے — البته توارد هو تو حیرت کا مکان هے

سرقه هے که تالیف هے مضمونِ کہن کی
یه سب هے زکوۃ اپنے زرنقد سخن کی

شاکر هو دبیر آل نبی کی هے تاییئد (تائید) — تازه هے تمامی سخن اور تازه هے تمهید
دُزدانِ معانی پہ نه کر منع کی تاکید — تو مجتهدِ نظم هے فرض ان پہ هے تقلید (۲)

یه سب اشعار مرزا دبیر کے مطبوعه کلام مین موجود هین ــ نامعلوم مولٰینا کی رسائی ان تک کیون نه هوئی ــ غالباً " مولینا کا خیال تها که کتاب کے مرکزی کردار کو دوسرون پــــر اهمیت دینا تذکره نگار کا فرض هے چنانچه سوانح مولانا روم مین فرماتے هین :

" مولانا روم کے دیوان پر ریویو (ریویو) کرتے هوئے همارا فرض تها که ان کے معاصرین سعدی و عراقی سے ان کا موازنه کیا جاتا ــ تینون بزرگون کی غزلون کے نمونے دکھائے جاتے ــ اور هر ایك کی خصوصیات بیان کی جاتین اور چونکه مولانا همارے هیرو هین اس لئے مذاق حال کے موافق خواه مخواه بهی ان کو ترجیح دی جاتی ــ لیکن حقیقت هے که ایسا کرنا واقعــــه نگاری کے فرض کے بالکل خلاف هے "ــ (۳)

مندرجه بالا اقتباس سے یه ظاهر هے که مولانا غلطی سے سمجھ بیٹھے تھے که زمانه کے مذاق کے مطابق مقاله کے هیرو کو خواه مخواه ترجیح دینی چاهئے اور وه چونکه انیس کو مقاله کا هیرو سمجھتے تھے جیساکه مندرجه ذیل عبارت سے ظاهر هے اس لئے دبیر کے کلام کو نہایت غور سے دیکھنے کی ضرورت محسوس نه کی ــ

---

(۱) دفتر ماتم جلد اول ص ۲۱۰ ــ
(۲) بحواله المیزان ص ۲۸ ــ (سید نظیرالحسن صاحب فوق) ــ
(۳) سوانح مولانا روم (شبلی) ص ۵۰ ــ

" مدت سے میرا ارادہ تھا کہ کسی ممتاز شاعر کے کلام پر تقریظ و تنقید لکھی جائے۔ جس سے اندازہ ہوسکے کہ اردو شاعری، باوجود کم مائگئ زبان کیا پایہ رکھتی ہے ۔ اس غرض کے لئے میر انیس سے زیادہ کوئی شخص انتخاب کے لئے موزون نہین ہوسکتا تھا ۔ شکر ہے کہ آج اس ارادے کے پورے ہونے کی نوبت آئی اور یہ کتاب ناظرین کی خدمت مین پیشکش ہے ۔ اس کتاب مین میرانیس کا موازنہ بھی مرزا دبیر سے کیا گیا ہے ۔ اس مناسبت سے اس کا نام موازنہ ہے " (۱) (۲)

اگر مندرجہ بالا اقتباس کو سوانح مولانا روم والے اقتباس سے ملا کر پڑھا جائے تو مندرجہ ذیل حقائق برآمد ہوتے ہین :

۱) مولانا کا مدت سے ارادہ تھا کہ کسی ممتاز اردو شاعر پر کوئی کتاب لکھی جائے۔

۲) اور اس غرض کے لئے انھون نے انیس کا انتخاب کیا ۔

۳) چونکہ اس کا معصر شعرا سے موازنہ کرنا اور ہیرو کو اس سے برتر ثابت کرنا ضروری تھا اس لئے دبیر سے موازنہ بھی کردیا گیا ۔ چنانچہ کتاب کے ۳۰۸ مین سے ۲۵۵ صفحات صرف میر انیس کے کلام کی مختلف خصوصیات بیان کرنے کے لئے وقف ہین اور باقی ۵۳ صفحات مین موازنہ کردیا گیا ہے ۔

اب رہ گیا یہ الزام کہ دبیر، انیس کی خوشہ چینی یا سرقہ کرتے تھے تو یہ مولینا کے پیش کردہ دلائل کی رو سے ثابت نہین ہوسکا ۔ کیونکہ ان کے اس دعویٰ کی بنیاد محض انیس کی شاعرانہ تعلیات پر ہے جن کی دبیر کے ہان بھی کمی نہین، چونکہ دونون شعرا ایک ہی شہر مین ایک طویل عرصہ تک ایک دوسرے کے مدّ مقابل رہے ۔ اس لئے یقینا " دونون نے ایک دوسرے کے نئے مرثیون کے جواب کہے ہون گے اور یہ امر مذموم بھی نہین ۔ جیساکہ مولانا شبلی خود فرماتے ہین :۔

" اساتذہ کا قاعدہ ہے، جب وہ دیکھتے ہین کہ ایک مضمون کسی متقدم شاعر نے باندھا لیکن اچھی طرح نہ بندھ سکا یا اس پر ترقی ممکن ہے تو وہ دانستہ اس مضمون کو لے کر اس طرح ادا کرتے ہین کہ جو کسر تھی نکل جاتی ہے اور شعر بلند رتبہ ہوجاتا ہے ۔ (۳)

---

(۱) موازنہ انیس و دبیر ص ۲ (شبلی)

(۲) موازنہ انیس و دبیر دراصل موازنہ نہین (آل احمد سرور) تنقید کیا ہے ۔ ص ۱۸۸

(۳) موازنہ انیس و دبیر (شبلی) ص ۲۵۲ ۔

میر انیس اور مرزا دبیر کا یکجا پڑھنا | شاہی مجلس کے عنوان سے اشہری نے حیات انیس مین مندرجہ ذیل واقعہ نقل کیا ہے :-

"تمام شہر لکھنئو مین میر انیس اور مرزا دبیر کی دھوم مچی ہوئی تھی ۔ نقادانِ سخن کے جتھے دونون کی طرفداری مین علیحدہ علیحدہ بٹے ہوئے تھے ۔ ہرگروہ اپنے مقتدی کی طرفداری پر زور دیتا تھا ۔ کسی ایک مجلس مین دونون صاحبون کا جمع ہونا اتنا مشکل تھا جو بغیر خاص تدبیر اور اثر کے ناممکن تھا ۔ لیکن لکھنئو کے حضرات دونون کو جمع کئے بغیر کب ماننے والے تھے ۔ چنانچہ نواب مفتاح الدولہ بہادر نے حضرت جان عالم محمد واجد علی بادشاہ اودھ کے سامنے دونون صاحبون کی تعریف کرکے ایسی تقریر کی جس سے بادشاہ دونون کو ایک مجلس مین پڑھنے کا ارشاد فرمائین او بادشاہ نے ایسا ہی کیا ۔ اوسپر مفتاح الدولہ خود دونون صاحبون کی خدمت مین حاضر ہوئے ۔ اور شاہی پیغام پہنچایا ۔ دونون صاحبون نے قبول کرلیا ۔ روز و وقت معینہ پر پہلے دبیر پہنچے اور باریاب حضوری ہوکر ایک جانب بیٹھ گئے ۔ میر انیس نے ہربات کی خبر پہونچنے کا انتظام کر رکھا تھا ۔ جب یہ حال معلوم ہوا کہ مرزا دبیر پہنچ گئے تو اپنے چلنے مین دیر لگانا شروع کی ۔ یہان تک کہ تمام مجلس حاضرین سے بھر گئی اور وقت معینہ سے کچھ وقت زیادہ آگیا ۔ تب شاہی چوبدار حاضر ہوا اور عرض کی کہ مجلس تیار ہے صرف آپ کا انتظار ہے ۔ میرصاحب تیار تو تھے ہی اور نفس نفیس سامنے حاضر تھی اوسپر بیٹھ کر روانہ ہوئے ۔ مجلس مین فرش پر پاؤن رکھتے ہی تمام ارباب تعظیما" اٹھ کھڑے ہوئے ۔ میرصاحب نہایت تمکنت اور وقار سے سیدھے منبر کی طرف گئے اور اپنے قاعدۂ مقررہ کے موافق منبر کے پاس بیٹھ گئے ۔ نواب مفتاح الدولہ سامنے آئے اور ان سے کہا کہ آپ حضرت جان عالم سے عرض کردین کہ انیس حاضر ہے اور آپ کو دعا عرض کرتا ہے ۔ مفتاح الدولہ نے بادشاہ سے اطلاع کی ۔ بادشاہ نے اپنی خوشنودیٔ مزاج کا اظہار کیا ۔ دیکھنے والے حیران رہ گئے کہ میر انیس نے اس موقع پر بھی اپنی خودداری کا کیسا خیال رکھا ہے ۔ آخر کار مجلس شروع ہوئی ۔ پہلے مرزا دبیر کو پڑھنے کا حکم دیا گیا ۔ اونھون نے پڑھا بادشاہ کی تعریف مین بھی ایک رباعی پڑھی ۔ سامعین نے بڑی دلچسپی سے سنا اور واہ واہ سبحان اللہ کی آوازون سے عالیشان کمرہ گونجنے لگا ۔ مآل مجلس بھی حاصل ہوا اور ان کے بعد میر انیس کو پڑھنے کا ارشاد ہوا میر صاحب کچھ لیکر نہ گئے تھے ۔ میر مونس سے پوچھا کچھ لائے ہو ۔ انھون نے ایک سلام اور مرثیہ پیش کیا ۔ اوسکو دیکھا اور فی البدیہہ ایک مطلع تصنیف کیا اور منبر پر تشریف لے

گئے ـ میرمونس کا سلام اوسوقت کے مشاعرہ کی طرح پر تھا جس کا ردیف و قافیہ یہ ہے
" گلستان ہوکر بیابان ہوکر " منبر پر جاکر اپنی عادت کے موافق تھوڑی
دیر چپ بیٹھے رہے جب تمام مجلس ان کی طرف متوجہ ہولی تو جناب امیر کی مدح مین
ایک رباعی پڑھی ـ چارون طرف سے آفرین و مرحبا کا شور بلند ہوا ـ ازان بعد سلام
شروع کیا جس کا وہ فی البدیہہ مطلع یہ ہے ؎

غیر کی مدح کرون شہ کا ثناخوان ہوکر
مجرئی اپنی ہوا کھووٗن سلیمان ہوکر

اس مطلع کا سننا تھا کہ معنی فہم طبیعتین ادائے کلام کے مزے لینے لگین اور میرانیس
کے اندازبیان نے تمام درباری لوگون کو سمجھا دیا کہ ہم اس موقع پر بھی اپنے درجۂ
کمال سے نیچے اترنے والے نہین " (1)

بظاہر ہمین اس واقع کو تسلیم کرلینے مین کوئی تامل نہین ہونا چاہئے ـ گو
اس مین داستان سرائی کے جوش مین میرانیس کے کردار پر بعض ایسے حملے کئے گئے ہین
جو غلط معلوم ہوتے ہین مثلاً ان کا دربار کے متعلق خفیہ حالات سے باخبر رہنے کا اہتمام
کرنا ـ جان بوجھ کر دیر کرکے جانا اپنے ساتھ اپنا کلام نہ لے جانا ـ میر مُونس کے کلام
کو اپنا بنا کر پیش کرنا اور پھر عین سرِ منبر بادشاہ کے روبرو مرزا دبیر پر اتنی سخت تعریض
کرنا ـ میرانیس کی شان سے بعید ہین اور اس سے تذکرہ نگار کا مقصد یعنی انیس کو ان
کے مد مقابل سے ارفع و اعلیٰ ثابت کرنا پورا نہین ہوتا ـ لیکن ان تمام نقائص کے باوجود
یہ واقعہ کسی قدر درست تسلیم کرلیا جاتا مگر اسی کتاب مین فاضل مولف نے اپنے
موقف کی خود ہی تردید کردی ہے ملاحظہ ہو :ـ

" لکھنئو کے حکمران شیعہ تھے اور میرانیس اور میرزا دبیر کی مرثیہ گوئی اور مرثیہ
خوانی کی دھوم شہرہ آفاق ہوچکی تھی ـ لیکن مین نے نہین سنا کہ میرانیس یا میرزا دبیر
کسی امیر و وزیر کی مجلس مین پڑھتے ہون اور جانعالم واجد علی شاہ بادشاہ اودھ بنفس
نفیس اوس مجلس مین تشریف لے گئے ہون اور نہ میرانیس نے بادشاہ کے دربار مین باریابی
کا خیال کیا کیونکہ مذکورہ کے دربار کے لیے ساری گویا باریابی

تعریض

(1) حیات انیس (اشہری) ص ۲۹ ـ ۳۰

کا موقع ڈھونڈتی رہتی تھی ۔ البتہ مٹیا برج کلکتہ مین واجد علی شاہ نے مرزا دبیر کو یاد کیا اور ان کے کلام کی داد دی ۔ (۱)

لیجئے کہان یہ کہ انیس و دبیر دونون اکٹھے واجد علی شاہ کے سامنے پیش تھے اور کہان ان کے دربار مین جانے کی کلی تردید ، دونون بیانات مین سے ایک کو غلط مانے بغیر چارہ نہین ۔

احسن لکھنوی نے بھی میر و مرزا کی یکجا خواندگی کے عنوان اور جزوی تبدیلیون کے ساتھ یہی واقعہ " واقعات انیس " مین نقل کیا ہے ملاحظہ ہو :

" محمد واجد علی شاہ کی والدہ معظمہ ملکہ کشور صاحبہ مرحومہ نے ایک مجلس قرار دی اور اس مجلس مین ان دونون صاحبون کو مرثیہ پڑھنے کا حکم ہوا ۔ میر صاحب نے کہا کہ مجھے مرثیہ پڑھنے مین کچھ عذر نہین ۔ کیونکہ ذاکر امام حسین ہون مگر عذر اس امر مین ہے کہ ذاکری کی حالت مین دربار کا حفظ مراتب مجھ سے نہ ہوسکے گا ۔ البتہ اپنی معمولی پوشاک سے حاضر ہوسکتا ہون ۔ میر انیس مرحوم کی یہ درخواست منظور ہوئی ۔ دیکھنے والے بیان کرتے ہین کہ جناب مرزا صاحب مرحوم قبائے درباری پر عمامہ باندھے تھے اور میر انیس مرحوم اپنے سادہ لباس پر پنجگوشہ ٹوپی پہنے تھے ۔ پہلے مرزا صاحب مرحوم منبر پر تشریف لے گئے اور حسب مقتضائے وقت بادشاہ کی تعریف مین کچھ نظم پڑھ کر مرثیہ شروع کردیا ۔ اس کے بعد جناب انیس مرحوم منبر پر تشریف لے گئے اور یہ سلام شروع کیا ۔

غیر کی مدح کرین شہ کے ثنا خوان ہو کـــر

مجرئی اپنی ہوا کھوئین سلیمان ہوکـــر " (۲)

---

(۱) حیات انیس (اشہری) ص ۲۵۱ ۔ شاہی مجلس کے عنوان سے سرورضا علی نے بھی اپنی سوانح عمری اعطالنامہ مین اس واقعہ کو نقل کیا ہے اور اس کی صحت کی تائید مین دلائل بھی دیے ہین مگر ان کی بڑی شہادت بھی اشہری ہی کا بیان ہے جس کی تردید خود اشہری نے کردی ہے ان کی باقی شہادتین بھی سنی سنائی پر مبنی ہین ۔ دیکھین الف یا صفحات ۲۵ تا ۲۸ ۔

(۲) واقعات انیس (مہدی حسن احسن) ص ۸۰ ۔ ۸۱

یون تو ان دونون روایات کی تفصیلات مین اختلاف ہی یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ یہ فرضی ہین اور خواہ مخواہ اپنے ممدوح کو بڑھانے اور اس کے مدمقابل کو گھٹا نے کے جذبہ کے تحت وضع کی گئی ہین ۔ اور اول الذکر روایت کی تردید تو راوی نے خود ہی کردی ہے مگر ان بنیادی حقائق کے علاوہ چند اور وجوہ بھی ہین جو انہین درست تسلیم کرنے مین مانع ہین :۔

۱) دونون اصحاب کے قدرشناس اپنے اپنے اور علیحدہ علیحدہ تھے ۔ سوائے اس واقعہ کے کوئی دوسرا واقعہ اس قبیل کا کسی تذکرہ مین نظر سے نہین گذرا جس سے یہ ثابت ہو کہ یہ دونون ارباب کمال کبھی کسی مجلس مین یکجا پڑھے ہون ۔ کیونکہ یکجا پڑھنے مین تقدم و تاخر کا مسئلہ بھی ضرور درپیش ہوتا کہ پہلے کون پڑھے اور بعد مین کون اور ظاہر ہے کہ دونون کے معتقدین اس پر کبھی راضی نہ ہوتے کہ ان کا ممدوح پہلے پڑھے(۱)

۲) ملکہ کشور میر صاحب کی معتقد تھین اور ملکہ زمانی مرزا دبیر کی ۔

۳) اگر میرانیس شاہ اودھ کی تحریف کو اتنا قابل اعتراض سمجھتے جتنا کہ بیان کیا گیا ہے تو وہ خود شاہ اودھ کی بجائے شان مین "نواب مبارک محل و ثانی مہم" نہ کہتے ۔ اور دکن مین بر سر دربار یہ رباعیان نہ پڑھتے :۔

اللہ و رسول حق کی امداد رہے	سرسبز یہ شہر فیض بنیاد رہے
نواب ایسا رئیس اعظم ایسے	یا رب آباد یہ حیدرآباد رہے

۲

موجود ہے جو کچھ جسے منظور ہے یان	علم و عمل و عطا کا دستور ہے یان
مختار الملک اور بندگان عالی	رحمت رحمت پہ نور پر نور ہے یان (۲)

---

(۱) لکھنئو کی آبادی دو جماعتون مین تقسیم ہوگئی تھی ۔ ایک جماعت انیسیون کی تھی اور دوسری دبیریون کی ۔ ایک ہی مجلس مین ان دونون صاحبان کمال کا پڑھنا ناممکن تھا ۔ پہلے پیچھے پڑھنے کی بحث کے علاوہ دونون فریقون کو اپنے اپنے مقتدی (ہیرو) کی مدح و ستائش مین اس قدر مبالغہ تھا کہ اگر میر صاحب اور مرزا صاحب ایک ہی مجلس مین اپنا اپنا کلام پڑھتے تو خونریزی کی نوبت یقینا" پہنچ جاتی ۔ اعمالنامہ مذکور ص ۲۲ ۔ ۲۳

(۲) واقعات انیس (مہدی حسن احسن) ص ۱۲۱ ۔

۲) شاہ اودھ کی موجودگی مین بر سر منبر میر صاحب کا اس قدر شدید ~~التعریض~~ تعریض کرنا ممکن نہین –

بہرحال جہان تک انیس و دبیر کے باہمی روابط کا تعلق ہے وہ ہمیشہ خوش گوار رہے – اس کی تائید مین بے شمار شہادتین پیش کی جاسکتی ہین – انیس کی وفات پر مرزا دبیر کا تاریخ کہنا اور ان کے جنازہ پرجاکر زار و قطار رونا[1] اس امر کی تائید مین سب سے بڑا ثبوت ہے – مندرجہ ذیل اشعار از محمد حامد علی خان حامد شاگرد امیر مینائی مرحوم جو انیس و دبیر کی وفات کے صرف چودہ سال بعد یعنی اپریل ۱۸۹۰ع مین لکھے گئے دونون کاملان فن کے باہمی تعلقات پر روشنی ڈالتے ہین :

جناب سلامت علی دبیر — کلیم سخن سرور شاعران
تھے ہم عصر اس کے جناب انیس — بلیغ اللسان اور فصیح البیان
تھے مانند شیر و شکر متحد — یہ دونون تھے دو قالب اور ایک جان
یہ دونون تھے باہم بڑے یار غار — بڑا اتحاد ان کے تھا درمیان
کہین شاعرانہ کوئی نوک جھونک — جو آئی سخن مین تو اے مہربان
کرو اس کو محمول بر اتحاد — نہ کچھ اور اس مین کرو این و آن (۲)

---

(۱) اودھ اخبارہ بابت پندرہ دسمبر ۱۸۷۴ع

(۲) قطعہ تاریخ از محمد حامد علی خان حامد مجموعہ مراثی دبیر جلد دوم بار پنجم مطبع نولکشور ۱۹۲۶ع

باب پنجم
(دبیر کا عالم ضعیفی)

الحاق اودھ اور اس کے تمدنی اور سیاسی اثرات

ارباب کمال کی زبون حالی اور پریشانی

دبیر کا کان پور اور عظیم آباد جانا

شاد عظیم آبادی کی شاگردی کا قصہ ۔ شاد کے اساتذہ ۔

آخری عمر میں صدمات نوجوان فرزند بھائی اور میر انیس کی وفات
اور اس کا دبیر پر اثر ـــــ

دبیر کی بصارت کا زائل ہوجانا اور بادشاہ کی طلب پر کلکتہ بغرض
علاج جانا ۔ واجد علی شاہ کی قدردانی ـــــ

میر انیس کی وفات پر قطعہ تاریخ

عظیم آباد میں آخری مجلس

وفات ۔ مشہور قطعات تاریخ مزار

اولاد

الحاق اودھ اور اس کے تمدنی اور سیاسی اثرات

واجد علی شاہ فرمانروائے اودھ اور ان کے زیر سایہ باشندگان لکھنؤ عیش و طرب کی محفلوں اور لطف و نشاط کے جلسوں سے بہرہ اندوز ہو رہے تھے کہ یکایک لورڈ [ڈلہوزی] نے ریذیڈنٹ کی رپورٹ پر فیصلہ کردیا کہ اودھ برطانوی ہند میں شامل کرلیا جائے ـ انگریزی فوج تیزی سے لکھنؤ میں آگئی اور خلاف توقع بادشاہ نے یہ حکم سنا کہ اس کی مملکت کو انگریزی محروسہ ممالک میں شامل کردیا گیا ہے اور اس کے لئے بارہ لاکھ روپیہ سالانہ اور جلوس لشکر کے لئے تین لاکھ روپیہ جو ہر طرح سے کافی سمجھا گیا ہے مقرر کردیا گیا ہے اور اب انہیں اجازت ہے کہ امور سلطنت کی فکر سے آزاد ہوکر داد عیش دیں ـ یہ سنتے ہی شہر میں سناٹا ہوگیا ـ کمپنی نے بغیر کسی مزاحمت کے اودھ پر قبضہ کرلیا ـ اور واجد علی شاہ کلکتہ روانہ ہوگئے ـ (1)

واجد علی شاہ کی خوش بختی تھی کہ ~~۱۲۶۸ ھ کے آخری ایام (مطابق~~ ۱۸۵۶ء) میں لکھنؤ چھوڑ کر چلے گئے ورنہ ان کا انجام بہادر شاہ ظفر سے مختلف نہ ہوتا ـ جس طرح میرٹھ وغیرہ کے فوجی دہلی پہنچے اور ظفر کو آگے لا لیا ـ بعینہٖ الہ آباد اور فیض آباد کے دستے لکھنؤ آئے اور شاہی خاندان کے افراد کے متلاشی ہوئے ـ جب اور کوئی نہ ملا تو واجد علی شاہ کے ایک دس سالہ نابالغ بچے برجیس قدر کو تخت نشین کیا اور ان کی ماں حضرت محل سلطنت کی مختار کل قرار پائیں ـ ریذیڈنٹ، مسٹر بیلی قلعہ بند ہوگئے اور جنگ آزادی کے پروانوں نے محاصرہ کرلیا ـ ہر طبقہ کے لوگ ان کے ساتھ شریک تھے ـ مگر حضرت محل کی نیک نفسی اور مستعدی کے باوجود ان میں تنظیم پیدا نہ ہوئی اور ابھی برجیس قدر کی تخت نشینی کو چھ سات ماہ بھی نہیں گذرے تھے کہ انگریزی فوج لکھنؤ پر دوبارہ قابض ہوگئی اب کے ان کے ساتھ پنجاب کے سکھ اور پٹھان کے پہاڑی تھے ـ شہریوں پر ظلم و ستم ڈھانے میں یہ دونوں افواج انگریزوں سے بھی چند قدم آگے تھیں ـ آبادی کو باغی افواج سے صاف کرنے کے لئے شہر پر سخت گولہ باری کی گئی ـ

---

(1) گذشتہ لکھنؤ (شرر) ص ۷۱ مطبوعہ نسیم بکڈپو لکھنؤ ـ

جس سے ساری آبادی گھبرا اٹھی ۔اور مرد عورتین شہر چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے ۔ محلون کے محلے اور خاندانون کے خاندان تباہ و برباد ہوگئے ۔(۱) مرزا دبیر نے اس حالت کو اپنی اس رباعی مین اس طرح بیان کیا ہے :۔

رباعــــی

کس عہد مین تبدیل نہین دور ہوا گہ عدل گہے ظلم گہے جور ہوا
ہے اللہ وہی ہے تو نہ مضطر ہو دبیر کیا غم جو زمین اور فلک اور ہوا (۲)

لکھنؤ سے مرزا صاحب بھی اس انتشار مین مع اہل و عیال سیتاپور پہنچے اور اپنے ایک دوست مولوی حاجی سید سلامت علی کے گھر مقیم ہوئے ۔ایک فقیرنی بڑھیا نے جس کے گھر مین بیٹھنے کے لئے منڈھا تک نہ تھا مجلس کی اور مرزا صاحب نے اسی بے سروسامانی کے عالم مین مرثیہ پڑھا ۔(۳) یہ رباعیان انہین کوائف کی علمبردار ہین :

شطرنج دورنگی سے ہین ششدر بندے آوارہ ہین شہر شہر در در بندے
اے بندہ نواز ہے یہ تعجب کا محل تو مالکِ ملک اور ہین بے گھر بندے

سیارے سے چشم مہربانی ہے اس دور مین دل بھی دشمن جانی ہے
مشکل ہے کہ ہاتھ آئے عنان آرام شبدیز فلک ستارۂ پیشانی ہے (۴)

قیامِ امن کے بعد مع اہل و عیال لکھنؤ مراجعت فرمائی ـــــ نہ وہ اب سرپرست تھے نہ قدردان سامان خانہ داری کے ساتھ اکثر مرثیے بھی تلف ہوگئے تھے ۔(۵) ایک سال بعد کان پور کے مشہور رئیس نواب دولھا صاحب کے بلاوے پر وہان تشریف لے گئے اور عشرہ محرم کی مجلسین پڑھین ۔(۶) یہ رباعی اس سفر کی یادگار ہے :

---

(۱) گلدستہ لکھنو مذکور

(۲) دفتر ماتم جلد ۲۰

(۳) حیات دبیر جلد ۱ ص ۱۰۱

(۴) دفتر ماتم جلد ۲۰

(۵) حیات دبیر جلد ۱ ص ۱۰۲

(۶) حیات دبیر مذکور دیباچہ سبع مثانی مین یہ واقعہ ۱۲۹۰ ھ کا بیان کیا ہے ۔

اس بزم مین ارباب شعور آئے ھین — یہ شیشہ ھین یا آینۂ نور آئے ھین
پڑھ مرثیہ لے داد سخن ان سے دبیر — کیا کیا حضرات کان پور آئے ھین

پھر اسی سال یا اس کے ایک سال بعد، سیدہ جلیلہ امام باندی بیگم نے دبیر کو عظیم آباد بلوایا — لکھنئو مین مرزا صاحب کی آمدنی کم ھوکر ایک سوبیس روپے ماھوار (سوروپیہ ماھوار وثیقہ حسین آباد + ۳۰ روپیہ ماھورا وثیقہ حسینیہ امام باڑہ میر باقر) اور ایک گاؤن و چند مکانون کا کرایہ رہ گئی تھی — جو ان کی ضروریات کے لئے ناکافی تھی — اس لئے عمر کی زیادتی کے باوجود یہ دعوت منظور کرکے سفر کی صعوبت برداشت کی[۱] — اسی سال میرانیس اور میرمونس بھی عظیم آباد تشریف لے گئے تھے[۲] — اور اھالیان عظیم آباد کو اپنے انکار سے سوگوار بناچکے تھے — اودھ اخبار کے شمارہ ۲۳ فروری ۱۸۷۵ع مین درج ھے کہ "اضلاع بشمول بہار مین سب سے زیادہ تعزیہ داری اور مجلس عزا پٹنہ مین ھوتی ھے — وھان کے ھندو اور مسلمان امیر اور غریب علی قدرِ ھمت جناب امام ۰۰۰ کے نام پر صرف کرتے ھین — چنانچہ امسال بھی عزہ محرم مین حسبِ دستور سالہائے گذشتہ مرزا دبیر اور میرمونس صاحب مجالس عزا مین ذکر مصائب سے مومنین کو رلا کر داخل ثواب کرتے ھین — اگرچہ عرصہ چند سال سے (انیس مرحوم) پٹنہ مین نہین آئے تھے لیکن اس پر بھی اعزۂ پٹنہ کو ان سے تعلق خاص تھا —[۳] مرزا صاحب مرحوم یکم محرم کو گلزار باغ پٹنہ مین زیب منبر ھوئے[۴] — اور انقلاب دھر کے مضامین کو اس طرح بیان کیا :—

جو پھول کبھی نہ بوستان سے نکلے — اس دور مین جور آسمان سے نکلے
صد شکر کہ شہر لکھنئو جنت تھا — آدم شعرے جو ھم جنان سے نکلے

---

(۱) حیات دبیر جلد ۱ ص ۱۰۳

(۲) حیات انیس (اشعری) ص ۳۱ —

(۳) اودھ اخبار شمارہ ۲۳ فروری ۱۸۷۵ع

(۴) حیات دبیر مذکور —

پہنچا جو کمال کو وطن سے نکلا　　قطرہ جو گہر بنا صدف سے نکلا

تکمیلِ کمال کی غریبی ہے دلیل　　پختہ جو ثمر ہوا چمن سے نکلا (۱)

عظیم آباد مین مرزا صاحب کی بے حد عزت ہوئی ـ چنانچہ وہ باشندگانِ شہر کے خلوص کا اظہار ان الفاظ مین کرتے ہین :

ایں شہر بخاطر ملولان شاد است　　معمورۂ خلق و حلم عقل و داد است

ہر فرد بشر دفتر خلق است دبیر　　این شہر ز اخلاق عظیم آباد است

---

(۱) اس رباعی کے متعلق واقعہ وصی بلگرامی خلف صفیر بلگرامی نے رسالہ ندیم گیا بہار نمبر جون ۱۹۳۵ ء مین اس طرح بیان کیا ہے :

" ... مرزا دبیر نے ایک دوسری رباعی امام باندی بیگم کے امام باڑہ مین پڑھی اس کا چوتھا مصرع تھا ـــ　　پختہ جو ثمر ہوا چمن سے نکلا

مطلب یہ کہ پھل جب تک لکھنؤ مین تھا خام تھا ـ خام کو پوچھتا کون ہے ؟ پھل جب پوچھنے کے قابل ہوا تو گاہک بھی دوڑا آیا ـ گاہک کون ـ کہ عظیم آباد ! اس گاہک کو دیکھو کہ ڈالی ہان ہان کرتی رہی اور یہ پھل توڑ ہی لایا ـ مگر اس کا رونا کیا ڈالی سے جدائی تو پھل کی قسمت مین ازل سے لکھی ہوئی ہے ـ

جس روز یہ رباعی گلزار باغ مین پڑھی گئی اسی روز سہ پہر کو بانکی پور مین چوہٹہ پر میر اسمعیل کے ہان مجلس تھی ـ مجمع تھا مگر مجلس شروع نہین ہوئی تھی ـ لوگ ابھی آرہے تھے ـ مجلس مین مرزا دبیر پر تبصرہ ہو رہا تھا ـ میرجان علی اصدق عظیم آبادی شاگرد نثارعلی وکیل عدالت باقر گنج نے کہا کہ ــــ صاحبو مرزا دبیر فرماتے ہین ـــ

پختہ جو ثمر ہوا چمن سے نکلا

سوال یہ ہے کہ چمن مین پھول ہوتا ہے یا پھل ؟ سب کے کان کھڑے ہوئے ـ ہر طرف سے آواز آئی کہ ــــ پھول ! پھول ! ! پھول ! ! ! ... مگر ایک اجنبی جو ابھی ابھی صحن مین داخل ہوا تھا بول اٹھا ــــ پھول بھی ـــ پھل بھی ! حضرت سودا فرماتے ہین ـــ

گل پھینکے ہین اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی

او خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی

اجنبی کو مجمع نے سر سے پاؤں تک دیکھا پوچھا کون ؟ اجنبی نے جواب دیا ـــ

انتخاب زمانہ ہون مین صفیر　　کہ وطن بلگرام ہے میرا

روسائے شہر مین سے دو نام خاص طور پر قابل ذکر ہین ـ ایک میر محسن صاحب اور دوسرے میر عباس صاحب ـ آخرالذکر شاد مرحوم کے والد اور اول الذکر چچا تھے ـ(۱) خود شاد مرحوم مرزا دبیر کے تلامذہ مین سے تھے اور ان کی شاگردی کو طرۂ امتیاز سمجھتے تھے ـ گو انہین انیس کے کلام سے رغبت تھی ـ(۲)

شاد عظیم آبادی کے اساتذہ | شاد صاحب کے ذکر کے ساتھ اس اختلاف کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے جو ان کے تلمذ کے بارے مین ہے ـ ہم نے انہین دبیر کے شاگردون مین شمار کیا ہے حیات دبیر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک وقت مین وہ دبیر سے منحرف بھی ہوگئے تھے مگر پھر ان کی شاگردی کو اپنے لئے باعثِ فخر و ناز سمجھنے لگے ـ

شاد صاحب کی مختلف تصنیفات کے مطالعہ سے روشن ہوتا ہے کہ ان کے تلمذ کے متعلق کچھ اختلاف ہے ـ دیوان کے اساتذہ کی فہرست خاصی طویل ہے ـ یہان اختصار سے ان کے اساتذہ کا ذکر کیا جاتا ہے ـ کیونکہ مفصل بحث کے لئے مقالہ کے اوراق متحمل نہین ہوسکتے ـ حیات فریاد مین شاد لکھتے ہین :

"یہی بنیاد و ابتدا راقم کی شاعری کی اور حضرت کے زمرۂ تلامیذ مین داخل ہونے کی شرفیابی کی ہے ـ اس دفعہ حضرت تنہا تشریف لائے تھے ـ پھر ایک عرصۂ دراز کے بعد ۱۸۶۲ع مین مع بیگم صاحبہ کے تشریف لائے ـ اس دفعہ تقریبا دو سال محلہ پھول گنج مین تشریف فرما رہے ـ راقم الحروف تقریبا " روزانہ سعادت و فیض صحبت و استفادہ حاصل کرنے کے لئے یا صبح کو یا تیسرے پہر کو حاضر خدمت رہا کرتا تھا ـ حضرت کا اردو دیوان جو خواجہ محمد شاہ شہرت صاف کرنے کے لئے لے گئے تھے اور دبا بیٹھے تھے وہ اسی سفر کا واقعہ ہے ـ دوسال پٹنہ مین قیام کے بعد حضرت نے کلکتہ مراجعت فرمائی ـ(۳) "

وصی بلگرامی نے نواب سید تجمل حسین خان المعروف سید سلطان مرزا سلطان عظیم آبادی کی تالیف مرقع فیض سے مندرجہ ذیل عبارت نقل کی ہے :

---

(۱) حیات دبیر جلد ۱

(۲) واقعات انیس (مہدی حسن احسن) ص ۵۹ ـ

(۳) حیات فریاد علی محمد شاد ص ۱۱۷ مطبوعہ مطبع معارف دارالمصنفین اعظم گڑھ

"شاد ــ سید علی محمد خلف مہین جناب میرعباس صاحب مرحوم رئیس حاجی گنج پٹنہ ــ یہ مولف تذکرہ کے بہت بڑے دوست لڑکپن کے ھین ــ اکثر شب و روز کی صحبت رہا کرتی تھی ــ ۱۲۸۰ ھ مین جناب سید محمد حسین خان عرف چھوٹے صاحب ھجرتی نے جب مرزا علی صاحب کے امام باڑہ مین مشاعرہ شروع کیا ــ اوس وقت میرعلی محمد صاحب کو شاعری کا شوق ھوا اور شاہ الفت حسین فریاد کے شاگرد ھوئے اور شاد تخلص مقرر کیا ــ

وہ مشاعرہ کوئی چھ سات مہینے رہا ــ اس کے بعد محرم وغیرہ کے سبب سے موقوف ھوا ــ اسی مشاعرہ مین حضرت صفیر بلگرامی مدظلہٗ بہ تحریک شاہ حفاظت حسین صاحب مظہرؔ آرہ سے تشریف لائے کہ شاہ صاحب انہین دنون آرہ مین جاکر حضرت کے شاگرد ھوچکے تھے ــ اور مظہر تخلص پاچکے تھے ــ المختصر جب ۱۲۸۱ ھ شروع ھوا تو بعد اربعین جناب حامد حسین صاحب نکہت نے کشمیری کوٹھی مین مشاعرہ بخاطر حضرت صفیر مقرر فرمایا کہ جناب ممدوح بھی انہین کے مکان مین قیام پذیر ھوئے تھے ــ اور دیوان صفیر بلبل چھپ چکا تھا ــ چنانچہ اسی کی ایک تاریخ میر علی محمد شاد کی بہ شاگردیٔ فریاد موجود ھے ــ غرض دوسرے مشاعرے مین میر علی محمد صاحب شاد بمعیت شاہ حفاظت حسین صاحب چار بجے دن کو میرحامد حسین صاحب نکہت کے مکان مین تشریف لائے اور باستعداد تمام جناب صفیر کے شاگرد ھوئے اور ۱۲۸۷ ھ تک یک قلم برابر تعلیم پائی ــ اور دور و نزدیک یعنی بذریعہ خطوط و ملاقات فیض پایا کئے اور عین مشاعرہ مین اصلاح لیا کئے اور شاعر کامل ھوگئے ــ" (۱)

شاد اور صفیر کی استادی شاگردی کے بارہ مین افضل حسین ثابت کی مندرجہ ذیل روایت جو "دربار حسین" مین بیان کی گئی ھے خاصی دلچسپ ھے :

"مرزا ادبیر مغفور اور آپ کے (شاد کے) عم بزرگوار اور پدر عالی وقار مین بے حد ربط تھا ــ مرزا صاحب مرحوم ۱۲۷۸ ھ؁ پہلی دفعہ جب عظیم آباد تشریف لائے تو جناب شاد اٹھارہ برس کے تھے ــ تین چار برس پہلے سے شعر کہتے تھے ــ جناب سید شاہ الفت حسین فریاد سے اصلاح لیتے تھے ــ پہلے پہل ۶۰ بند کا ایک مرثیہ کہا تھا ــ اپنے دلی شوق اور اپنے عم بزرگوار کے ارشاد سے جناب مرزا صاحب کے حضور مین اصلاح کے لئے پیش کیا ــ ممدوح نے دس بارہ بند پڑھواکر سنے اور فرمایا کہ پورب مین ایسی فصیح زبان

---

(۱) رسالہ ندیم گیا بہار نمبر ۱۹۳۵ع مضمون س ش ص (صفی بلگرامی)

نہایت محل تعجب ہے ۔بہت خوشی سے مرثیہ اصلاح کے لئے رکھ لیا ۔کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ دو برس تک اصلاح میں توقف ہوا ۔پھر مرثیہ پر اصلاح ہوئی ۔ (سنا ہے کہ) وہ مرثیہ بطور تبرک جناب شاد کے پاس اب تک موجود ہے "۔[1]

" جناب مرزا (دبیر) مرحوم کی صحبت میں بعض حضرات نے جناب میر انیس مغفور کے شعروں پر اعتراض کئے ۔جناب شاد نے جواب باصواب دیے ۔جناب مرزا صاحب اپنی خلقی نیکی اور انصاف سے برابر جناب شاد کے ہم زبان و موید رہے ۔مگر پھر لوگوں نے نہ جانے کیا جالگائی کہ آمدورفت میں کچھ کمی ہوتی گئی "۔[2]

"اسی زمانہ میں میر فرزند احمد صفیر بلگرامی مرحوم اور جناب شاد مظلہ مدظلہ کا جھگڑا پیش آیا ۔صفیر مرحوم کو دعویٰ تھا کہ شاد میرے شاگرد ہیں جناب شاد کو شاگردی سے انکار تھا اور شاید یہ صورت بیان فرماتے تھے کہ جناب شاد میر صفیر مرحوم کے کلام پر اور صفیر مغفور جناب شاد کے شعروں پر اعتراض کرتے تھے ۔جن کو سن کو ہر شخص بجائے خود اپنا کلام درست کرلیتا تھا "۔[3]

رسالہ ندیم گیا بہار نمبر ۱۹۳۳ ع (جولائی و اگست) سید عبدالحمید صاحب حمید بیان کرتے ہیں کہ شاد نے صفیر کی شاگردی سے قطعی انکار کیا ۔اور دو مزید اساتذہ کے نام گنوائے ہیں جن سے شاد کو شرف تلمذ حاصل تھا ۔ایک ناظر' وزیر علی عبرتی اور دوسرے مولانا میر تصدق حسین صاحب زخمی ۔[4]

لیکن بات یہاں ختم نہیں ہوجاتی ۔صفیر کے حامی وہ شاد کا مرثیہ پیش کرتے ہیں' جس پر صفیر کے ہاتھ کی اصلاح اور اکتالیس بند کا پیوند موجود ہے ۔اس کے علاوہ شاد کے تین خطوط بھی پیش کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں جن میں شاد نے صفیر کو استاد کے لقب سے مخاطب کیا ہے ۔[5]

---

(۱) دربار حسین (افضل حسین ثابت) ص ۷۴ ۔

(۲) ایضاً " ص ۷۵ ۔

(۳) ایضاً " ص ۷٦ ۔

(۴) مضمون شاد عظیم آبادی سید عبدالحمید حمید رسالہ ندیم گیا بہار نمبر ۱۹۳۳ ع

(۵) رسالہ ندیم گیا بہار نمبر ۱۹۳۳ ع مضمون سید عبدالحمید حمید ۔

صفیر اور شاد کی استادی اور شاگردی کا قصہ ہمارے موضوعِ بحث سے خارج ہے اور اگر یہ بھی ثابت ہوجائے کہ شاد نے کسی وقت صفیر کے سامنے فی الحقیقت زانوئے تلمذ تہ کیا پھر بھی دبیر اور شاد کے تعلقات میں کوئی نقصان نہیں پہنچتا کیونکہ صفیر بذات خود دبیر کے شاگردوں میں سے ہیں ـ

خود شاد نے اپنی اس گستاخی پر جو دبیر کی شان میں کبھی سرزد ہوئی تھی اپنی مختلف تحریروں میں اظہارِ ندامت کیا ہے اور ان کے کلام میں بیشتر مقامات پر دبیر کی تعریف میں اشعار ملتے ہیں ـ فکر بلیغ کے دیباچہ میں لکھتے ہیں :

مرا کو در مراثی اوستاد است | دبیر نکتہ رس قدسی نہاد است
ولے چون رہبر روحانیٔ من | انیس آمد کہ بودہ جانِ این فن
رضا[1] و ناخدا[2] ہے ہل و اسپار | یکے از اصفہان دیگر ز شیراز
بہ رویم صدو ر معنی کشادند | زبان پارسی را یاد دادند
زہے کالی چون استاد نامی | میان متدیان ذاتش گرامی
ازو آموختم یک چند پنکل | نمودم دقت گیتا از وحل

افضل حسین ثابت نے اپنی مختلف تصانیف میں شاد کے خطوط سے بہ آخرالذکر کی دبیر سے عقیدت کا ثبوت پیش کیا ہے اور مندرجہ ذیل اشعار نقل کئے ہیں :

یکتائے زمان تھے مرے استاد دبیر | کرتا ہوں میں جان و دل سے ان کی توقیر

ایسے استاد سے ذرا بھی اکراہ | واللہ کہ اک طرح کا قوی ہے گناہ
میں اور دبیر کی برائی تو بہ | لاحول ولا قوۃ الا باللـــــــــہ

اے شاد ! دبیر کی بھی خدمت میں رہا | موجود انیس کی بھی صحبت میں رہا
حاضر رہا جتنی دیر دونوں کے حضور | واللہ کہ اتنی دیر جنت میں رہا (۳)

---

(۱) (۲) ـ حاجی محمد رضا اصفہانی و ناخدائے شیرازی یہ دونوں بزرگ میرزا حبیب قاآنی کے ہم مشاعرہ تھے اور عظیم آباد میں دس برس تک مقیم رہے ـ

(۳) دربار حسین ص ۷۷ (افضل حسین ثابت) ـ

الغرض شاد نے دبیر سے اپنے سلسلۂ تلمذ کو اپنے لئے باعث فخر سمجھا مگر یہ نہین کہاجاسکتا کہ سوائے مرثیہ مابہ النزاع کے اور کلام بھی مرزا صاحب کی خدمت مین بغرض اصلاح پیش کیا ہو ـ مگر شاد کی غزلیات مین جوزبردست اخلاقی شاعری کی جھلک نظر آتی ہے کیا تعجب ہے کہ اس کی تعمیر مین فرہاد کے علاوہ دبیر کے فیض صحبت کا ہاتھ بھی ہو ـ

زندگی کے آخری ایام | مرزا دبیر اپنی زندگی کے آخری ایام مین مختلف مصائب اور صدمات کا شکار رہے ـ موت سے تقریباً " دو سال قبل ۱۲۹۰ ھ مین نوجوان فرزند محمد حسین عطارد عین عالم شباب یعنی بیس سال کی عمر مین قضا کر گئے (۱) نورنظر کی وفات کے ساتھ نور بصارت سے بھی محروم ہوگئے ـ اب یہ حالت ہوگئی تھی کہ اگر رات کو کوئی کلام موزون ہوتا تو کسی کو جگاکر لکھوانے سے گریز کرتے اور صبح جاگنے پر اگر یاد کرنے کی کوشش کرتے تو حافظہ ساتھ نہ دیتا (۲)

سفر کلکتہ | ۱۲۹۰ ھ کے آخر مین مرزا صاحب اپنی آنکھون کے علاج کے لئے کلکتہ تشریف لے گئے (۳) افضل حسین ثابت نے حیات دبیر مین اس واقعہ کو اس طرح بیان کیا ہے :-

" سنا ہے کہ کلکتہ مین کوئی جرمن ڈاکٹر آیا تھا جو آنکھین بناتا تھا اور وہ شیا برج مین بادشاہ اودھ کا مہمان تھا ـ شاہ اودھ (واجد علی شاہ مرحوم) کے اشارے سے ان کے کسی رفیق نے مرزا صاحب کو لکھا کہ اگر آپ یہان تشریف لے آئین تو آپ کی آنکھین بن جائین ـ بادشاہ اودھ کی بھی یہی خواہش ہے ـ مرزا صاحب کلکتہ شیابرج مین پہنچ کر بادشاہ کے مہمان اور نواب مونس الدولہ کی کوٹھی مین مقیم ہوئے ـ عرضداشت اطلاعی

---

(۱) تاریخ وفات از حکیم میر علی : ہاتفے گفتہ است دوش بمن
جمادی الاول ۱۲۹۰ ھ (دیباچہ سبع مثانی) شد عطارد مکین بیت نعیم
۱۲۹۰ ھ

(۲) حیات دبیر ـ

(۳) اودھ اخبار مورخہ ۱۲ مارچ ۱۸۷۵ء مین جو حالات مرزا دبیر کے شائع ہوئے ہین ان مین نیز مولف حیات دبیر نے یہ واقعہ ۱۲۹۰ ھ کے آخری دن (۲۹ ذی الحج) کا ہے ـ دبیر نے جو عود بصارت کی تاریخ کہی ہے اس سے ۱۲۹۱ ھ برآمد ہوتے ہین ـ لہذا یہ ثابت ہوتا ہے کہ ۱۲۹۱ ھ مین دبیر کلکتہ موجود تھے چونکہ یہ واقعہ انیس کی وفات سے قبل کا ہے اس لئے شمس الضحی کے ضمیمہ مین مندرجہ تاریخ ۲۹ ذوی الحج ۱۲۹۱ ھ غلط ہے ـ ۲۹ ذوی الحج ۱۲۹۰ ھ ہونا چاہئے تھا غالبا سہو کتابت ہے ـ

شاہ جم جاہ کی خدمت مین بھجوائی ۔بادشاہ مرحوم نے اس عرضداشت کو ان الفاظ و دستخط خاص سے مزین فرمایا ؎

گر بہر سرو چشم من بیائی   برقلب نہم کہ کیمیائی [(۱)]

جب مرزا صاحب پہنچے جس مکان مین ٹھیرے ٹھہرے تھے اس کے دوسرے درجے تک واجد علی شاہ آئے اور استقبال کر کے لگئے اور اس قدر تعظیم و تکریم فرمائی کہ جیسے کوئی برابر والے کی عزت و توقیر کرتا ہے [(۲)] اور مجلسِ عزا مین خود بادشاہ نے مرزا صاحب کی موجودگی مین بر سر منبر مرزا صاحب کی مدح مین تقریبا " پچھس بند پڑھے ۔یہ ٹیپ بہت مشہور ہے ؎

بچپن سے ان کے دام سخن مین اسیر ہون

مین کم سنی سے عاشقِ نظم دبیر ہون [(۳)]

اس پر مرزا صاحب نے کھڑے ہوکر یہ مصرعہ پڑھا ؎

تعظیمِ کلام کو دبیر اٹھا ہے

شاہ اودھ نے فرمایا آپ بیٹھ جائین اور بعد خاطرداری بے شمار پانچ سو روپے بطور دعوت عطا فرمائے [(۴)] مرزا صاحب کی آنکھون کا اپریشن ڈاکٹر مذکور نے کیا اور بصارت عود کر آئی تو مرزا صاحب نے تاریخی رباعی کہی :-

امداد علی گاہ خفی گاہ جلی ست   برمن ز ازل عین عنایات ولی ست

۵۰

چون مادہ دفع شد بگفتم تا ریخ   چشم بد دور عین اعجاز علی ست

۱۲۹۱ ھ

برادر اکبر کی وفات کلکتہ سے مراجعت کے تھوڑے عرصہ بعد مرزا صاحب کے بڑے بھائی مرزا غلام محمد صاحب نظیر ۲۸ صفر ۱۲۹۱ ھ کو انتقال کر گئے ۔یہ باوجود عمر مین بزرگی کے مرزا صاحب کے تقدس و کمال کی وجہ سے ان کا بے حد ادب کرتے تھے ۔ابتدا مین یہ بھی میر ضمیر کے حلقۂ تلامیذہ مین شامل تھے مگر جب دبیر کا ستارہ افقِ شہرت پر چمکا تو اپنے چھوٹے بھائی سے مشورہ سخن کرنے لگے تھے [(۵)]

---

(۱) حیات دبیر جلد ۱ ص ۹۹ و اودھ اخبار مذکور

(۲) اودھ اخبار مذکور ۔

(۳) حیات دبیر ۔

(۴) اودھ اخبار مذکورھ

(۵) حیات دبیر ۔

انیس کی وفات ابھی یہ صدمات تازہ ہی تھے کہ ان کے حریف اور مدمقابل میرانیس نے ۱۰ دسمبر ۱۸۷۴ء مطابق ۲۹ شوال ۱۲۹۱ھ بروز جمعرات وفات پائی۔[1] مرزا دبیر کو اس کا اس قدر صدمہ ہوا کہ ان کی نعش پر جاکر بہت روئے اور فرمایا کہ ایسے معجز بیان فصیح اللسان قدردان کے اٹھ جانے سے اب کچھ لطف نہ رہا۔[2]

مولف حیات دبیر لکھتا ہے :

" مرزا صاحب نے خونِ جگر سے رنگین ایک تاریخ وصال میر صاحب کی لکھی اور میرباقر تاجر مرحوم کے امام باڑہ مین پڑھی تھی اگر میری یاد غلطی نہین کرتی تو مرزا صاحب تاریخ کے اشعار پڑھتے جاتے تھے اور آنکھون سے ٹپ ٹپ آنسو گرتے جاتے تھے۔[3]

لیکن مولف موصوف کا مندرجہ بالا بیان قابل اعتنا نہین۔ اس لئے کہ میر صاحب کی وفات کے وقت افضل حسین ثابت (مولف حیات دبیر) کی عمر چھ سال کے قریب بنتی ہے[4]۔ اور اس عمر مین اس قدر تمیز ممکن نہین کہ فارسی قطعہ تاریخ سن کر اس کی غرض و غایت سمجھ لی جائے۔ اگر مجلس مذکور مین ثابت کی موجودگی تسلیم بھی کرلی جائے پھر بھی محض ان کی شہادت پر یہ تسلیم کرلینا ممکن نہین کہ دبیر نے اس مجلس مین قطعہ تاریخ وفات میر انیس پڑھا ہوگا تاوقتیکہ کسی دوسرے ذریعہ سے اس کی تائید نہ ہو۔

۹ فروری ۱۸۷۵ء کے اودھ اخبار مین کسی شخص کا ایک طویل مراسلہ چھپا ہے۔ مگر مراسلہ نگار نے اپنا نام ظاہر نہین کیا۔ مراسلہ مذکور مین دبیر کا مندرجہ ذیل قطعہ تاریخ وفاتِ میر انیس درج ہے اور اس پر اعتراضات کئے گئے ہین :

---

(۱) اودھ اخبار شمارہ ۱۵ دسمبر ۱۸۷۴ء مطابق ۲ ذی قعدہ ۱۲۹۱ھ بروز سہ شنبہ یہ خبر شائع ہوئی اور بتایا گیا کہ گذشتہ پنجشنبہ کو یہ حادثہ ہوا۔ آب حیات اور اس کے حوالے سے حیات انیس مین ۱۲۹۲ھ درج ہے جو غلط ہے۔ واقعات انیس مین لکھا ہے کہ انیس ۲۲ رمضان ۱۲۹۱ھ کو درد سر اور تپ مین مبتلا ہوئے اور ۲۹ شوال بروز دوشنبہ انتقال کیا۔ یہان تاریخ درست ہے البتہ یوم غلط (واقعات انیس مہدی حسن احسن ص ۱۲۶ ص ۱۲۸)۔

(۲) اودھ اخبار مذکور۔

(۳) حیات دبیر جلد ۱ ص ۱۰۷۔

(۴) فرہنگ عامرہ مین ثابت کی تاریخ پیدائش درج ہے دیکھین ضمیمہ فرہنگ

داد خواہم یاغیاث المستغیثین الغیاث
از کہ دل مانوس گردد بے سخن در بے انیس
را درپنا عینی و دینی دو بازوئم شکست
بے نظیر اول شدم امسال و آخر بے انیس
یادگار رفتگان هستیم و مهمانِ جهان
چند روزہ چند هفته بے برادر بے انیس
الوداع اے شوق تصنیف الفراق اے ذوق نظم
شد حواس خمسه و دہ عقل ششدر بے انیس
بسکه در بزمم بسوزد داغ غم بالائے داغ
هست جز طاؤس دل پروانه دیگر بے انیس
سوخته آتش بردلِ یاران مگر جائے سپند
نالۂ آهسته می آید ز مجمر بے انیس
اشک را ربطے بد امن بود لیکن اشکِ ما
رفته رفته رفت تا دامان محشر بے انیس
تازہ مضمون نظم می فرمود در هر بحر شعر
چشمۂ چشمم بود ہم چشمِ کوثر بے انیس
سال تاریخش بزبر و بینه شد زیب رقم
طور سینا بے کلیم الله و منبر بے انیس

مذکورہ بالا اشعار کے علاوہ چار مزید اشعار حیات دبیر (افضل حسین ثابت) و شمس الضحیٰ[۱۰] (میرصفدر حسین) مطبوعه مطبع حسینی اثنا عشری لکھنئو ۱۲۹۸ ھ مین منقول هین مگر اخبار مذکور مین درج نهین هوئے ہے۔

عبرة" الناظرین گردید افلاک و زمین
دیدنی نبود مه و خورشید و اختر بے انیس
پوست کندہ موشگافان سخن گویند حیف
هر سر مو پرزرگ جانست نشتر بے انیس
در سنین عیسوی تاریخ گفتم صاف صاف
گرچه طبعم بود محزون و مکدر بے انیس

آسمان ہے ماہ کامل سدرہ ہے روح الامین
۹۲۹
طور سینا ہے کلیم اللہ و منبر ہے انیس

میزان ۹۲۵ ۱۸۷۲ع

پہلا شعر نمبر ۲ پر دوسرا نمبر ٦ پر اور آخری دو اشعار آخر مین دیے گئے ہین —

واقعات انیس مین لکھا ہے " سب سے زیادہ جس تاریخ کو شہرت ہوئی وہ جناب مرزا دبیر مرحوم کی تصنیف ہے اور اس کا مادۂ مصرعہ یہ ہے

طور سینا ہے کلیم اللہ و منبر ہے انیس

پوری تاریخ، کلیات مطبوعہ مرزا صاحب مین موجود ہے*۔ اس مادہ مین مرزا صاحب مرحوم نے صنعتِ زبر و بینہ کا دعوی کیا ہے مگر اکثر گروہ شعراء کو اس مین کلام ہے کیونکہ زبر و بینہ کے قاعدے سے سن مقصود کا استخراج نہین ہوتا ۔ مرزا صاحب کے صاحبزادے نے اپنی تصنیف مقیاس الاشعار مین تاویل " صحیح کی ہے مگر واقفان فن کی تسلی نہین ہوئی ۔[1]

افضل حسین ثابت نے اپنی تالیفات مین سن مطلوب اس مادہ تاریخ سے اس طرح استخراج کیا ہے :۔[2]

	بینہ	زبر	زبر و بینہ	بینہ	زبر	بینہ	زبر
	انیس	منبر ہے	و	اللہ	ہے کلیم	سینا	طور
میزان ۱۲۹۱ ھ	۲۲۷	۳۰۲	۱۳	۱۹۳	۱۱۲	۲۲۷	۲۱۵

راقم الحروف نے مندرجہ بالا استخراج کو اس عہد کے ماہر تاریخ گو جناب پروفیسر حامد حسن صاحب قادری کی خدمت مین ارسال کیا اور موصوف سے اس کی صحت و عدم صحت کے بارہ مین استصواب کیا ۔ پروفیسر صاحب کا جواب بجنسہ درج ذیل ہے :۔

---

(۱) واقعات انیس (مہدی حسن احسن) ص ۱۲۸ ۔ ۱۲۹

(۲) حیات دبیر جلد دوم حصہ اول ص ۱۲ (طبع اول ۱۹۱۵ع) و دیباچہ سحر شاہی ۔

* حقیقت یہ ہے کہ یہ قطعہ تاریخ کلیات مرزا دبیر مین موجود نہین ۔

دیر کی تاریخ انیس کا مین کئی سال پہلے بھی حساب لگا چکا ہون۔کس طرح ٹھیک نہین بیٹھتی ـ خدا جانے کس طرح نکالی ہے ـ آپ نے خوب الفاظ و اعداد مرتب کرلئے ـ لیکن یہ اصول مرتب کئے مثلاً (بے نہ) ایک الگ لفظ ہے اگر وہ مل سکتا ہے تو بعد کے لفظ سے مل سکتا ہے لیکن آپ نے ایک جگہ تو ' بےکلیم' لیا اور دوسری جگہ 'منبربے' لے لیا یہ 'منبربے' کیا چیز ہوئی ؟ 'بے کلیم' تو ایک بامعنی بات تھی، دونون جگہ یکسان ہونا چاہئے ـ

اس کے علاوہ کہین کہین بینہ کے اعداد مین آپ نے غلطی کردی ہے ـ زبر کہتے ہین کسی حرف کے حروف باطنی مین صرف پہلے حرف کے اعداد کو، بینہ حروف باطنی کے پہلے حرف کو چھوڑ کے باقی کے اعداد لینا ـ

آپ نے لکھا ہے ـ بینہ سینا = ۲۲۷ لیکن حرف اول (س) کو چھوڑ کر باقی $\frac{\text{یا}}{۱۱}$ $\frac{\text{نون}}{۱۰۶}$ $\frac{\text{الف}}{۱۱۱}$ کے اعداد لئے جائین تو یہ آپ کے (۲۲۷) نہین بلکہ (۲۲۸) ہون گے ـ

اس طرح الله کے بینہ اعداد آپ نے (۱۹۳) لئے ہین حالانکہ $\frac{\text{لام}}{۷۱}$ $\frac{\text{لام}}{۷۱}$ $\frac{\text{ہا}}{۶}$ کے ۱۴۸ ہوتے ہین ـ

اس کے علاوہ تاریخ مین اس کا کہین تذکرہ نہین کہ ایک لفظ کے زبر اور ایک کے بینہ لئے جائین ـ جیساکہ آپ نے کیا ہے ـ آپ کو تاریخ گوئی کا ماہر و کامل استاد ملے تو اس سے دریافت کیجئے ـ میری عقل تو قاصر ہے ـ والسلام

احقر حامد حسن قادری "

موضوعِ بحث، قطعہ تاریخ کے نہ صرف "مادۂ تاریخ" ہی پر اعتراضات کئے گئے بلکہ قطعۂ تاریخ مین بے شمار اغلاط ظاہر کی گئی ہین(1) ـ مثلاً" دوسرے شعر کا قافیہ آخِر، بالکسر خا ہے حالانکہ باقی قوافی مفتوح ہین اور اگر بالفتح خا پڑھا جائے تو معانی غلط ہوجاتے ہین ـ چوتھے شعر کا پہلا مصرعہ ساقط الوزن ہے ـ چھٹے شعر مین نالۂ آمعتہ

---

(۱) مثلاً " دیکھئے رسالہ ملہم تاریخ سید اقتدار احمد ساحر مطبع العلوم مرادآباد ـ

کی ترکیب ھندی طریقہ سے وضع شدہ ھے ۔آٹھوین شعر مین " ھر بحر شعر " کی ترکیب بےمعنی ھے آخری شعر مین " شد زیب رقم " تاریخ وفات کے لئے غیرمناسب ھے اس کے علاوہ سارے کے سارے قطعہ مین کہین شاعر نے اپنے لئے صیغہ واحد متکلم استعمال کیا ھے اور کہین جمع متکلم ۔ اور سب سے بڑھ کر‘ جیساکہ پہلے واضح کیاجاچکا ھے‘یہ ھے کہ مادہ زیربحث سے بحساب زبر و بینہ تاریخ وفات میر انیس بھی برآمد نہین ھوتی ۔ حیرت ھے کہ ایسا کلام مرزا صاحب جیسے پختہ گو شاعر سے منسوب کیسے ھوگیا ۔

لیکن اس کے برعکس مطلع اور ان چار اشعار کے خلاف جو ثابت نے حیات دبیر مین دیے ھین اس قسم کا کوئی اعتراض وارد نہین ھوتا ۔آخری شعر سے تاریخ وفات بھی نکلتی ھے آخری شعر کے دونون مصرعون مین باھم ربط بھی ھے اور کلام بھی اس شان کا ھے کہ مرزا صاحب کے پایہ کے شاعر کی طرف منسوب کیاجاسکے ۔ اس سلسلہ مین مندرجہ ذیل نکات خصوصی توجہ کے مستحق ھین :۔

۱) یہ قطعہ تاریخ مرزا صاحب کے کلیات (دفتر ماتم) مین موجود نہین ۔

۲) اس کی سب سے پہلی اشاعت اودھ اخبار شمارہ ۹ فروری ۱۸۷۵ع مین کسی ایسے شخص کی طرف سے ھوئی جس نے اپنا نام ظاھر کرنا مناسب نہین سمجھا اور اس پر اعتراضات کئے ۔

۳) یہ وہ ایام ھین جب کہ مرزا صاحب بیمار ھین اور لکھنئو سے باھر عظیم آباد مین محرم کی مجالس کے سلسلہ مین گئے ھوئے ھین ۔اپنی موت سے صرف چند دن پیشتر عظیم آباد سے واپس آئے جبکہ مرض الموت مین مبتلا تھے ۔اگر ایسا نہ ھوتا تو ممکن تھا کہ وہ اس امر کا اعلان کردیتے کہ یہ قطعہ کلی یا جزوی طور پر ان کی طرف غلط منسوب کیا گیا ھے ۔

۴) یون معلوم ھوتا ھے کہ ان کی وفات کے بعد ان کے معتقدین نے اس قطعہ کی حمایت ضروری سمجھی اور اسے ھر لحاظ سے درست ثابت کرنے کی کوشش کی ۔جذبات عقیدت کے زیر اثر انھون نے یہ معلوم کرنے کی کوشش ھی نہ کی کہ عین ممکن ھے کہ قطعہ تحریف شدہ یا جزوی طور پر غلط ھو ۔

گو آج وہ ذرائع مفقود ھین جن کی روشنی مین صحیح نتائج اخذ کئے جائین مگر اس قدر یقینی ھے کہ اس قسم کی اغلاط جو اس قطعہ مین موجود ھین مرزا صاحب کے پایہ کے شاعر سے سرزد ھونا ممکن نہین ۔جن کی علمیت اور شاعرانہ قدرت کے دشمن بھی معترف ھین

اور پھر یہ ان کے آخری ایام کی نظم ہے، جبکہ مشق اور تجربہ اپنے انتہائی عروج پر تھے ـ یہی کہا جا سکتا ہے کہ انیس کی وفات پر دبیر نے قطعۂ تاریخ ضرور کہا ـ جس مین وہ مادۂ تاریخ اور چند اشعار شامل تھے جو اودھ اخبار مین تو نہین مگر حیات دبیر مین منقول مین معترض مذکور کو قطعۂ زیر بحث، اس کی اصلی صورت مین نہین پہنچا بلکہ اس نے اسے کہین سے مسخ شدہ صورت مین سنا اور شائع کروادیا ـ بدقسمتی سے یہ سب کچھ ان ایام مین ہوا جبکہ دبیر کے پاس نہ تو مہلت تھی نہ ہمت کہ وہ اس کی تردید یا تائید مین کچھ کہین اس طرح یہ جھگڑا باقی رہ گیا ـ

اگرچہ صاحب ملہم تاریخ نے بھی یہ دعویٰ کیا ہے کہ انھون نے اخبار اودھ کے مطالعہ کے بعد اس موضوع پر مرزا صاحب کو خط لکھا اور جواب بھی موصول ہوا مگر ان کا بیان بھی مندرجہ ذیل وجوہات کی بنا پر چندان قابل توجہ نہیں :-

۱) انھون نے وہ جواب نقل نہیں کیا جو مرزا صاحب کی طرف سے انہین موصول ہوا ـ اگر فی الواقع کوئی ایسا جواب تھا تو اسے نقل کرنے مین کیا تامل تھا ؟

۲) دبیر تو ابتدائے محرم سے لکھنؤ موجود ہی نہ تھے یعنی یہ قطعہ ان کی لکھنؤ سے غیرحاضری مین طبع ہوا ـ صاحب ملہم تاریخ نے خط کہان لکھا ہوگا ؟ اور اگر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ فی الواقع صاحب ملہم تاریخ کا خط مرزا صاحب کو مل گیا تھا تو انہین ہوش کب تھا کہ جواب دیتے ؟

راقم الحروف کے خیال مین مادہ تاریخ پورے شعر مین اور سن عیسوی مین ہے جو کہ حیات دبیر مین منقول ہے فہوا ھذا ؎

آسمان بے ماہ کامل سدرہ بے روح الامین　　طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس

حضرت مرزا صاحب کے خاندان سے تصدیق کرنے پر بھی میرے خیالات کی تائید ہوئی ـ اس قطعہ کے بیشتر اشعار الحاقی ہین ـ

وفات | انیس کے انتقال کے بعد دبیر صرف تین ماہ اور ایک دن زندہ رہے اور اس دوران مین بھی برابر علیل رہے ـ بیماریٔ مرگ کے واقعات اس طرح ہین

سیدہ جلیلہ امام باندی بیگم صاحبہ کے اصرار سے اس سال (۱۲۹۲ ھ) مین دبیر پھر عظیم آباد محرم کی مجالس مین شرکت کے لئے گئے ـ(۱) بہتر سال کا سن تھا ـ طاقت

---

(۱) حیات دبیر ص ۱۲۸ ـ

جواب دے چکی تھی اس لئے مجالس مین مرزا اوج ھی پڑھتے رھے ۔ مرزا دبیر خاموش بیٹھے رھتے ۔ نوین محرم کو شائقین و سامعین بہت جمع ہوگئے اور انھون نے مرزا صاحب کو مجبور کیا تو انھون نے ایک طویل مرثیہ بہت زور شور سے پڑھا ۔[۱] اسی وقت اختلاج قلب شروع ہوگیا ۔ ویل پر اپنے گھر آئے ۔ دس دن تک نہایت علیل رھے اور بعمر ۲۹ محرم کو وفات پاگئے ۔[۲] جب انتقال کا وقت آیا تو پانچ بجے صبح کو نماز پڑھی اور حال ابتر ہونے لگا ۔ اس وقت میان اوج نے پوچھا کہ مجھ کو کس کے سپرد کیا، فرمایا تمھین خدا کو سونپا اور انتقال کیا ۔[۳]

دن مین جنازہ اٹھا ۔ دریا پر غسلِ میت کے لئے جنازہ کولے گئے ۔ ہزارون آدمی ھمراہ تھے اور مرحوم کی یہ رباعی پڑھ رہے تھے ۔

رحمت کاتری امیدوار آیا ہون | منہ ڈھانپے کفن سے شرمسار آیا ہون
چلنے نہ دیا بار گنہ نے پیدل | تابوت مین کاندھون پہ سوار آیا ہون

سید ابراھیم صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی اور اپنے گھر ہی مین دفن ہوئے ۔ اس مقبرہ پر ایک چھوٹا سا مکان ھے ۔ اکثر لوگون نے از راہ قدردانی اس پر شاندار مقبرہ بنانے کی خواھش کی یا رقوم بطور مدد عطا کرنی چاھین، مگر مرزا اوج نے بموجب وصیت دبیر مرحوم قبول نہ کیا ۔[۴] وہ گلی جس مین مرزا کا مزار ھے اب کوچۂ دبیر کہلاتی ھے اور محلہ نخاس

---

(۱) حیات دبیر مین صرف چند رباعیات اور چند بینیہ بندون کا پڑھنا لکھا ھے مگر اودھ اخبار کا بیان زیادہ قدیم ہونے کی وجہ سے درست سمجھا گیا اور وھین سے یہ حالات لئے گئے ۔

(۲) اودھ اخبار مذکور ۔ حیات دبیر مین ۳۰ ماہ محرم قریب صبح صادق لکھا ھے اور مرض الموت قدم کبد تحریر کی ھے ۔

(۳) اودھ اخبار شمارہ ۱۰ مارچ ۱۸۷۵ع مین مرزا دبیر کی وفات کو ان الفاظ مین بیان کیا گیا ھے ۔ جناب مرزا دبیر کی وفات ھیھات ھیھات ھیھات ھیھات صد ہزار حیف کہ اقلیم سخن لٹ گئی ۔ آفتاب کمال غروب ہوگیا ۔ مرثیہ گوئی کا خاتمہ بالخیر ہوا یعنی افصح الفصحا بلیغ البلغا زبان طوطیٔ ھندوستان شاعر بے نظیر جناب مرزا دبیر نے وقف اندوہ انیس ہوکر شمع سامان اپنے جسم ناتوان کو گھلا دیا اور آخر کار چند روز بے آب و دانہ رہ کر امراض کبد وغیرہ مین اس عندلیب معانی نے گلزار قدس کا رستہ لیا ....

(بقیہ حاشیہ برصفحہ آئیندہ)

(لکھنئو) مین واقع ھے ۔اب بھارت کی حکومت کا محکمہ آثار قدیمہ اس مقبرہ کی طرف توجہ ھو رہا ھے ۔[1]

دنیا کا عجب کارخانہ دیکھا کس کس کا نہ یان ھم نے زمانہ دیکھا

ہر سون رہا جنکے سرون پہ چترزرین تربت پہ ۸ نہ ان کی شامیانہ دیکھا

چند قطعات تاریخ وفات دبیر

از قلم عبدالعلی صاحب آسی مدراسی (۲)

اے وائے بے نظیر نہ ماندہ دبیر نیز ھم از پس انیس شدہ انتقال او

صد حیف و صد دریغ و صد افسوس و صد الم ہناخن زنست بزرگ دلہا ملال او

بے او کمال مرثیہ گوئی ست در زوال بود آبروئے نظم زحسن مقال او

گر بیمر چرخ چرخ زند صد ھزار سال در عالم مثال نیارد مثال او

متن فضائلش نبود زیر بار شرح چون مہر روشنست بعالم کمال او

چون از غم شہادت سبطین ذوق داشت ماہ محرم آمدہ آخر مآل او

(حاشیہ گذشتہ سے پیوستہ)

اس واقعہ حسرت ناک سے تمام لکھنئو مین کہرام مچا ھے ھر کہ و مہ کی جان پر وہ سخت صدمہ ھے جس ھے جس کا بیان قلم اندوہ رقم سے نہین ھوسکتا ... تمام عائد و امرا اور ھزارہا اشخاص لکھنئو کے اس خبر وحشت اثر کو سن کر جوق جوق جناب مغفور کے مکان پر چلے آتے ھین روتے ھین پیٹتے ھین اور چلاتے ھین ۔اخبار اودھ شمارہ ۱۰ مارچ ۱۸۷۵ع

(۲) اخبار مذکور شمارہ ۱۲ مارچ ۱۸۷۵ع

---

(۱) سالک مسلک دبیر جناب سید سرفراز حسین صاحب خبیر شاگرد مرزا اوج کا گرامی نامہ راقم الحروف کے نام۔

(۲) عبدالعلی صاحب آسی فرقۂ احناف کے معزز علما مین سے تھے جو اعتراضات قطعہ تاریخ وفات میرانیس پر کئے گئے تھے ان کا جواب بھی لکھا تھا یہ قطعہ تاریخ ۱۹ مارچ ۱۸۷۵ع کے اودھ اخبار مین چھپا ۔

(۱)
پرسیدم از دبیر فلک سال رحلتش پیوسته آن به رحمت حق گفت سال او

اسی شمارہ مین دو اور قطعات تاریخ چھپے ۔پہلا سید ھدائت اللہ خان صاحب ھدا
(۲)
(نبیرہ سید حکیم ماشاء اللہ خان) کا ھے اور دوسرا منشی محمد مرزا جان صاحب کا ھے
اول الذکر نے مرزا کو سسرال کی طرف سے قرابت بھی تھی ان کا قطعہ تاریخ درج ذیل ھے

وا دریغا از فضائے آسمان درھم شکست
رنگ بزم ماتم آل پیمبر بے دبیر
حیف آن شیرازہ بند مجمع احباب رفت
دفتر مجموعہ ماتم شد ابتر بے دبیر
مرگ خلاق مضامین انتقال شاعریست
جان ھر مضمون نو گردیدہ مضطر بے دبیر
بستہ باب بدۂ فیاض منشی قدر
خاک برسری فشاند ھر سخنور بے دبیر
ماہ چون کاھ خورشید دل سرد از صبح وصال
آتشی در سینہ دارد مھر انور بے دبیر
چاک جیب صبح شد از پنجۂ خورشید غم
شب سیاہ معجز زماتم کرد برسر بے دبیر
برفلک گریان نالان و مردم بر زمین
گشت برپا در دو عالم شور محشر بے دبیر
صفحۂ چرخ از سواد ماتمش از بس سیاہ
نقطہ غم در نظر آید ھر اختر بے دبیر
صورت بسمل تپان اھل عزا در ماتم اند
ھر نفس در سینہ ھا صد ضرب خنجر بے دبیر

---

(۱) مولف حیات دبیر نے اس قطعہ کا ایک ھی شعر اپنی تالیف مین لکھا ھے مگر وہ اس قطعہ مین شامل نہین وہ شعر ھے ؎

چون داشت ذوق ذکر شھیدان کربلا سلخ محرم آمدہ روز وصال او

(۲) جو سید انشاءاللہ خان انشاء کے والد تھے ۔ ھدا انشاء کے دوسرے بھائی مسیح اللہ خان کے پوتے ھین ۔

بسکه دردل شعلهٔ داغ غم او سرکشد
اشك ما در هرچشم سوز و مثل اخگرے دبیر
روز روشن تیرہ شد در دیدهٔ اهل نظر
اے که شد مکسوف روئے مهرانور بے دبیر
تشنهٔ مدح شه وکرب وبلا شد تاوفات
می خورد تنها علی کے آب کوثر بے دبیر
سال تاریخش چو جستم از فلك آمد ندا
سدرہ بے روح القدس بینید و منبرے دبیر

۱۲۹۲ ھ

منشی محمد مرزا جان صاحب محمود (۱) کا قطعہ تاریخ حسب ذیل ہے :

فلك کے یاد رہین گے ہمین یه جور و ستم
که ایك رنج سے ہے رنج دوسرا توام
خوشی کسی کو ہو خاك اس سرائے فانی مین
نہین ہے دم کا بھروسه یہان خدا کی قسم
انیس کا مه ذی قعدہ ہی سے صدمه تھا
ہوا اخیر محرم دبیر کا ماتم
جو شاعری مین یه بے مثل لاجواب تھے وہ
اسی سے ہو نہین سکتا کسی کا وصف رقم
وہ اپنے رنگ مین یکتا یه اپنی طرز مین فرد
گھٹا بڑھا نہین سکتا جسے ذرا بھی قلم
جہان ہوگیا اہل کمال سے خالی
که لکھنئو مین ہوئے ہین یه حادثے پیہم
جو نصف نصف لکھین پڑھ کے مصرعه تاریخ
عیان ہر ایك کو ہوجائین دونون سال الم

(۱) مرزا جان محمود شاگرد صبا (سخن شعرا) ص ۴۲۱ ـ محمود کا کہا ہوا مادهٔ تاریخ خم خانه جاوید جلد اول ص ۲۹۷ پر بھی درج ہے ـ

عدد حساب مین دونون سنون کے پورے ہون
نہ تعمیہ ہے نہ تخرجہ نہ بیش نہ کم
لکھی فلک کی شکائت مین اس طرح تاریخ
غم انیس مین ہے ہے دیا دبیر کا غم

۱۲۹۱ ھ   ۱۲۹۲ ھ

غم وہ ہے کہ جس کو غم روتا ہے
مجلس مین امام کا علم روتا ہے
لکھتا ہون جو سال رحلت ان کا محمود
محفل مین دبیر کو قلم روتا ہے

۱۲۹۲ ھ

۲۸ دسمبر ۱۸۷۵ء کے شمارہ مین پھر کئی ایک قطعات تاریخ طبع ہوئے — جنھین طوالت کے خوف سے نظرانداز کیا جاتا ہے مگر دو تاریخین جو سید سجاد حسین المخلص بہ ریحانی کی ہین جن مین سے پہلی انیس کی وفات کی ہے اور دوسری دبیر کی اور دونون انیس کے ایک مصرعہ مین ایک لفظ کے تغیر و تبدل سے نکالی گئی ہین درج ذیل ہین :—

انیس — طبع ریحانی نے لکھی ہے یہ تاریخ انیس
ہائے جز خاک نہ تکیہ نہ بچھونا ہوگا

۱۲۹۱ ھ

دبیر — نکلی یون مصرعۂ مذکور سے تاریخ دبیر
وائے جز خاک نہ تکیہ نہ بچھونا ہوگا

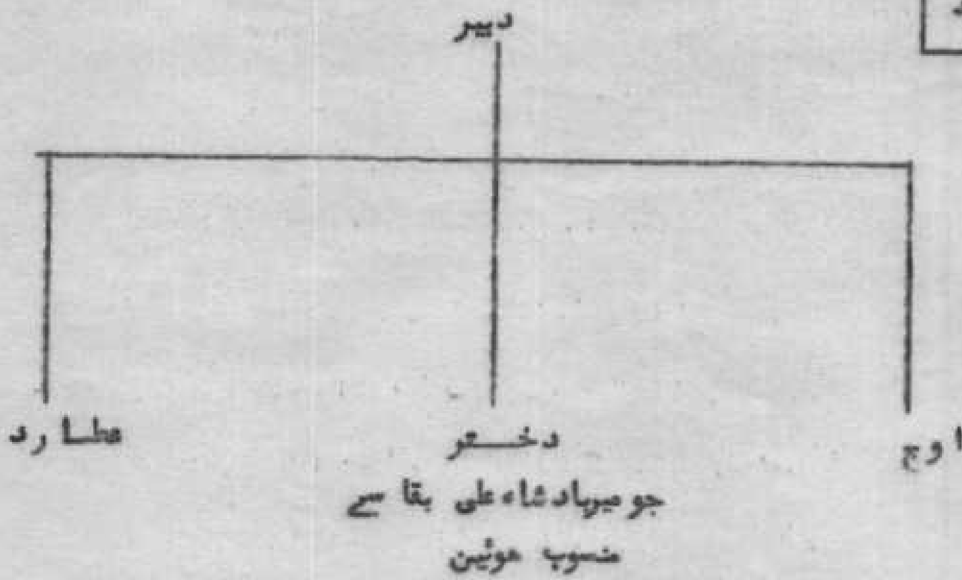
۱۲۹۲ ھ

انھین کے دوسرے بھائی سید کرار حسین صاحب روحانی دبیر کے ہی مصرعہ سے تاریخ وفات نکالی ہے — ملاحظہ ہو

یا شاہ زمن لطف کی ہوجائے نگاہ
دروازہ دولت پہ فقیر آیا ہے
تم سے ہے امید کل سے ہے قطع نظر
تحصیل سعادت کو دبیر آیا ہے

۱۲۹۲ ھ

اولاد



۱ ـ اوج مرزا محمد جعفر متولد ٦ جمادی الاول ۱۲٦۹ ھ (۱۸۵۳ء) متوفی ۱۳۳۵ ھ (۱۹۱۸ء) لالہ سری رام اپنے تذکرہ خمخانۂ جاوید مین ان کے حالات اس طرح لکھے ہین :-

" جانشینِ حضرت دبیر مرحوم، مرثیہ گوئی مین اپنے والد کے قدم بقدم ہین — قابلیت علمی معقول رکھتے ہین — مرثیہ گوئی و مرثیہ خوانی ان کا آبائی شعار ہے، شروع محرم سے چہلم تک مختلف مقامات مین جاکر اپنے تازہ مرثیون سے اہلِ مذاق کو محظوظ کرتے ہین ہنگامِ قیام لکھنؤ مین راقم (لالہ سری رام) کو بھی مکرمی مسٹر حامد علی خان کے ہمراہ شرفِ نیاز حاصل ہوا تھا — اثنائے گفتگو مین جناب نے یہ بھی فرمایا تھا کہ ہمارا اصلی وطن دہلی ہے اور ہمارے اجداد کی سکونت، قاضی حوض کے پاس تھی — چنانچہ آپ خود بھی ایک مرتبہ خاص اسی غرض سے کہ مسکن قدیم کا کچھ نشان لائین، دہلی تشریف لائے تھے، مگر انقلاب زمانہ سے اس محلہ کی صورت ایسی تغیر ہوگئی کہ کوئی پتہ آپ کے بزرگون کے مسکن کا بہم نہ پہنچا۔ نہایت خلیق خوش مزاج زندہ دل بزرگ ہین ! سِن شریف ٦۰ سال سے متجاوز ہے حضرت جعفری بیگم صاحبہ رئیسہ عظیم آباد کے اوقاف سے بہ صلہ مرثیہ خوانی دو ہزار سالانہ آپ کا مقرر ہے۔ اس کے علاوہ اکثر حیدرآباد دکن کی مجالس عزا کو بھی قدوم میمنت لزوم سے رونق بخشتے ہین — اودھ کے بعض رئیسون اور ریاست رامپور سے بھی آپ کی معقول قدر ہوتی ہے — فی زمانہ آپ کی ذات بابرکات مغتنمات سے

ہے ۔ اساتذہ سلف کی آپ ایک عمدہ یادگار ہین ۔ فن عروض مین آپ کو زبردست مہارت حاصل ہے ۔ چنانچہ ایک مبسوط رسالہ اس فن مین آپ کی تصنیف سے شائع ہوچکا ہے ۔ (۱)

سید امداد امام اثر لکھتے ہین " کہ مرزا اوج کی مرثیہ نگاری بہت کچھ جدت سے خبر دیتی ہے ۔ ان کی شاعری نقالی نہین ہے ۔ ہرگز ایسی نہین ہے کہ سوچا اس عمدہ مراثی سے مرزا صاحب اقتباس مضامین کرکے ایک خاص مرثیہ بنالیتے ہون ۔ اس پر خوبی یہ ہے کہ روایاتِ صحیحہ کو منظوم فرماتے ہین اور خود ایجاد و اقوال سے امام و خاندانِ امام علیہ السلام پر اتہام نہین لگاتے ہین ۔ " (۲)

نمونۂ کلام مرزا اوج :۔

پردہ اٹھ جائے گا جب رو سے تجلی کا کلیم — آپ خود منہ سے کہین گے کہ ابھی کیا دیکھا

روئے گل، رنگ خزان، جوش جنون، فصل بہار — چارون کے لئے اس باغ مین کیا کیا دیکھا

اوج کم بختیِ اربابِ سخن سے کیا بحث — دامن گل کبھی کانٹون مین نہ الجھا دیکھا

یہ ہوا کیسی چلی اس تنگنائے دہر مین — شہر جنگل ہوگئے آبادیان بن ہوگئین

چل سوئے گورِ غریبان اے حریص مال و زر — دیکھ کتنی آرزوئین نذر مدفن ہوگئین

سلام

سلامی سوز ماتم سے نہ سرگرم فغان کیون ہو
نہ ہون آتش فشان نالے تو مجلس مین دھوان کیون ہو

حقیقت کہنہ خالق کی عیان کیون ہو نہان کیون ہو
نہ سننے کا تحمل ہو تو کہنے مین زبان کیون ہو

اسی کے لطف سے ہے ارتباط عالم امکان
جو وہ نامہربان نکلے تو کوئی مہربان کیون ہو

رباعی

ہیم شب ہجر نیند کھونے آئی — پلکون مین دُرِ اشک پرونے آئی

چونکا تو نہ اب تک اوج سوتے سوتے — دن ڈھل گیا اور رات ہونے آئی

---

(۱) خمخانۂ جاوید (لالہ سری رام) جلد اول ص ۵۱۵ ۔
(۲) کاشف الحقائق (امداد امام اثر) جلد ۲ ص ۹۹ ۔ مکتبہ معین الادب لاہور ۱۹۵۶ء

ساقی نامہ

وفور گاہ سے کترا کے تو چلا ہے کدھر | تری ادا پہ لگاتے ہیں قہقہے ساغر
لب سبو سے تبسم عیاں ہے سرتا سر | دغا کی قلقل مینا سنا رہی ہے خبر

بڑھا ہے تیغ بکف قلعہ گیر کا پوتا
چڑھا ہے رن پہ جناب امیر کا پوتا

۲۔دختر | جو میر بادشاہ علی صاحب بتا خلف الرشید میر وزیر علی صبا سے منسوب تھیں۔بتا خاندانی شاعر تھے۔ستر برس کی عمر میں وفات پائی۔(۱) نمونۂ کلام یہ ہے :

خدا کو بھول جاتے ہیں بتوں کی آشنائی میں | بہت ایسے بھی ہیں اللہ کے بندے خدائی میں
کہا میں نے دکھاکر لخت دل اس شاہ خوباں کو | ملے یہ عشق کی سرکار سے ٹکڑے گدائی میں

۳۔عطارد | مرزا محمد ہادی حسین نام المتولد ۵ شعبان ۱۲۷۲ھ المتوفی ۲۵ جمادی الاول ۱۲۹۰ھ(۲)۔ عین عالم شباب یعنی بیس سال کی عمر میں بعارضہ تخمہ انتقال کیا۔شاعر مبتدی تھے اور سلام اچھا کہتے تھے۔مولوی سید علی صاحب کامل نے تاریخ وفات کہی۔قطعہ تاریخ کے آخری دو اشعار مندرجہ ذیل ہیں :

غم زدفنش مخور کہ بعد رحیل | او بہ کنج لحد نماند مقیم
ہاتفے گفتہ ست دوش بمن | شد عطارد مکین بیت نعیم

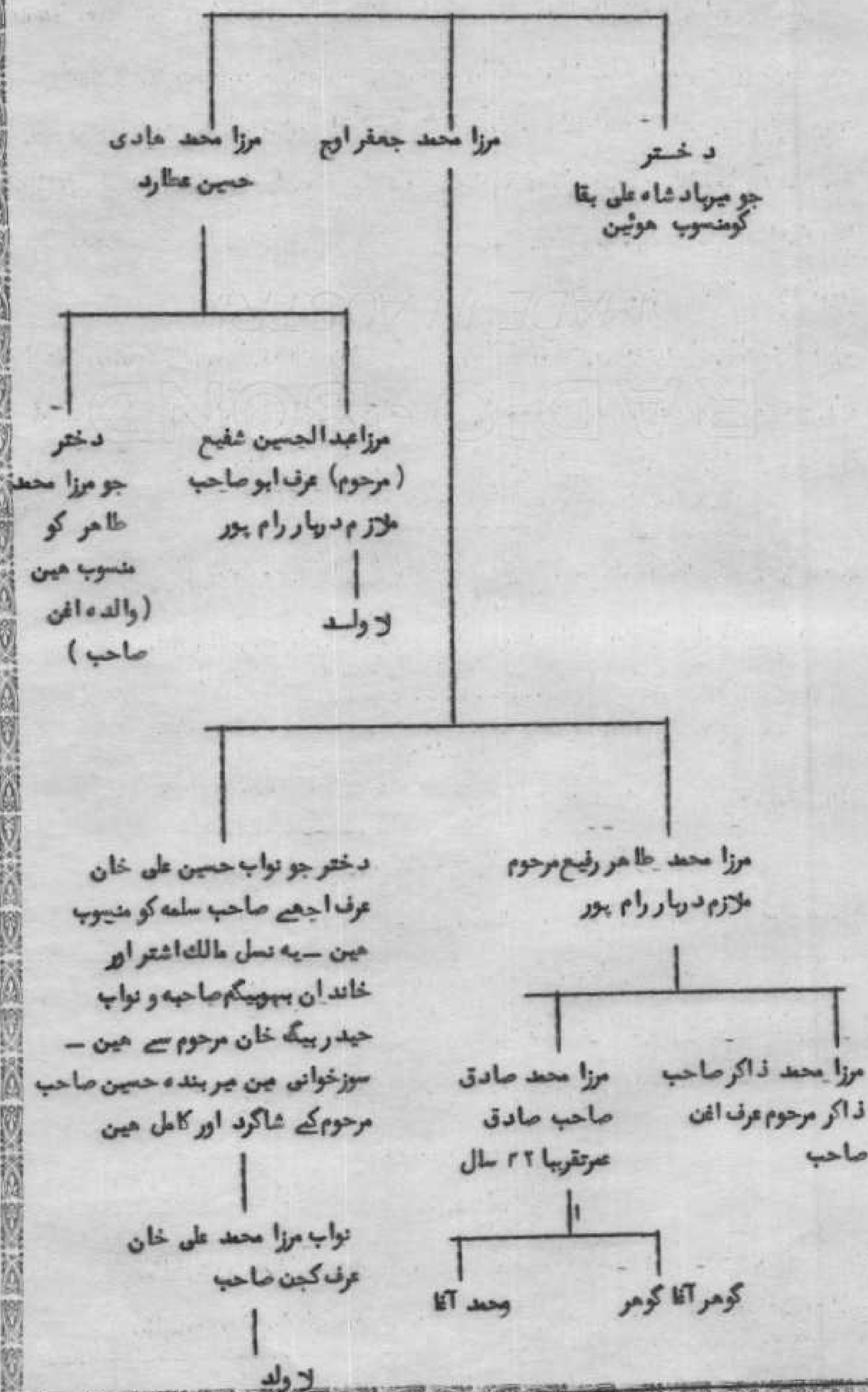
۱۲۹۰ھ

---

(۱) خمخانۂ جاوید (لالہ سری رام) جلد اول ص ۶۰۶ ۔

(۲) حیات دبیر ص ۲

(۱)
مندرجہ ذیل شجرہ سے دبیر کی اولاد کی تفصیل ملاحظہ کی جاسکتی ہے :-



(۱) حیات دبیر و مکتوب سالک مسلک دبیر سید سرفراز حسین صاحب خبیر جانشین مرزا اوج محررہ ۵ ۱۶ جنوری ۱۹۵۸ع بنام راقم الحروف

جناب مرزا محمد صادق صاحب صادق سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا ـ خاندانی حالات کے سلسلے مین ان سے بڑی مدد ملی اور غیرمطبوعہ کلام کی نشان دہی بھی ہوئی ـ دیگر مراثی سے جو اقتباسات پیش کئے گئے ہین ان کی صحت کے بارے مین بھی ان سے مشورہ رہا ـ

مرزا صاحب موصوف اس وقت واحد یادگار دبیر و اوج اور جانشین مرزا محمد طاہر رفیع ہین آپ کے پاس غیر مطبوعہ کلام ~~کا کافی ذخیرہ~~ موجود ہے خدا کرے کہ جلد اس کی طباعت کے لئے حالات سازگار ہون اور یہ دفینہ منظر عام پر آجائے ـ

حصّہ سوم

کلام

باب اول (کلام)

الف ــ کلام کی مقدار اور مختلف ایڈیشن

کلام کی مقدار میں متضاد روایات ــ تحریف ــ کتابت اور طباعت کی غلطیاں کلام کی مقدار ــ الحاقی کلام ــ غیر مطبوعہ کلام ــ مختلف ایڈیشن ــ مستعملہ بحور

ب ــ منازل ارتقا

کلام کی تاریخی تدوین ــ ابتدائی کلام ــ ۱۲۵۰ھ سے قبل کا کلام ــ ۱۲۵۰ھ تا انتزاع سلطنت کا کلام ــ انتزاع سلطنت سے بعد کا کلام

ج ــ دبیر کے عہد کی زبان اور دبیر کو زبان پر قدرت

پہلا باب

دبیر کا کلام

الف ۔ مقدار اور ایڈیشن

کلام کی مقدار میں متضاد روایات

یہ عجیب بات ہے کہ دبیر کے کلام کی مقدار کے متعلق بھی تذکرہ نویس حضرات متفق نہیں ۔ آزاد مرحوم، آبحیات میں ایک جگہ اس طرح رقم طراز ہیں :۔

" مرزا صاحب نے ٢٩ محرم ١٢٩٢ ھ کو ٧٢ برس کی عمر میں انتقال کیا ۔ اس مدت میں کم سے کم تین ہزار مرثیہ لکھا ہوگا ۔ سلاموں اور نوحوں اور رباعیوں کا کچھ شمار نہیں " (١)

پھر آگے چل کر انیس کے حالات میں یوں بیان کیا ہے :۔

" مرزا دبیر مرحوم نے کم سے کم دس ہزار مرثیہ ضرور کہا ہوگا ۔ اور سلاموں کا تو کیا شمار ہے ۔ رباعیاں تو باتیں تھیں " (٢)

گل رعنا میں آزاد کی اول الذکر عبارت تقریباً بجنسہ نقل ہے ۔ (٣)

کلام میں تحریف کتابت اور طباعت کی غلطیاں

مولف حیات دبیر (٤) نے مندرجہ ذیل رائے کا اظہار کیا ہے :۔

" بہرحال جو مرزا صاحب کا کلام میرے علم میں موجود ہے وہ

(١) آب حیات (مطبوعہ شیخ مبارک علی) ص ٥٢١

(٢) ــــ ایضاً ــــ ص ٥٢٢

(٣) گل رعنا (مطبع معارف اعظم گڑھ ١٣٤٣ ھ) ص ٤٩٩ و ٥٠٠

(٤) ایضاً ص ٤٧٥

حسب ذیل دو قسم کا ہے (۱) مطبوعہ (۲) غیر مطبوعہ ـ مطبوعہ کی بھی قسمیں ہیں ـ

ایک وہ جو مطبع اودھ اخبار میں دو جلدوں میں چھپا ہے ـ دوسرا وہ جو اور مصنفوں کے کلام

کے ساتھ یا علیحدہ علیحدہ مرثیے چھپے ہیں ـ ان سب مرثیوں میں اکثر کلام غلط اور ایسا

پیوندی کلام شامل ہے، جس کا چھانٹنا دشوار ہے ـ بلکہ مطبع اودھ اخبار کی جلدوں میں

تو بعض مرثیے ایسے ہیں جن کا ایک بند بھی کلامِ مرزا صاحب سے نہیں ہے ـ جیسے یہ

مرثیہ ــــ ہر آہ علم ہے یہ عزاخانہ ہے کس کا +

مرزا نظیر برادر دبیر مرحوم کی تصنیف ہے ـ پیوندی مرثیوں میں یہ امتیاز کرنا کہ کونسا بند

مرزا صاحب کا ہے کونسا دوسرے کا ہے، بہت مشکل ہے ـ پیوندی یا اصلی مرثیوں کی یہ

کیفیت ہے کہ ذاکروں میں یہ عادت جاری تھی اور اب بھی ہے، کہ پانچ سات مرثیوں کے چُست

چُست بند چھانٹ کر ایک مرثیہ، کسی ذاکر نے بنالیا اور پڑھا ظاہر ہے کہ معمولی مرثیہ سے

زیادہ اس پر مجلس میں رنگ ہوگا ـ خربزے کو دیکھ کر خربزہ رنگ پکڑتا ہے (مثل مشہور

ہے) اب جو دوسرا ذاکر منبر پر گیا تو اس نے بھی یہ سمجھ کر کہ معمولی مرثئے پھر شاید رنگ

نہ ہو ـ ایسا ہی پیوندی مرثیہ پڑھ کر کامیابی حاصل کی ـ کبھی کبھی میں خود بھی ایسے

جرمِ اخلاقی کا مرتکب ہوا ہوں ـ مگر کب جبکہ دوسرے ذاکر نے پیوندی مرثیہ پڑھا ـ میں نے

بھی ایسا ہی کیا ـ چنانچہ قدیر الدولہ قدیر مرحوم اپنی ایک رباعی میں کہتے ہیں ــــ

اپنا ہی کلام ہم تو پڑھتے ہیں قدیر اور یاروں کا ہر مرثیہ پیوندی ہے

کلام کی مقدار | تیسری قسم کلامِ مطبوعہ کی وہ بیس جلدیں، دفتر ماتم کی ہیں جو بکجائی

میر عبدالحسین صاحب دس روپیہ میں بیچتے ہیں ـ ان میں بھی بعض کلامِ غیر (بعض مرثیے

کے مرثیے اور بعض بند کلام غیر کے) شامل ہیں ـ جن کا امتیاز مشکل ہے ـ میں آگے چل کر

دفتر ماتم کے بعض مرثیوں کی نسبت مع دلیل یہ رائے ظاہر کروں گا کہ وہ مرزا صاحب کی تصنیف

نہیں ہے ـ" دفتر ماتم کی ۱۲ جلدوں کے مرثیوں کی تعداد ۳۶۶ ہے اور یہ سب بجز ایک مرثیہ

(۱) موجودہ زمانے میں یہ جلدیں نایاب ہیں ـ (۲) حیات دبیر ص ۲۷۵ ـ ۲۷۶

مرثیہ کے (لازم نہ تھا یہ چرخ ستمگر کے واسطے) مسدس ہیں ۔

دفتر ماتم کی پندرھویں جلد مثنوی میں ہے، جس میں چودہ معصوموں کے حالات فضائل اور معجزات بیان کئے گئے ہیں ۔ اس کے علاوہ ایک معراج نامہ بھی ہے ۔ یہ مثنوی ابتدائی مشق کی تصنیف معلوم ہوتی ہے ۔ اور مرزا صاحب کے مرثیوں کے مقابلے میں بہت ہلکی ہونے کی وجہ سے چنداں اہمیت کی حامل نہیں ۔

دفتر ماتم کی سولھویں، سترھویں اور اٹھارویں جلدوں میں الف سے لے کر "یا" تک ردیف وار سلام ہیں ۔ جن کی مجموعی تعداد ۳۳۲ ہے ۔ بعض سلام غلطی سے ان کے شاگردوں کے بھی شامل ہوگئے ہیں جیساکہ ان کے مقطعوں سے ظاہر ہے ۔

انیسویں جلد ۶۲ مخمس سلاموں پر مشتمل ہے ۔ اس میں ہفت بند ملا کاشی پر فارسی میں مصرعے لگا کر کیا ہوا مخمس بھی شامل ہے (۱) اور " شمس المشرقین " کے نام سے علیحدہ بھی چھپ چکا ہے ۔

دفتر ماتم کی بیسویں جلد میں متفرق کلام از قسم رباعیات و قطعات مناجات واقعات نوحے اور تضمینیں درج ہے ۔

مرزا صاحب کا ایک قصیدہ مقیاس العروض (مرزا اوج) میں شامل ہے مگر فنی اور ادبی لحاظ سے یہ بھی کسی اہمیت کا حامل نہیں ۔

الحاقی کلام | مؤلفِ حیات دبیر کے خیال میں مندرجہ ذیل مرثیے، جو دفتر ماتم میں شامل ہیں الحاقی ہیں (۲) خاندانِ دبیر سے بھی اس کی تصدیق ہوئی ۔ نیز زبان و بیان کے لحاظ سے بھی وہ مرزا صاحب کی تصنیف معلوم نہیں ہوتے :۔

---

(۱) مؤلف حیات دبیر، مرزا اوج کی زبانی ناقل ہیں کہ اس مخمس پر مرزا صاحب کے ایک استاد مجتہد ماندرانی کی اصلاح ہے ۔ حیاتِ دبیر ج اول ص ۲۷۸

(۲) ایضاً " ص ۲۷۹ ۔ ۲۸۰

۱ ۔ جو زائرِ حسین علیہ السلام ہو (جلد دوم)

۲ ۔ شہرِ خدا کا شہر ہے آمونۂ مصطفیٰ (جلد پنجم)

۳ ۔ عباس کو جو سبطِ نبی نے علم دیا (جلد ہفتم)

۴ ۔ شاہوں سے کم نہیں غلامانِ مرتضیٰ (جلد ہشتم)

۵ ۔ یارو غمِ حسین کی عزت عظیم ہے (جلد نہم)

۶ ۔ کیا ذاتِ ذوالجلال قہیر و رحیم ہے (جلد یازدہم)

غیر مطبوعہ کلام | مرزا دبیر کے ورثاء میں سے اِس وقت صرف مرزا محمد صادق صاحب صادق، ابن مرزا طاہر رفیع، ابن مرزا اوج، ابن مرزا دبیر حیات ہیں ۔ موصوف کے پاس مندرجہ ذیل غیر مطبوعہ مراثی موجود ہیں :۔

۱ ۔ مہرِ علم سرورِ اکرم ہوا طالع (غیر منقوطہ)۔

۲ ۔ سبطین علی رونق میدان وغا تھے ۔

۳ ۔ روشن کیا جو حق نے چراغ انتقام کا۔

۴ ۔ جب تیغ انتقام برہنہ خدا نے کی ۔

۵ ۔ بالِ ہمائے اوجِ سخن ہے زبان مری ۔

۶ ۔ کیوں چرخ میں گردوں کی طرح رن کی زمین ہے ۔

۷ ۔ آمد خزاں کی گلشن خیرالوریٰ میں ہے ۔

۸ ۔ حلّالِ مشکلات کا جانی حسین ہے ۔

مندرجہ بالا مرثیوں میں نمبر ۱، ۲، ۳، ۴، ۵ کی نقول راقم الحروف کے پاس بھی موجود ہیں ۔ اِن کے علاوہ "ہم طالع ہما مرا وہم رسا ہوا"[۱] غیر منقوطہ مرثیہ علیحدہ طبع ہو چکا ہے ۔

اس حساب سے مرزا صاحب کے مرثیوں کی مجموعی تعداد ہونے چار سو سے زائد ثابت نہیں ہوتی ۔ خدا جانے آزاد نے اسے ہزاروں کی تعداد تک کس طرح پہنچا دیا ۔ ہاں جو کلام ضائع ہو گیا یا دوسروں کو دے دیا، وہ بھی اِس قدر نہیں ہو سکتا ۔ کوئی بیس[۲۰] کے قریب نامکمل مرثیے بھی ہیں ۔ جن میں سے کوئی دو بند، کوئی چار، کوئی دس بارہ، یا پندرہ بند تک ہیں ۔ مگر کسی کا مطلع نہیں ۔ کسی کا مطلع ہے تو آگے نہیں چلا ۔ بعض میں مختلف مرثیوں

۱ ؎ یہ مرثیہ بھی مرزا کی تصنیف کے طور پر شاگردانِ دبیر تسلیم نہیں کرتے ۔

کے بعد یکجا لکھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ یعنی کسی شہید کا حال لکھتے لکھتے کوئی دوسرا واقعہ یاد آگیا تو طبیعت اس طرف رواں ہوگئی ۔ تین دیوان غزلیات کے تھے جو تلف ہوگئے (۱) مرزا صادق صاحب کا دعویٰ ہے کہ کچھ غزلیات کے مسودے ان کے پاس موجود ہیں مگر وہ دکھا نہیں سکے ۔

مختلف ایڈیشن | اودھ اخبار کے مذکورہ بالا ایڈیشن اور دفتر ماتم کے علاوہ نولکشور نے مراثی دبیر کو بعد تصحیح سید صدق حسین رضوی ۱۸۸۷ع میں چھپوایا ۔ جیسا کہ جلد اول کے خاتمہ کی مندرجہ ذیل عبارت سے ظاہر ہے :۔

" پس واسطے ان عیوب کے اس مرتبہ ثانی میں آقائی مطبع ممدوح نے اس ہیچمدان، قلیل البضاعت، ذاکر مصائب اہل بیتِ رسالت، پیرو نبی و علی، سید صدق حسین رضوی کو جو ایک عرصہ سے وابستۂ دامنِ دولت مالکِ مطبعِ موصوف ہے، مخصوص فرمایا اور اس کمترین نے بھی باوصفِ اشغالِ کثیر اور فرصتِ قلیل کے جہاں جہاں اون جلدوں میں ربطِ کلام اور التزام ردیف و قافیہ نہ تھا اور جس جس مقام پر اشعار بے معنی اور ناموزون تھے حتی الوسع ان سب عیوب کو درست کیا ۔ چنانچہ ناظرین باتمکین خصوصاً جن صاحبوں کے پاس مجلد سابقہ ہوں گی خود ملاحظہ فرماکر یقین ہے کہ اس عاصی کو بدعائے خیر یاد فرمائیں گے (۲) "

اس کے بعد مختلف اوقات میں تین دفعہ کلام دبیر اسی بزرگ کی زیر نگرانی و اصلاح طبع ہوتا رہا جیسا کہ مندرجہ ذیل اشعار از محمد حامد علی خان حامد سے ظاہر ہے جو کہ مجموعہ مطبوعہ ۱۸۹۰ع کے آخر میں درج ہیں :۔

---

(۱) غزلیات پر بحث اور نمونہ کلام سوانح کے حصہ میں دیا جا چکا ہے ۔

(۲) مراثی دبیر جلد ۱ ص ۳۷۰ نولکشور ۱۸۷۷ع

چھپی دوسری جلد یہ تین بار　　　اسی مطبع میں پہلے جس کا بیان

بتفصیل میں نے لکھا پیشتر　　　بتصحیح مخدوم ط خادمان

جناب محمد تصدق حسین　　　مصحح ہیں مطبع کے وہ بیگمان

بڑے نکتہ سنج اور بڑے نکتہ رس　　　بڑے مولوی اور بڑے نکتہ دان

انھوں نے بڑے کام اس میں کیے　　　کروں ان میں سے یاں میں دو اک بیان

جو اغلاط بیجا چھپے پہلی بار　　　وہ تھیں کاتبوں کی غلط فہمیاں

انہیں مولوی نے نکالا انہیں　　　بڑی جانفشانی سے اے مہربان

جو تھا غیر موزون وہ موزوں کیا　　　غرض تھیں جو لازم وہ کی خوبیاں

کیا دوسرا کام اس سے بڑا　　　کروں اس کو بھی اس جگہ میں بیان

کیے تھے جنھوں نے جہاں اعتراض　　　کلام دبیر سخنور پہ ہاں

شائے وہ حضرت نے اس طور سے　　　ہوئے معترض سن کے بس مدح خواں

ہوئی ہوگی خوش روح مرزا دبیر*　　　خدا اجر دے ان کو یاں اور وہاں

اس کے بعد کے ایڈیشن میں جناب حاصد صاحب نے خود اصلاح فرمائی ۔ چنانچہ فرماتے ہیں

جو کچھ ہو سکا میں نے صحت کیا　　　جہاں دیکھا بگڑا بنایا وہاں

جہاں پر ~~کھلا~~ قصور سمجھ نے کیا کچھ　　　کہ ہر دم طبیعت نہیں ایکسان

تو ایجنٹ مطبع سے مشورہ لیا　　　کہ وہ بھی بڑا شخص ہے نکتہ دان

مہینہ تھا انگریزی اپریل کا　　　اٹھارہ سو نوے تھے سن بیگمان

غرض کلام دبیر اس قسم کی اصلاحات سے مزین ہوتا رہا ۔ یہاں تک کہ مرزا طاہر رفیعؔ نبیرہ مرزا دبیر مرحوم نے اِس طرف توجہ کی اور اُن کے دل میں اپنے جدِ امجد کے کلام کو اس قسم کی دست درازیوں اور ستم ظریفیوں سے محفوظ کرنے کا خیال پیدا ہوا ۔ چنانچہ سبعِ مثانی میں ان کی طرف سے یہ عبارت نقل ہے :-

" مداحِ امام الکونین عزیزی سید سرفراز حسین صاحب خبیر سلمہ اللہ القدیر شاگردِ رشیدِ والد علام حضرت اوج طاب ثراہ و خاکسار ہیچ مدان رفیع کا مدت سے تقاضا اور خود اس فقیر کا اِرادہ تھا کہ تاجدارِ کشورِ حُسنِ قبول مدّاحِ آلِ رسولؐ بندۂ درگاہِ پنجتن خدائے سخن استاذ بے نظیر جدِ امجد جناب مرزا سلامت علی صاحب دبیر اعلی اللہ مقامہ کے ان [illegible]

* مرزا مرحوم کی روح کی مسرت کا اندازہ لگانا ہمارے لئے ممکن نہیں ۔ بہرحال اگر ہم ان کی زندگی میں ہوتے ان کے کلام کی ایسی ہی اصلاح ہوتی تو وہ ضرور خودکشی کر لیتے +

مرثیون کی صحیح اصل لستہ دبیری سے کردی جائے ۔ جن پر اہل مطبع کی بےپرواہی احباب کی دہپردہ کاروائی، دبیر ہمہ دان و نکتہ سنج کی بےنیازی کلام دبیر کی نکتہ نوازی اور قبول عام کی قدر افزائی کے ہاتھون بڑے بڑے ستم ہوگئے ۔ الحمدللہ کہ چودہ مرثیون کی ایک جلد شائع ہو رہی ہے ۔ اصل مرثیون جو مصنف مرحوم کے پڑھے ہوئے ہین سے مقابلہ کرتے وقت قیامت نظر آئی ۔ مصرعون اور بیتون کا ذکر کیا بند کے بند الحاقی، اکثر عمدہ بند ندارد کہین تحریف کہین تخفیف، سلسلہ کی زنجیرین شکستہ کہین کچھ، کہین کچھ، جابجا الفاظ مین بہار اور خزان کا فرق، جہان تک ممکن ہوا اصل مرثیون سے صحیح کرکے ایک جلد مشتے نمونہ از خروارے اہل نظر کے سامنے پیش کی جاتی ہے ۔۔۔۔

خاکسار محمد طاہر رفیع محررہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۳۰ء" (۱)

سبع مثانی کے بعد "هفت آیات" اور هشت بہشت" کے نام سے منتخب مرثیے طبع ہوئے یہ تینون مجموعے سید سرفراز حسین صاحب خبیر شاگرد مرزا اوج کی زیرنگرانی معارف بک ایجنسی نے طبع کئے ۔ لیکن سارے مطبوعہ کلام کی اصلاح کا کام تشنۂ تکمیل رہا ۔ ۱۹۳۷ء مین مطبع نولکشور نے مرزا طاہر رفیع کی اصلاح سے ایک ایڈیشن شائع کیا ۔ جس کے متعلق موصوف کی اپنی رائے یہ ہے :۔

" مین نے باوجود کثرت اشغال اور تغیر احوال کے اس جلد اول کو اصل مطابق جناب جد مغفور کے مطابق کردیا ہے، اور جن مرثیون کی اصل موجود نہ تھی انہین اپنی یادداشت کے موافق درست کردیا ہے، تاکہ شائقین کلام حضرت دبیر ان کے اصلی کلام سے بہرہ اندوز ہون مگر اغلاط کتابت و طبع سے معذوری ہے جسے اہل سخن خود سمجھ لین گے اور درست فرمالین گے " (۲)

---

(۱) ضمیمہ الف ۔ سبع مثانی ۔ مطبوعہ معارف بک ایجنسی لکھنئو ۱۹۳۰ء

(۲) عبارت تعارف مرثیہ مرزا دبیر مطبع نولکشور ۱۹۳۷ء

اس ایڈیشن کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ آخر میں "غلط نامہ" کے عنوان سے تین صفحات میں کتابت کی غلطیوں کی بھی تصحیح کردی گئی ہے۔"

بحور مستعملہ | دبیر نے اپنے کلام مرثیہ کے لئے اکثر وہ بحریں انتخاب کیں جو سوز خوانی اور تحت اللفظ پڑھنے میں موزون رہتیں چنانچہ بالعموم ان کا کلام مندرجہ ذیل چار بحروں میں ہے :-

۱ بحر ہزج مثمن مکفوف مکسور مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن یا مفاعیل
(اے دبدبہ نظم دو عالم کو ہلا دے)

۲ بحر مضارع مثمن مکفوف محذوف ۔ مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن یا فاعلات
(یا رب مجھے مرقع خلد بریں دکھا)

۳ بحر رمل ۔ مثمن مکسور ۔ فعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن یا فعلات
(جب ہوئی ظہر تلک قتل سپاہ شبیر)

۴ بحر مجتث ۔ مثمن (ضرب) مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن
روانہ نہر لبن کو جو شیر خوار ہوا)

یہ بحریں سوز خوانی اور تحت اللفظ دونوں کے لئے زیادہ موزون ہیں (۱) اس لئے ان کا کلام سوز خوانوں میں بے حد مقبول تھا ۔

---

(۱) محترم ڈاکٹر سید محمد عبداللہ صاحب کا خیال ہے کہ " بحور و اوزان بھی دراصل شاعر یا قاری کے مستقل اور عارضی ذہنی کوائف یا موڈوں کے ترجمان ہوتے ہیں اور بعض بحریں تو اوقات اور سمے کی بھی ترجمانی کرتی ہیں ۔ اور نفسی و روحانی آرزوؤں کی شارح ہوتی ہیں جو خاص موسموں اور وقتوں یا خاص فضاؤں اور ہواوں میں روح انسانی پر غیر معمولی نفوذ یا غلبہ رکھتی ہیں ۔ اس طرح بحروں کا موضوع سے بھی خاص تعلق ہوتا ہے ۔ اور بحریں اس لب و لہجہ کی تعیین میں مدد دیتی ہیں جو شاعر کی شاعری کے انفرادی رنگ اور تیور کا اظہار کرتا ہے " ڈاکٹر سید عبداللہ نقد میر ص ۳۰۲ مطبوعہ آئینہ ادب لاہور ۱۹۵۸ ع

ب — منازل ارتقا —

اودھ اخبار کے شمارہ مورخہ ۱۲ مارچ ۱۸۷۵ء سے ثابت ہوتا ہے کہ مرزا کی شعرگوئی کا آغاز بہت کم یعنی پندرہ سولہ سال کی عمر ہی سے ہو چکا تھا۔ چونکہ مرزا کی ولادت ۱۲۱۸ھ کی ہے — اس لئے ماننا پڑے گا کہ ان کی شعرگوئی کا آغاز ۱۲۳۳ھ یا ۱۲۳۲ھ سے ہوا — اس وقت مرثیہ میں رزم و سراپا وغیرہ داخل نہ ہوا تھا — اور مرثیہ گو شعراء کی توجہ زیادہ تر بین ہی پر تھی — نیز مرثیہ گوئی کا کمال اس کے حزنیہ اور بکیہ اثرات پر مبنی تھا — مرثیہ کو طوالت سے روشناس کرانے والے ان کے استاد میر ضمیر ہی تھے، ورنہ اس سے قبل مرثیہ زیادہ سے زیادہ پچیس (پچاس) بند کا ہوتا تھا — اس کی وجہ ظاہر ہے، کہ مرثیے سوزخوانی کے لئے لکھے جاتے تھے — طویل مرثیے سوزخوانوں کے لئے موزوں نہ تھے — نیز مرثیہ گو اپنی مقبولیت کی خاطر سوزخوانوں کی ضروریات اور خواہشات کو نظر انداز نہ کر سکتے تھے — اس لئے دبیر کے ابتدائی مرثیے بھی اسی قبیل کے ہیں — ان کے اس دور کا نمائندہ مرثیہ وہ ہے جس میں علی اصغر کی والدہ کی حالت بیان کی گئی ہے —

بانو پچھلے پہر اصغر کے لئے روتی ہے
ایک وہ جاگتی ہے خلق خدا سوتی ہے

اس مرثیے کے دو بند درج کئے جاتے ہیں تاکہ ہونہار شاعر کے کلام کے ابتدائی نقوش واضح ہو جائیں :—

سوگ کا فرش بچھے اور سامنے جلتا ہے چراغ
شانے میں داغ رسن سینے میں اولاد کا داغ
جان اندوہ میں دل رنج میں آشفتہ دماغ
نہ وہ گل ہیں نہ وہ غنچے نہ وہ زہرا کا ہے باغ
گوشۂ چادر کا اگر سر سے سرک جاتا ہے
ننگے سر کوفے میں پھرنا اسے یاد آتا ہے

کبھی گوشے میں وہ منہ ڈھانپ کے چلاتی ہے اور کبھی صحن میں گھبرا کے نکل آتی ہے
کو کھپکوڑے ہوئے ہر ایک طرف جاتی ہے ڈھونڈتی ہے مگر اصغر کو نہیں پاتی ہے

تن کو لغزش ہے جدا اور ہے منہ زرد جدا
دل تڑپتا ہے جدا سینے میں ہے درد جدا

کلام کی تاریخی تدوین | ابتدائی کلام کا پتہ چلانے کا ایک اور ڈھنگ بڑا معقول ہے — مرزا صاحب کے ابتدائی عہد میں باوصفِ عطف و اضافت کے نون کا اعلان جائز سمجھا جاتا تھا — بعد میں جوں جوں قدیم ترکیبیں متروک ہوتی گئیں — دبیر نے بھی ترک کر دیں — مگر جو نظم ہو چکی تھیں ان میں ترمیم نہ کی — اس اصول کے مطابق مندرجہ ذیل مرثیوں کے متعلق وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ابتدائی مشق کے عہد کے ہیں :-

۱	بے گور پڑا رن میں شہنشاہ عرب ہے	دفتر ماتم جلد ۱ ص ۱۹۸
۲	ہوں میں واللہ دل و جان سے قربانِ علی	ایضاً جلد ۲ ص ۱۲۲
۳	قیمت ان کی مجھے یا حیدر صفدر دیجئے	ایضاً جلد ۳ ص ۱۰۵
۴	کربلا کو حرم سرورِ ذی شان چلے	ایضاً جلد ۳ ص ۱۶۵
۵	دین احمدِ مختار کا مقبول کیا ہے	ایضاً جلد ۳ ص ۱۹۰
۶	خوش ہوئیں کہ وہ پاؤں پہ آنکھوں کے ملے ہے	ایضاً جلد ۲ ص ۷۷
۷	وہ بولی تسلی تمہیں دے آتی ہوں بھائی	ایضاً جلد ۴ ص ۲۱۸
۸	دلہن کا محافہ جو لگا آن کے در سے	ایضاً جلد ۹ ص ۱۱۰
۹	وہاں سے جا کے بہ تغیرِ رسول رو رو کے کہا	ایضاً جلد ۵ ص ۱۹۳
۱۰	باطل کو حق سے تیغ نے یوں کر دیا ٹکڑے	ایضاً جلد ۸ ص ۱۷۴
۱۱	جب عنقریب دشتِ نجف کے ہوا گذار	ایضاً جلد ۹ ص ۱۲
۱۲	یہ صدا آئی بگوشِ پسر شاہ نجف	ایضاً جلد ۵ ص ۵۸

جب میر ضمیر نے مرثیہ کو طوالت بخشی اور روایات کو نظم کرنے کا رواج ہوا تو دبیر بھی اسی روش پر چل پڑے ۔ غالباً" اس سلسلہ میں سب سے پہلا مرثیہ وہ ہے جس میں ایک ہرن کے بچے کے تحفہ کی روایت منظوم ہے ۔ اسی مرثیہ میں دوسری روایت امام حسین کے کربلا پہنچنے اور عمر بن سعد کو تنہائی میں بلانے کی ہے' چونکہ مشقِ سخن کے ساتھ ساتھ علمی ذخیرہ میں بھی اضافہ جاری تھا اس لئے ان کے کلام میں روایات کا اہتمام معاصرین کے مقابلہ میں زیادہ ہے ۔ اگرچہ تاریخی' نیم تاریخی' ضعیف اور ثقہ کی تمیز کم ہے ۔

میر ضمیر نے ۱۲۲۹ھ میں چہرہ' رخصت' رزم اور سراپا کو مرثیہ میں شامل کیا اور اس کارنامے کی تاریخ متعین کردی :-

۱۲۲۹

جس سال لکھے وصف یہ ہم شکل نبی کے — سن بارہ سو انتیس تھے ہجری نبوی کے

آگے تو یہ اندازِ سخن تھے نہ کسی کے — اب سب یہ مقلّد ہوئے اس طرزِ نوی کے

دس میں کہوں سو میں کہوں یہ ورد ہے میرا

جو جو کہے اس طرز میں شاگرد ہے میرا (۱)

گیا مرزا دبیر کے وہ طویل مرثیے جن میں سراپا اور رزم وغیرہ کا اہتمام کیا گیا ہے ۱۲۵۰ھ یا اس کے بعد کے ہیں ۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا مرثیہ

سب محفلوں میں نور کی محفل ہے یہ محفل

ہے ۔ مولف حیات دبیر کی روایت کے مطابق مندرجہ ذیل پانچ مرثیے ۱۸۵۷ء سے بعد کی تصنیف ہیں :- (۲)

---

(۱) مجموعہ مراثی میر ضمیر جلد ۱ ص ۱۳۰ نولکشور نومبر ۱۸۸۲ء

سید احتشام حسین صاحب نے مقدمہ مراثی میر انیس (لاہور ۱۹۵۹ء) میں یہ مصرع اس طرح لکھا ہے " اب سب ہی مقلد ہوئے اس طرز نوی کے " (بعض محققین کا خیال ہے کہ میر ضمیر کا یہ دعویٰ درست ہیں ۔ لیکن دبیر کے استادی کی حیثیت سے آپ بہر حال اپنے شاگرد پر تقدم زمانی حاصل ہے)

(۲) حیات دبیر ص ۲۷۹ ـ ۲۸۰

۱ اے صبح وفا کون تیرا شمسِ ضحیٰ ہے ۔ جلد اول (دفتر ماتم) حضرت عباس کے حال میں

۲ انجیل مسیح لب شبیر ہیں عباس جلد دوم (دفتر ماتم)

۳ یا رب مجھے مرقع خلد بریں دکھا جلد پنجم (دفتر ماتم)

۴ پرچم ہے کس علم کا شعاع آفتاب کی جلد اول (دفتر ماتم) حضرات عون و محمد کے حال میں ۔

۵ گل گشت گلستان اجل کرتے ہیں اکبر جلد دوئم (دفتر ماتم)

مہر علم سرور اکرم ہوا طالع ۔ غیر منقوطہ مرثیہ کا مسودہ خود مرزا دبیر کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیکھا ۔ اس کی انھوں نے تاریخ " درمدح سرور عالم عطارد کا کلام " کہی ہے ۱۲۵۹ھ
۱۲۵۹ھ
۱۸۴۳ع کے مطابق ہوتا ہے ۔

۱ کیوں چرخ میں گردوں کی طرح رن کی زمیں ہے

۲ سبطین علی رونق میدان وغا تھے

۳ روشن کیا جو حق نے چراغ انتقام کا

۴ نازل یزیدیوں پہ جو حق کا غضب ہوا

۵ جب تیغ انتقام برہنہ خدا نے کی

یہ پانچوں مرثیے بھی غیر مطبوعہ ہیں اور زبان و بیان کے لحاظ سے ان کی آخری عمر کی تصنیف معلوم ہوتے ہیں ۔

۶ بال ہمائے اوج سخن ہے زبان مری ۔ غالباً سب سے آخری مرثیہ ہے ۔ یہ مرثیہ مرزا صاحب کا شاہکار ہے اور ابھی تک طبع نہیں ہوا ۔

ج ـ دبیر کی زبان اور زبان پر قدرت

دبیر کے عہد کی زبان : جیسا کہ سوانح کے حصہ مین لکھا جا چکا ہے، جب دبیر کی شاعری کا آغاز ہوا تو لکھنو مین دہلی کے مہاجر شعرا کا اثر پوری طرح سے موجود تھا ـ یہ لوگ قدیم دہلوی الفاظ کو اپنے کلام مین بلا تکلف استعمال کرتے تھے ـ باوجودیکہ دبیر اپنی ابتدائی عمر ہی مین لکھنو چلے آئے تھے ـ اور ان کی ماں بھی لکھنوی تھین ـ پھر بھی ان کے ابتدائی کلام مین قدیم الفاظ استعمال ہوئے ہین ـ ان دہلوی شعراء کے مقابلہ مین دوسرا گروہ لکھنو کی زبان کا دعویدار اور اپنے اہلِ زبان ہونے کا مدعی تھا ـ اور آہستہ آہستہ بعض قدیم الفاظ کو متروکات کی فہرست مین شامل کرتا جاتا تھا ـ

مرزا دبیر کے کلام کی ابتدا سادہ اور سلیس زبان مین ہوئی جو دہلوی شعراء اپنے ہمراہ لائے تھے ـ مگر جون جون لکھنو مین محسناتِ شعر کا اہتمام و التزام بڑھتا گیا، دبیر کے کلام پر بھی یہ اثرات گہرے ہوتے گئے ـ چونکہ علمی استعداد خاصی تھی، اس لئے کہین کہین اس لفظی شعبدہ گری نے زبان کی صفائی اور سلاست پر ناخوشگوار اثرات بھی پیدا کئے ہین لیکن اس قدر نہین، جس قدر کہ مشہور ہین۔ کلام مین بہت حد تک طباعت اور کتابت کی غلطیون کے باعث گنجلک اور پیچیدگی پیدا ہوگئی ہے، ورنہ کلام کی غالب مقدار ہموار اور سلیس ہے۔ جنہین اس کا صحیح اندازہ لگانا ہو وہ اس مقالہ کے انتخابات کے علاوہ مرزا طاہر رفیع کا ایڈیشن (مطبوعہ نولکشور ۱۹۳۷ء) ملاحظہ فرمائین ـ مگر اس مین کوئی شک نہین کہ ان کے کلام کا کچھ حصہ ایسا بھی ہے جہان (میر انیس کے مقابلہ مین) دقیق، غریب اور غیر مانوس الفاظ کھٹکتے ہین ـ یہان یہ نہین بھولنا چاہئے، کہ مرزا دبیر کی علمی استعداد بہت زیادہ تھی اور وہ الفاظ جنہین ہم دقیق قرار دیتے ہین، ان کے لئے دقیق نہ تھے بلکہ ان کے عہد کے لکھنو مین علم و فضل کا چرچا اس قدر تھا کہ عوام بھی فارسی کے مشکل الفاظ سے مانوس تھے ـ درباری زبان فارسی تھی ـ عربی اور فارسی کے علم کی دربار و بازار مین

عزت تھی ۔ لکھنؤ تو ایک طرف، اس کے آس پاس کی بستیاں بلگرام، کاکوری، موہان، کنتور جرول، جائس، بدایوں، امروھہ، نصیرآباد، سندیلہ، خیرآباد وغیرہ وغیرہ میں بھی ارباب فضل و کمال کی کمی نہ تھی اور فارسی و عربی کے الفاظ خواص کے علاوہ عوام کی زبان پر بھی چڑھے ہوئے تھے ۔ (۱)

مرزا دبیر ایک عالم خاندان کے فرد تھے ۔ اعلی شیرازی اور مرزا محمد رفیع صاحب رفیع کے خاندانی اثرات کے علاوہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ عراق اور فغانی کے شعری دبستانوں سے بہت حد تک متاثر تھے ۔ فارسی اور عربی کے مشہور اشعار کے ترجمے اور اخذ کی بیشتر مثالیں ان کے کلام میں پائی جاتی ہیں ۔ اور ان کے نزدیک شاعری کا کمال یہ ہے ۔

اِک طرز کی تصنیف میں ہم کو ہے کلام
ہر رنگ میں جو خوب کہے خوب ہے وہ

اور چونکہ ہم عرصہ سے جدید تعلیم کے زیر اثر اس پر تکلف اور مرصع نظم کے عادی نہیں رہے ۔ اس لئے گھبرا جاتے ہیں اور اس کے ساتھ ہم مرزا کے کلام کا وہ حصہ بھی جو نہایت آسان اور سلیس ہونے کے باوجود، مقدار میں بھی خاصہ ہے، نظرانداز کر جاتے ہیں ۔ یوں ہم نے اردو کے شعری سرمائے کا بہت سا حصہ اپنے ذخیرہ سے خارج کر کے فراموش کر دیا ہے ۔ جو کسی طرح مناسب نہیں ۔

اس عہد کی مشہور تخلیقات آتش کی غزل، ناسخ کی منظومات، نسیم کی مثنوی گلزار نسیم اور منشی رجب علی بیگ کا فسانۂ عجائب ہیں ۔ آرائش کلام بحیثیت جزو غالب ان سب میں نمایاں ہے ۔ کوئی ادب محض آرائش کے جرم پر مردود قرار نہیں دیا جا سکتا ۔ بلکہ اس سے ادب کی جمالیاتی اور معنوی اقدار بڑھ جاتی ہیں ۔ جناب سید مسعود حسن رضوی ادیب نے کیا خوب لکھا ہے :-

---

(۱) ملاحظہ ہو گزشتہ لکھنؤ (شرر) مطبوعہ نسیم بک ڈپو لکھنؤ ص ۱۱۸ تا ۱۲۲

"اردو شاعری کا ایک معتدبہ حصہ خاص کر اساتذہ لکھنؤ جنھوں نے اپنی شاعری میں مضمون کی ندرت سے زیادہ، بیان کی لطافت پر توجہ کی ہے ۔ان کا زیادہ تر کلام ایسا ہی ہے، جس سے لطف اٹھانے کے لئے اہل زبان کا روزمرہ اِن کے محاورے، تلمیحین، کنائے تلمیحیں، الفاظ کے محلِ استعمال، مترادفات کے نازک فرق، اظہارِ جذبات کے طریقے، فصاحت کے رموز اور بلاغت کے نکتے، ان سب چیزوں کا علم ضروری ہے " (١)

زبان پر قدرت | دبیر ان شعراء میں سے ہیں جنہیں موقعہ محل کے مطابق زبان کے استعمال کا سلیقہ ہوتا ہے جیساکہ خود کہا ہے :۔

ہے رزم سراپا تو زبان اور ہی ہے   اور بین کے مابین بیان اور ہی ہے
کس درجہ بلند ہے تری فکر دبیر   کہتی ہے زمین یہ آسمان اور ہی ہے

اس لئے کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ان کے کلام کا گہرا مطالعہ کیا جائے ۔ آئندہ صفحات کی ورق گردانی سے ہمارے اس موقف کی تائید ہوگی کہ کلام کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ دبیر کی زبان اور طرز بیان میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں ۔ابتدائی مرثیوں میں جو نوحے نما ہیں سلیس اور سادہ زبان استعمال کی گئی ہے ۔لیکن ~~بہ لحاظ زمان~~ بامتدادِ زماں زورِ بیان میں جس قدر اضافہ ہوا، الفاظ کی شوکت اور کلام کی آرائش کا التزام بڑھتا گیا ۔رجز اور مدح میں یہ رنگ زیادہ گہرا ہوتا ہے ۔اس کے برعکس بُکیہ حصہ میں صاف اور سادہ زبان استعمال کرتے ہیں ۔مناظر فطرت کی تصویر کشی میں آرائش و محسنات کا استعمال صنوعی حد تک زیادہ ہوجاتا ہے ۔اکثر مرثیوں میں اس قدر پاکیزہ اور صاف ستھری زبان استعمال کرتے ہیں، کہ اگر ان کے کلام کے اِس حصے میں سے چند بند میر انیس کے کلام میں ملادیے جائیں تو پہچان دشوار ہوجائے ۔

---

(١) ادبیہ ہماری شاعری ص ٢١٣

باب دوم

الف ۔ اصطلاحی مرثیہ کی قدروقیمت کی تعیین

ب ۔ مرثیہ اور دوسرے اصناف سخن :۔

مرثیہ اور ایپک

مرثیہ اور مناظر فطرت کی تصویر کشی

مرثیہ اور المیہ

مرثیہ اور داخلی شاعری

الف ـ اصطلاحی مرثیہ کی قدروقیمت کی تعیین

تعریف | مرثیہ کے لغوی معانی سے اس کلمہ کے اصطلاحی معانی کے بعض پہلو روشن ہوتے ہیں ـ غیاث اللغات میں ہے کہ " مرثیہ بالفتح وکسرِ ثائے مثلثہ وفتحِ یای تحتانی، صفتِ مُردہ کو کہتے ہیں ـ (۱) اگرچہ صاحب غیاث نے منتخب سے استناد کیا ہے لیکن تعجب ہے کہ صاحب منتخب نے مرثیہ کے اصطلاحی معانی کا جو پہلو دکھایا تھا اِس کا ذکر نہیں کیا ـ منتخب میں مرثیہ کے معانی یوں درج ہیں " شعرکہ برائے مردہ گویند و اوصاف اوشمارند "(۲) انگریزی میں اس صنفِ شعر کے لئے ایلیجی (ELEGY) کا کلمہ استعمال ہوتا ہے ـ عجیب اتفاق ہے کہ ایک شعری تخلیق کے اعتبار سے انگریزی میں بھی اس کلمہ (ELEGY)

---

(۱) و (۲) غیاث اللغات باستناد کشف وصراح و مدار و خلاصۃ منتخب ـ

زین العابدین موتمن نے شعر و ادب فارسی (مطبوعہ کتاب خانہ ابن سینا طہران)
میں رثاء کی تعریف اس طرح کی ہے " بر اشعاری اطلاق می شود، کہ در ماتم گذشتگان و تعزیت خویشاوندان و یاران و اظہارِ تاسف وتالم برمرگِ سلاطین و صدور و اعیان و سران قوم و ذکر مصائبِ پیشوایان دین و آئمہ اطہار مخصوصاً حضرت سید الشہداء و شہدائی کربلا، شعرد مناقب وفضائل و مکارم تجلیل مقام و منزلت شخصِ متوفی " ص ۲۷ ـ

المنجد میں " رثاء و مرثیہ " کے ذیل میں یوں درج ہے :ـ

" المیت : بکاہ وعدد محاسنہ ـ نظم فیہ شعرا ـ رثی لہ : رق لہ و رحمہ (المنجد الاب لوئس معلوف یسوعی بیروت ۱۹۳۱ء)

سے بعینہ وہی کچھ مراد ہے جس کا ذکر صاحب منتخب نے کیا ہے (۱)

مرثیے کی اس تعریف سے یہ بات تو بالکل واضح ہوگئی کہ اس کا تعلق ان شعری تخلیقات سے ہے جو اصطلاحاً " محرکات داخلی کا نتیجہ ہوتی ہیں (۲) ان محرکات کو ذوق خود نمائی بھی کہہ سکتے ہیں ۔ کیونکہ اس ذوق کی تسکین کے لئے فن کار، شاعر، انشاپرداز اپنے ذاتی کوائف، واردات، افکار اور تجربات کا اس طرح ابلاغ و اظہار کرنا چاہتا ہے، کہ جو کچھ اس پر بیتی ہے دوسروں تک منتقل ہوجائے ۔

---

(۱) ہیری سیسل وائلڈ " دی ڈکشنری آف انگلش لینگویج " میں لکھتے ہیں کہ ایلیجی کا ماخذ یونانی کلمہ "ایلی گوس" ہے اور "غالباً" اس کلمہ کا ماخذ کسی مشرقی زبان کا کوئی لفظ ہے ۔ انہوں نے اس کے معانی کے دو سلسلے قائم کئے ہیں ۔ دوسرے سلسلے کے ماتحت لکھتے ہیں " نغمۂ ماتم " یعنی شعری تخلیق، جو مرنے والے یا مرنے والوں کے کارناموں کے ذکر، ان کی توصیف اور ان کی موت پر اظہارِ اندوہ سے عبارت ہو " (مطبوعہ لندن ۱۹۳۲ع کالم ۱ ص ۳۵۰ کلمہ ELEGY) انسائکلوپیڈیا برٹانیکا میں بھی ایلیجی کا یہی مفہوم بیان کیا گیا ہے " ایلیجی بین اور اظہار الم کی ایک مختصر نظم ہے جس کی وجۂ تخلیق کسی محبوب یا قابل احترام ہستی کی موت ہو ... گو قدیم یونان میں حب وطن اور جنگ و جدل کے جذبات بھی اس کی تخلیق کا باعث رہے .... مگر سولھویں صدی کے آغاز سے اب تک انگریزی ادب میں اس سے مراد ماتم اور بین ہی رہا ہے (جلد ۸ ص ۳۲۲ کلمہ ایلجی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری) ۔

(۲) ادب کی تعبیر کرانشا میکملن اینڈ کو ۱۸۹۶ع ۔ اس کے الفاظ یہ ہیں :۔

" The impulsive to express the subjective thought and emotion of the writer." (ذوقِ خود نمائی ۔)

ظاہر ہے کہ ابتدا میں شعرا نے اپنے اعزہ و اقارب کی موت پر اپنے غم و اندوہ کا اظہار کیا ہوگا۔ بتدریج یوں بھی ہوا ہوگا کہ کسی قبیلے یا کسی قوم کے کسی ممتاز فرد کے مرنے سے جو تاثر پیدا ہوتا ہے، اسے بھی شعری جامہ پہنا دیا گیا ہو اور مرنے والے کی عظمت کو اجاگر کرنے کے لئے اس کے اوصاف بھی بیان کئے گئے ہوں ۔ سلطان محمود کی وفات پر فرخی کا لکھا ہوا مشہور مرثیہ اس ضمن میں بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے ۔

رفتہ رفتہ جوں جوں اس قبیل کی شعری تخلیقات نے فروغ پایا ہوگا، فن کاروں نے افراد کے علاوہ اپنی قوم کے زوال اور مٹ جانے کا ماتم بھی کیا ہوگا ۔ مثال کے طور پر حالی کی مسدس میں جو رثاء کے عناصر ہیں، ان کا تعلق مسلمانوں کے اجتماعی زوال اور ان کی اخلاقی موت سے ہے ۔ یہ نظم ایک پوری قوم کا ماتم ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس قوم کے اوصاف بھی اجاگر کرتی ہے ۔

اقسام ان تصریحات کی روشنی میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مرثیے کی بنیادی قسمیں دو ہیں :-

۱ شخصی

۲ اجتماعی اور ملی (۱)

ظاہر ہے کہ شخصی مرثیوں میں اندوہ و حزن کا اظہار شدید تر ہوتا ہے اور دوسری قسم کے مرثیوں میں اس احساس کی شدت نسبتہً کم ہوتی ہے ۔

اردو زبان میں جو معرکے کے مرثیے پہلی شق کے ماتحت لکھے گئے ہیں ان میں زین الدین عارف کی وفات پر مرزا غالب کا کہا ہوا مرثیہ بڑے اہم مقام کا مستحق ہے اور خود مرزا غالب کا مرثیہ جو حالی نے کہا، تاثیر اور اہمیت کے لحاظ سے اول الذکر سے کسی طرح کم نہیں ۔

---

(۱) موتمن نے اپنی کتاب شعر و ادب فارسی (مطبوعہ کتاب خانہ ابن سینا تہران) میں مندرجہ ذیل اقسام رثاء گنوائی ہیں :- الف ۔ رثاء تشریفاتی و رسمی
ب ۔ رثاء شخصی و خانوادگی
ج ۔ رثاء مذہبی ص ۵۰ ۔ ۶۶

اسکے باوجودیکہ اُردو میں ایسے مرثیے خاصی تعداد میں لکھے گئے ہیں، جنہیں شخصی یا انفرادی کہا جاسکتا ہے کہ کلمہ مرثیہ ایک اصطلاح کی صورت اختیار کرچکا ہے اور اس کے اصطلاحی معانی میں صرف وہ شعری تخلیقات شامل ہیں، جن میں واقعۂ کربلا کے عوامل، اس واقعہ کی تفصیلات، اس واقعہ میں شریک افراد کی تصویر کشی، اور کردار نگاری نیز اس واقعہ کے اثرات سے تعرض کیا گیا ہے ۔ بالفاظ دیگر جب تک سیاق اور سباق سے کوئی اور مفہوم متبادر نہ ہوتا ہو، اس وقت تک مرثیہ کے معانی یہی سمجھے جائیں گے کہ اس میں حضرت امام حسین علیہ السلام اور ان کے رفقاء کی شہادت اور اس دردناک حادثے سے جو دوسرے واقعات مربوط ہیں، صرف انہیں کا ذکر ہوگا ۔

ب ۔ اُردو مرثیہ اور دوسرے اصناف سخن !

اب طبعاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مرثیہ ان اصطلاحی معنوں میں ان شعری تخلیقات میں شامل سمجھا جائے گا جو ذوق خود نمائی یعنی محرکات داخلی سے مربوط ہوتی ہیں یا اس مخصوص صنف ادب کا تعلق کسی اور محرک سے بھی ہوگا ۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بعض نقادوں نے مرثیے کو ایک قسم کا حماسہ ملی (EPIC)[2] سمجھا ہے ۔ اس اعتبار سے مرثیہ تحریک بیانی (The narrative impulse) (۱) یا ذوق داستان سرائی کی تخلیقات میں شمار ہوگا ۔ لیکن غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ مرثیے میں اگرچہ حماسہ یا ایپک کے عناصر ضرور پائے جاتے ہیں، مگر بنیادی طور پر یہ صنف سخن ایپک سے مزاج اور اسلوب دونوں لحاظ سے مختلف ہے ۔

مرثیہ اور ایپک | ایپک کے متعلق ارسطو کے خیالات کا لب لباب یہ ہے کہ یہ صنف سخن زندگی کے سنجیدہ مسائل کا عکس یا نقل (imitation) ہے ۔ اس کا انداز بیانیہ ہوتا ہے

---

(۱) کراشا کتاب مذکور ۲؎ ایپک (Epic) کے لئے صحیح اردو بدل ممکن نہیں ۔ اب تک جتنی اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں ۔ حماسہ ملی ان میں سے ایپک کا قریب المعنی ہے تفصیل آگے آئے گی ۔

اور اس میں شروع سے آخر تک ایک ہی بحر استعمال کی جاتی ہے — اس کے پلاٹ کی تعمیر بھی بالعموم ڈرامہ کی وضع پر ہوتی ہے — دونوں کی بنیاد ایک عمل واحد پر ہے، جو فی نفسہ مکمل ہو اور اس میں نقاطِ آغاز، عروج اور انجام موجود ہوں، تاکہ تخلیق اپنا خصوصی لطف پیدا کر سکے — اس کا مربوط، زندہ اور فنی تخلیق ہونا بھی لازمی ہے اگرچہ آغازِ بحث میں ارسطو نے ڈرامہ اور ایپک کی مشترکہ خصوصیات پر زور دیا ہے — لیکن وہ ان کے بنیادی اختلافات کو نظر انداز نہیں کرتا، جو طریق کار سے متعلق ہیں — وہ اس کی وضاحت یوں کرتا ہے کہ ڈرامہ کا تعلق کردار سے ہے، جبکہ ایپک کا بیانیہ سے — نیز ایپک کی طوالت میں المیہ کے مقابلہ میں بیان کو مؤثر اور عظیم بنانے کی گنجائش ہوتی ہے — سامعین کی اکتاہٹ کو دور کرنے اور تنوع پیدا کرنے کے لئے اس میں ضمنی حکایات کا بھی اضافہ کیا جا سکتا ہے — اس کے علاوہ بحر کا فرق بھی ہے — نیز ناقابلِ وقوع اور حیرت انگیز واقعات کے فنکارانہ بیان سے ناظرین کے تحیر اور دلچسپی میں بھی اضافہ کیا جا سکتا ہے (1)

---

(1) ~~ملاحظہ~~ دیکھئے
"Aristotle on the Art of Poetry, Translated into English by Ingram Bywater" (Oxford, 1954 pages 79-85) ~~"In the disputable and usually futile task of classifying the~~

~~Continued to next page~~

سی ایم باورا (C.M. Bowra) نے اپنی کتاب "ورجل تا ملٹن" کا آغاز ان فقرات سے کیا ہے :-

" شاعری کی طبقہ بندی اور اصطلاف کی کٹھن وادیوں میں ایپک کی تعریف کے متعلق کوئی زیادہ اختلاف نہیں ۔ متفقہ طور پر ایپک ایک طویل بیانیہ (نظم) ہے جس کا موضوع ایسے عظیم اور اہم واقعات ہوتے ہیں جو عملی زندگی بالخصوص ہنگامہ آرا واقعات مثلاً جنگ و جدل سے متعلق ہوں ۔ یہ (نظم) ایک مخصوص لطف کا سامان پیدا کرتی ہے ۔ کیونکہ ایسے (عظیم) کردار اور واقعات ہمارے انسانی عظمت شرافت اور کامرانی کے یقین میں اضافہ کا موجب ہوتے ہیں (۱) "

ایپک کی تعریف کے بعد وہ (Bowra) اسے دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے ۔ مستند (authentic) اور علمی (Literary) ایپک ۔ اول الذکر سے اس کی مراد وہ منظوم رزمیہ داستانیں ہیں جو سینہ بہ سینہ عوام اور گویوں کے پاس محفوظ چلی آتی ہیں اور ان کا تعلق کتب سے زیادہ روایت سے ہے ۔ ثانی الذکر سے اس کی مراد وہ رزمیہ منظومات ہیں جو سننے سنانے کے بجائے پڑھنے پڑھانے کے لئے لکھی گئی ہیں ۔ وہ یہ بھی دعویٰ کرتا ہے کہ ہومر نے اپنے مشہور شاہکار (ایلیڈ اور اوڈیسی) بیان (Recitation) کی غرض سے تخلیق کئے تھے اور ورجل کی اینیڈ اول الذکر کے برعکس لکھنے پڑھنے کے لئے معرض وجود میں آئی ۔ (۲) ظاہر ہے کہ دونوں حالتوں میں انداز بیان مختلف ہوگا ۔ اسلوب کے اس فرق کو تسلیم کرتے ہوئے فاضل نقاد دونوں حالتوں میں " ہیرو " کے اوصاف بھی متعین کرتا ہے ۔ پہلی صورت میں " ہیرو " ایک مثالی انسان ہے جو اپنے " مقصود "

---

1) In the disputable & usually futile task of classifying forms of Poetry, there is no great quarrel about the epic. An epic poem is by common consent a narrative of some length and deals with events which have a certain grandeur and importance and come from a life of action especially of violent action, such as war. It gives a special pleasure because its events and persons enhance our belief in the worth of human achievements and in dignity and nobility of man" page 1 Bowra C.M. from Virgil to Milton, Macmillan & Co, 1945.

2. ibid. 1 & 4 pp.

کے لئے کسی قربانی سے دریغ نہیں کرتا ۔ وہ بے پناہ قوت کا مالک ہے، یہاں تک کہ انسان کی بجائے دیوتا معلوم ہوتا ہے ۔ وہ آن کی خاطر اپنی جان کی بازی لگا دیتا ہے ۔ وہ محض اس لئے قابل اعزاز نہیں کہ اپنی بے مثال بہادری سے دنیا کو تباہ کر سکتا ہے، بلکہ اس لئے کہ وہ اپنے بلند مقاصد کے مقابلہ میں چند روزہ حیات کی مطلق پرواہ نہیں کرتا ۔ لیکن جب علمی ایپک وجود میں آئی، تو اس عہد میں ہیروازم کا وہ معیار باقی نہ تھا، جو ہومر کے وقت تھا ۔ انسانی اقدار تبدیل ہوچکی تھیں ۔ اِمتدادِ زمانہ سے حالات بدل چکے تھے ۔ شخصی بہادری کے قصے تقویمِ پارینہ ہوکر اپنا مقام کھوچکے تھے ۔ "فرد اور مذہب" یا "فرد اورمعاشرہ" کے تعلقات کی نوعیت تبدیل ہوچکی تھی ۔ انسانی عظمت کی پرکھ کے معیار بدل گئے تھے ۔ اب ہیرو شخصی وجاہت کی خاطر نہیں، بلکہ قوم اور ملک کی خدمت کے لئے جان دینے اور دُکھ اُٹھانے میں عظمت سمجھنے لگا تھا ۔ اس طرح ایپک رزمیہ سے حماسہ ملی کا روپ اختیار کر کے فلسفۂ حیات کے مضامین اپنے اندر سموچکی تھی ۔ (۱)

اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا مرثیہ فی الحقیقت ایپک ہے ؟ اور اگر ہے تو مذکورہ تقسیم کے مطابق کس نوع کے ماتحت ہے ؟

جہاں تک سوال کے پہلے حصہ کا تعلق ہے ہم اگر واقعہ کربلا اس کے اسباب وعلل اور نتائج، ہیرو کی عظمت، قربانی اور جذبہ کی طرف دھیان دیں، تو ہم سمجھتے ہیں کہ ایپک کی ساری ضروریات جن کا بیان گذشتہ بحث میں ہوا ہے پوری ہوگئی ہیں ۔ لیکن جب ان شرائط کو ذہن میں رکھ کر مرثیہ کا مطالعہ کیاجائے تو فیصلہ مشکل ہوجاتا ہے ۔ اور ہم جس نتیجہ پر پہنچتے ہیں وہ جناب آل احمد سرور کے الفاظ میں یہ ہے :۔

"مرثیہ کو پورے ڈرامہ کا بیک وقت تصور لنگ مشکل سے کر سکتا ہے ۔ زیادہ تر وہ ایک ہی واقعہ کو لیتا ہے، یا ایک کردار کو یا ایک موقعہ کو۔ وہ ہر چیز کے مخصوص عنوان بنالیتا ہے ۔

(۱) ایضاً " کتاب مذکور ص ۵ تا ۱۳ (ماخوذ)

رزمیہ کے معنی اس کے نزدیک لڑائی کے سین گھوڑے اور تلوار کی تعریف کے ہین" (۱)

وہ پورے واقعۂ کربلا کو بھی یکجا بیان نہین کرتا ۔ حالانکہ صرف اس سانحہ کے مکمل اور یکجا بیان سے بھی ایک مربوط اور مسلسل ایپک وجود مین نہین آسکتا ۔ کیونکہ بقول کلیم الدین احمد "واقعۂ کربلا مین کسی رزمیہ نظم کے عروج کا بلند ترین مقام ہونے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے، لیکن خود اس مین اتنی گنجائش و وسعت نہین کہ مکمل رزمیہ نظم کا موضوع بن سکے ۔ کامیابی کے لئے ضرورت تھی، اس کے ابتدا کی تلاش و جستجو کی ۔ ان مختلف درمیانی زینون کے بیان کی جو اس معرکہ کا سبب ہوئے ۔ اس جنگ کے اسباب گذرے ہوئے واقعات مین پنہان ہین ... مگر اس طرف شعراء نے توجہ نہ کی " (۲) پھر یہ بھی ہے کہ جب تک وہ شرائط، جن کا بیان ارسطو نے کیا ہے، پوری نہ ہون کسی نظم کو اصطلاحی معنون مین ایپک قرار نہین دیا جاسکتا ۔ مرثیہ مین نہ تو قصہ پیچیدہ ہوتا ہے، نہ نقاطِ آغاز، عروج اور انجام کا بیان کیا جاتا ہے اور نہ ہی مختلف واقعات کے بیان مین کسی ترتیب کا خیال رکھا جاتا ہے بلکہ ہر مرثیہ دوسرے مرثیہ سے آزاد اور علحدہ حیثیت کا مالک ہوتا ہے ۔ اس لئے انہین یکجا کرکے ایک کتاب کے مختلف ابواب کی حیثیت بھی عطا نہین کی جاسکتی ۔

ہان یہ تسلیم کرنے مین کوئی عذر ہی نہین ہوسکتا کہ مرثیہ اور ایپک مین بعض خصوصیات کا اشتراک موجود ہے، جن مین سے اہم ہیرو کا کردار ہے ۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کی ذات والا صفات مین وہ تمام خوبیان موجود ہین جو ایک کامیاب ایپک کے ہیرو مین پائی جاتی ہین ۔ مقاصد کی بلندی، حیات چند روزہ کے مقابلہ پر اصول کی ترجیح، قوم کی خاطر جان دینے اور دکھ اٹھانے مین دریغ نہ کرنا، ایپک کے ہیرو کی مخصوص صفات ہین اور حضرت امام علیہ السلام کی ذات مین بلا شک و شبہ موجود ہین ۔ مرثیہ گو شعراء ان صفات کا بیان موزون اور مختلف مقامات پر کرتے رہتے ہین ۔

---

(۱) مضمون " لکھنؤ اور اردو ادب " ۔ آل احمد سرور ۔ مطبوعہ بہترین ادب ۱۹۵۰ع شائع کردہ مکتبہ اردو ۔ لاہور

(۲) کلیم الدین احمد ۔ اردو شاعری پر ایک نظر ص ۱۳۵ ۔

بعض لوگ کسی مرثیہ گو کے مختلف مراثی سے بند قطع کرکے ایک مسلسل اور مربوط ایپک کی تشکیل بھی کردیتے ہیں ۔ میر انیس کے کلام سے ایسی ایک سے زیادہ کوششیں ہو چکی ہیں اور اب بھی جاری ہیں ۔ اس سلسلہ میں قابل ستائش کوشش جناب سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب کا " رزم نامہ انیس " ہے (۱) موصوف بھی اس امر پر متفق ہیں کہ " انیس کا ہر مرثیہ ایک مستقل نظم ہے " نیز " انہوں نے کبھی رزمیہ نہیں لکھا " (۲) ۔ مرثیہ گو کی نظر میں ہر مجلس کے مخصوص مقاصد تھے ۔ انہوں نے ایک مربوط ایپک لکھنے کی کوشش کبھی نہیں کی ۔ اگر مختلف مراثی کے بند چن کر ایک ایپک وجود میں آ بھی جاتی تو ظاہر ہے کہ وہ شاعر سے زیادہ مرتب کی صنعت کا کرشمہ ہوگی ۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ مرثیہ کو بھی ایپک کی طرح دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں ۔ حصہ اول میں وہ مرثیے داخل ہوں گے جو سوزخوانی کے لئے مخصوص تھے اور میر ضمیر اور ان کے معاصر مرثیہ گو حضرات کی ایجادات سے قبل وجود میں آگئے، یا اس کے بعد بھی اور بنیادی طور پر سوزخوانوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے منظوم ہوئے ۔ دوسرے حصے میں وہ اشعار ہوں گے جو " مرثیہ خوانی " کے لئے کہے گئے اور جن میں ادبی چاشنی، علمی انداز بیان، آرائش کلام اور محسنات شعر کا اہتمام غالب ہے ۔ اور یہ تخلیقات نہ صرف مرثیہ خوانی کے لئے مخصوص تھیں بلکہ مجالس سے نکل کر اہل علم و ذوق کی تسکین کا موجب بھی ہوئیں ۔ لکھنئو کے اصطلاحی مرثیہ کا بیشتر حصہ اسی قبیل سے ہے، مگر یہ تقسیم بھی اس طرح مکمل نہیں ہوسکتی جس طرح کہ " یونانی " اور " رومی " ایپک میں ممکن تھی ۔ کیونکہ یہاں فرق اقدارِ حیات کی تبدیلی کا نہیں، بلکہ صرف اسلوب بیان، ضخامت اور تنوع مضامین کا ہے ۔ کیونکہ مرثیہ کا ہیرو نہ صرف یہ کہ پہلوانِ داستان ہے، بلکہ اس کی ایک روحانی حیثیت بھی ہے اور اس کے مقاصد و نظریات کی چمک دمک پر امتدادِ زمانہ کا کوئی اثر نہیں ۔

---

(۱) مطبوعہ سرفراز قومی پریس لکھنئو ایڈیشن

(۲) ایضاً " دیکھئے دیباچہ صفحات ہ تا و جناب رضوی صاحب کے الفاظ یہ ہیں " کاش اس شاعر اعظم نے واقعات کربلا پر ایک طویل رزمیہ نظم تصنیف کی ہوتی "

اور گہرا مطالعہ کریں تو یہ تقسیم بھی بالکل غلط ہو جاتی ہے - کیونکہ قدیم مرثیے جنھیں ہم " نوحے " یا " بین " کی اصلاح سے بھی یاد کرسکتے ہیں واقعات کے بیان کی بجائے اپنے مخصوص مقصد " آہ و بکا " کا زیادہ خیال رکھتے ہیں اور انہیں یکجا کرکے بھی داستان کی تعمیر ممکن نہیں - لہٰذا شمالی ہند یا دکن کے قدیم مرثیے ایسی کی ان خصوصیات کے حامل بھی نہیں جو لکھنؤ کے اصطلاحی مرثیہ سے مخصوص ہیں -

مرثیہ اور مناظرِ فطرت کی تصویر کشی

اس بنا پر کہ مرثیہ نگار، واقعات کربلا کا بیان کرتے وقت مناظرِ فطرت کی تصویر کشی بھی کرتا ہے اس صنفِ ادب کا تعلق محرکاتِ وصفی (Descriptive impulse) سے بھی قائم ہوجاتا ہے -

مرثیہ گو شعراء کو بجا طور پر یہ فخر حاصل ہے، کہ انھوں نے اردو شاعری میں مناظرِ فطرت کی تفصیلی تصویرکشی کو رائج کیا اور اس طرح اس زبان کے سرمایۂ شعر و ادب میں اضافہ کا موجب ہوئے - یہ تصویر تین حالتوں سے خالی نہیں ہوتی -

۱ فرض کریں کہ ایک شہری آدمی اچانک کسی سرسبز پہاڑی علاقے میں جانکلتا ہے اور اس کی نظر کوہ قامت اور لہلہاتے ہوئے اشجار سے لدی ہوئی سرِفلک چوٹیوں سبز مخملی مخملین فرش سے آراستہ وادیوں بل کھاتی ہوئی ندیوں، ابلتے ہوئے چشموں، چہچہاتے ہوئے پرندوں، لہراتی ہوئی بیلوں، کھیلتے اور کلیلیں کرتے ہوئے ہرنوں اور ناچتے ہوئے موروں پر پڑتی ہے، تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں - اس حیرت کے عالم کو جب وہ بیان کرنے کی کوشش کرے گا تو ظاہر ہے کہ تصویر مکمل نہ ہوگی - اس کے صرف چند پہلو نمایاں ہوں گے جو اس کی حیرت افزائی کا موجب ہوئے تھے - باقی مواد پس منظر میں رہ جائے گا - مگر جس قدر نقوش بھی واضح ہوں گے وہ حقیقی اور قدرتی ہوں گے - منظر کی عظمت بالخصوص نمایاں ہوگی جو کہ شاعر کے تحیر کا موجب ہوئی تھی -

۲ مناظر فطرت کی تصویرکشی کی دوسری صورت یہ ہے، کہ فطرت، شاعر کی روح میں حلول کرگئی ہو اور وہ خود مناظر کا ایک حصہ ہوکر رہ گیا ہو - اردو شاعری میں اس قسم کی شعری

تخلیقات کا وجود عنقا ہے ۔

۳ تیسری صورت یہ ہے کہ انسانی جذبات کی تصویر نیچر کے چوکھٹے میں پیش کی جائے ۔ مثلاً غم کے بیان میں غمگین اور اداس اثرات کا تصور پیش کیا جائے اور خوشی کے جذبات کے ساتھ موسم بہار گل و بلبل اور لالہ و نرگس کی منظر کشی کی جائے ۔ گویا کہ حالات و جذبات کے فریم میں نیچر کی تصویر جڑ دی گئی ہے ۔ مرثیہ گو شعرا بالخصوص میر انیس کے کلام میں اسی قسم کے مناظر پیش کئے گئے ہیں جن سے کہ ایک مخصوص تاثر مقصود ہوتا ہے ۔

بعض اوقات واقعات کے بیان میں مخصوص کیفیات پیدا کرنے کے لئے بھی یہ کوششیں کی جاتی ہیں مثلاً دبیر کہتے ہیں :—

لو کھینچتا ہوں اب میں تصویرِ قتل گاہ   مقتل کی سمت دیدہ و دل کی کرونگا نگاہ

بے ساختہ زبان سے نکل جائیگی کہ واہ   لازم ہے واہ واہ کے ہو ساتھ آہ آہ

سرخی میں شاخِ گل جو عیاں گرد راہ ہے

اس باغ میں نسیمِ محمد کی آہ ہے

ظاہر ہے کہ اس سے کوئی تصویر مرتب نہیں ہوتی ہاں ایک مخصوص کیفیت کے وجود سے انکار ممکن نہیں علاوہ میر انیس مرحوم کے دیگر مرثیہ گو شعرا کے پیش کردہ بیشتر مناظر فطرت میں بالعموم جان نہیں ہوتی ۔ ہاں ایک پر شکوہ بہاریہ تشبیب ضرور موجود ہوتی ہے جسے مرثیہ کی اصطلاح میں چہرہ کہا جاتا ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان بزرگوں کا مطالعۂ فطرت بہت ناقص ہوتا ہے ایک تو مرثیہ گو شعرا کے ماحول میں عمدہ مناظر ہی کمی تھی اور پھر جو تھے انہیں ان لوگوں میں سے اکثر نے صرف تخیل کی آنکھ ہی سے دیکھا تھا ۔ لہذا تصویر پورے طور پر ابھرتی نہیں ۔ البتہ شکوہِ الفاظ سے کمی ضرور پوری ہو جاتی ہے ۔

مرثیہ اور داخلی شاعری

ایلیٹ نے ایک مضمون "شاعری کی تین آوازیں" (Three Voices of Poetry) میں ایک جرمن نقاد (Herr Benn) کا ذکر کیا ہے جو

رلکے کے مراثی کو داخلی شاعری میں شمار کرتا تھا (۱) ۔لیکن خود ایلیٹ (T.S.Eliot) اس سے اختلاف کرتے ہوئے اسے فکری **(meditative)** شاعری سے تعبیر کرتا ہے ۔ اس کے بعد اس نے اسی جرمن نقاد کے حوالے سے داخلی شاعری کی تعریف یوں کی ہے :-

" وہ کہتا ہے کہ شاعر کے ذہن میں ایک تخلیقی جنین یا جوہر پیدا ہوتا ہے - جسے شاعر کا ذخیرۂ الفاظ عالم وجود میں لانے کی کوشش کرتا ہے، مگر وہ اس خیال کے اظہار سے اس وقت تک قاصر رہتا ہے جب تک مناسب الفاظ نہ پالے اور وہ جنین یا جوہر اس وقت تک ناقابلِ شناخت رہتا ہے جب تک ~~مناسب الفاظ نہ پالے اور وہ جنین یا~~ کہ فن کار اسے مناسب الفاظ میں موزوں ترتیب نہ دے لے ۔ جب اسے اس کے لئے مناسب الفاظ ~~میں موزوں ترتیب~~ مل جاتے ہیں تو وہ ہیولیٰ (جسے جنین یا جوہر کا نام دیا گیا تھا) غائب ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ ایک شعری تخلیق لے لیتی ہے ۰۰۰۰۰۰ اس طرح شاعر گویا اپنے اس اضطراب سے نجات پالیتا ہے اور اس کی غرض اپنے جذبات کے ابلاغ کی بجائے محض روحانی اضطراب اور کرب سے نجات حاصل کرنا ہوتی ہے " (۲)

---

1) Eliot T.S., On Poetry and poets, Faber & Faber Ltd., 1957, page 97.

2) " He has something germinating in him for which he must find words; but he cannot know what words he wants; he cannot identify this embryo until it has been transferred into an arrangement of right order. When you have the words for it, the 'thing', for which the words had to be found, has disappeared and replaced by a poem ...... In other words again, he is going to all that trouble, not in order to communicate with any one, but to gain relief from acute discomfort." ibid.

کالنگ وڈ نے یہ مسئلہ کچھ زیادہ وضاحت اور شرح وبسط سے بیان کیا ہے ۔ وہ لکھتا ہے :۔

" جب کسی شخص کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنے جذبات کا ابلاغ کیا ہے تو اس سے یہ مراد ہوتی ہے کہ پہلے وہ شخص اپنے جذبہ کے وجود سے باخبر مگر اس کی حقیقت سے بےخبر ہے اسے صرف اسی قدر علم ہے کہ ایک تحریک یا ترغیب اسکے اندر جاری وساری ہے مگر اسے اس کی نوعیت کی شناخت نہیں ۔ اس حالت میں وہ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا ہے " میں محسوس کرتا ہوں " " " " " " " " مگر میں نہیں جانتا کہ مجھے پر کیا بیت رہی ہے " ۔ اس مایوسی اور اضطراب کی حالت سے وہ اپنے دل کی بات کہہ کر

" When a man is said to express emotion, what is being said about him comes to this. At first he is conscious of having an emotion, but not conscious of what this emotion is. All he is conscious is a perturbation or excitement which he feels going on within him, but of whose nature he is ignorant. While in this state, all he can say about bhis emotion is, "I feel ..... I do not know what I feel." From this helpless and oppressed condition he extricates himself by doing something which we call expressing himself. This is an activity which has some-thing to do with the thing which we call language; he expresses himself by speaking. It has also some-thing to do with consciousness. The emotion expressed is an emotion whose nature the person who feels it is no longer unconscious. It has also some-thing to do with the way in which he feels the emotion.

Continued

نجات حاصل کرتا ہے ۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جس کا تعلق زبان سے ہے کیونکہ ہر شخص
اظہار مافی الضمیر تقریر سے کرتا ہے اس کا تعلق شعور سے بھی ہے، کیونکہ وہ جذبہ جس کا
ابلاغ کیا گیا ہے اس کی ماہیت سے اب وہ شخص لاعلم نہیں ۔ اس کا تعلق اس انداز سے
بھی ہے جس سے کہ اسے اس کا احساس ہوا تھا ۔ ابلاغ کے بغیر اس کی حالت کو ہم نے مغلو
مغلوبانہ اور مایوسانہ سے تعبیر کیا تھا ۔ اور جب وہ اسے بیان کرچکتا ہے تو وہ یوں محسوس
کرتا ہے کہ اس کا اضطراب ختم ہوگیا ۔ اور اس کا جی ہلکا اور پرسکون ہوگیا ۔

As unexpressed he feels ~~in it~~ it in, what we have called a helpless and oppressed way, as expressed he feels in a way from which this sense of oppression has vanished. His mind is some-how lightened and eased.

This lightening of emotions which is some-how connected ~~wxkk~~ with the expression of them, has a certain resemblance to the ~~Katarsis~~ cathasis, by which emotions are earthed through being discharged into a make-believe situation but the two things are not the same. Suppose the emotion is one of anger. If it is effectively earthed, for example, for fancying oneself ~~kickin~~ kicking some-one down stairs, it is, therefore, no longer present in the mind as anger at all. We have worked it off and rid of it. If it is expressed, for example, into hot and bitter words, it does not disappear from the mind. We remain angry; but instead of a sense of oppression, which accompanies an emotion of anger not yet recognised as such, we have that sense of alliviation, which comes when we are conscious of our own anger, instead of being conscious of

Continued

جذبات کا اس طرح (بذریعۂ ابلاغ) ملکہ کرنا کسی قدر صحیح جذبات سے بھی
مشابہ ہے — جس میں کہ جذبات کو مصنوعی یقین کی حالت پیدا کر کے زمین دوز کر دیا جاتا ہے،
مگر دونوں چیزیں بالکل علیحدہ علیحدہ ہیں — فرض کیا کہ جذبۂ زیر بحث غصہ سے متعلق ہے
اگر اسے اچھی طرح سے زمین دوز کر دیا گیا — مثال کے طور پر یہ فرض کر کے کہ معتوب کو ٹھوکر
لگا کر زینہ سے نیچے گرا دیا گیا ہے، تو یہ جذبۂ غیظ کی حیثیت سے تحت الشعور سے کافور ہو گیا
اور ہم نے اس سے نجات حاصل کر لی — لیکن اگر اس کا کڑوے کسیلے الفاظ میں ابلاغ کر دیا
گیا تو یہ تحت الشعور سے غائب نہ ہوگا — اور ہم بدستور غضبناک ہی رہیں گے — مگر اب اس
اضطراب میں جو غصہ سے متعلق تھا اور اب تک غیر متعارف تھا کچھ تخفیف محسوس ہونے لگی —

---

it as an unidentified perturbation. This is what we refer to when we say that it 'does us good' to express our emotions.

The expression of emotion by speech may be addressed to some one, but if so, it is not done with the intention of arousing a like emotion in him. If there is any effect which we wish to produce in the hearer, it is only the effect which we call making him understand how we feel. But as we have already seen, this is just the effect which expressing our emotions has own ourselves. It makes us, as well as the people, whom we talk, understand how we feel. A person arousing emotions sets out to affect his audience in a way in which he himself is not necessarily affected. He and his audiance stand in quite different relation to the act, very much as a physician and patient

Continued

یہ اثر جذبۂ غیر متعارف کی صحیح تشخیص اور بطور جذبۂ خاص کی شناخت ہوجانے کی وجہ
سے ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ جذبہ کے ابلاغ سے ہمیں فائدہ ہوتا ہے، تو اس کا یہی مطلب
ہوتا ہے ۔ جذبات کا ابلاغ کسی مخاطب سے کیا جاتا ہے، مگر اِس حالت میں بھی یہ ارادہ
نہیں ہوتا کہ اس قسم کا جذبہ مخاطب کر اندر بھی پیدا کیا جائے ۔ ہم جو اثر مخاطب پر
پیدا کرنا چاہتے ہیں وہ اسی قدر ہے کہ ہم اسے سمجھا دیں کہ ہم کیا محسوس کرتے ہیں ۔

---

stand in quite different relations towards a drug administered by the one and taken by the other. A person expressing emotions, on the contrary, is treating himself and his audience in the same kind of way; he is making his emotion clear to his audience and that is what he is doing to himself.

It follows from this that the expression of emotion, simply as expression, is not addressed to any particular audience. It is addressed primarily to the speaker himself and secondly to any one who can understand.

Continued

مگر جیسا کہ دیکھا جا چکا ہے یہ پیدا شدہ، تاثر بعینہ وہی ہے، جو ابلاغ کے وقت ہم پر تھا ۔ یہ ابلاغ ہمیں اور ہمارے مخاطب کو سمجھا دیتا ہے کہ ہمارے دل کی کیفیت کیا ہے ۔ لیکن جو شخص اپنے ناظرین کے اندر کسی جذبہ کی انگیخت کرنا چاہتا ہے، یہ ضروری نہیں، کہ خود بھی اسی جذبہ سے متاثر ہو ۔ اس کا اور اس کے ناظرین کا، اس عمل سے رابطہ بالکل مختلف ہوتا ہے ۔ بالکل اسی طرح جیسا کہ ایک دوا سے طبیب اور مریض کا تعلق مختلف ہوتا ہے ان میں سے ایک دوا دیتا ہے اور دوسرا استعمال کرتا ہے ۔ اس کے خلاف وہ آدمی جو جذبات کا ابلاغ کرتا ہے وہ اپنی ذات اور ناظرین کو ایک ہی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے، وہ اپنے جذبات کو اپنی ذات اور ناظرین کے سامنے یکساں بے حجاب کرتا ہے ۔

اس سے ظاہر ہے کہ جذبات کے ابلاغ کے لئے مخصوص سامعین کی ضرورت نہیں، بلکہ بنیادی طور پر اس کا خطاب اپنی ذات سے ہوتا ہے اور ثانوی طور پر کسی ایسے شخص کے سامنے، جو سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہے ۔ اس صورت میں مقرر کا ناظرین سے انداز خطاب

Here again, the speaker's attitude towards his audience is quite unlike that of a person desiring to arouse in his audience a certain emotion. If that is what he wishes to do, he must know the audience he is addressing. He must know what type of stimulus will produce the desired kind of reaction in people of that particular sort, and he must adopt his language to his audience in the sense of making sure that it contains stimuli appropriate to their peculiarities. If what he wishes to do is to express his emotion intellegibly, he has to express them in such a way as to be intellegible to himself; his audience is then in the position of persons, who overhear him doing this. Thus the stimulus - and - reaction has no applicability to the situation." Collingwood R.C. The Principles of Art, Oxford University Press, London, 1955.

اس شخص سے بالکل مختلف ہوتا ہے، جو ان میں کسی مخصوص جذبہ کی انگیخت کا خواہش مند ہے ۔اور اگر اس کا مقصد، جذبہ انگیزی ہی ہو،تو اس حالت میں اس کے لئے ضروری ہے، کہ وہ حاضرین کا مزاج شناس ہو،نیز یہ بھی جانتا ہو،کہ کونسا مبہم مطلوبہ ردِّ عمل پیدا کر سکے گا ۔اس مقصد کے لئے اسے ایسی موزوں زبان استعمال کرنا ہوگی، جس میں مطلوبہ ہیجان انگیزی کی لیاقت یقینی طور پر موجود ہو،لیکن اگر وہ معقولیت کے ساتھ صرف اپنے جذبات کا ابلاغ ہی کرنا چاہتاہے، تو اس صورت میں اسے ایسی زبان استعمال کرنا ہوگی،جو خود اس کی اپنی ذات کے لئے واضح ہو اور اس کے ناظرین گویا اِس حالت میں ہوں گے،کہ اس کی کیفیات قلبی کو اتفاقی طور پر سن پائیں سہس " مبہم اور ردّ عمل " کی اصطلاح کا اس حالت پر اطلاق نہ ہوگا "

ہربن Herr Benn اور کالنگ وڈ Collingwood نے داخلی شاعری کی شناخت کے لئے جو اصول بیان کیے ہیں مرثیہ کو ان کی روشنی میں جانچنے کے لئے مندرجہ ذیل سوالات کا جواب لازمی ہے :۔

۱ ۔کیا فی الواقع مرثیہ گو شعراء کا خطاب بنیادی طور پر اپنی ذات سے ہوتاہے اور ان کے نزدیک سامعین کی حیثیت محض ثانوی ہوتی ہے ؟

۲ ۔ کیا وہ اپنے کلام میں ایسی زبان استعمال کرتے ہیں جو جذبات انگیزی کے لئے مخصوص ہے اور اس میں " مبہم اور ردّ عمل " کا مقصد کارفرما ہوتاہے ؟ یا محض ذوق خود نمائی کے زیر اثر اور اپنے قلبی اضطراب سے نجات حاصل کرنے کے لئے،وہ اپنے من کی دنیا اجاگر کرکے بالکل غیرارادی طور پر اپنے ناظرین کوبھی انہیں جذبات میں سرشار کر جاتے ہیں جو ان کے اپنے قلب میں موجزن تھے ؟

۳ ۔کیا مرثیہ گو شعراء خود ان جذبات سے عاری نہیں ہوتے،جن کی انگیخت وہ اپنے ناظرین کے اندر کرنا چاہتے ہیں ؟ دوسرے الفاظ میں کیا ان کا کلام خلوصِ احساس سے عاری ہوتا ہے ؟

مرثیہ گو کے مقاصد | ان اصولوں کی روشنی میں مرثیہ کا تجزیہ کرنے کے لئے ہمیں اس کی غرض و غایت کا جائزہ لے لینا چاہئیے ۔ کیونکہ اردو زبان کا اصطلاحی مرثیہ ایک مخصوص ماحول کی پیداوار ہے اور باعث تخلیق وہ مجالس عزا ہیں، جو اس ماحول میں بکثرت منعقد ہوتی تھیں ۔ دبیر کہتے ہیں :-

مجمع کو تفاخر ہے، کہ اثنا عشری ہوں مجلس کی ندا ہے، کہ میں رحمت سے بھری ہوں
چلاتی ہے ہر فردگنہ، میں نظری ہوں اخلاص یہ کہتا ہے، ریا سے میں بری ہوں

جو سورۂ اخلاص کے پڑھنے میں اثر ہے
وہ مرثیۂ ذکر شۂ جن و بشر ہے (۱)

دنیا اسی عزا کے لئے بیقرار ہے ان مجلسوں پہ، سایۂ پروردگار ہے
اب مومنوں کو رونے میں کیا انتظار ہے روح جناب فاطمہ، امیدوار ہے

حوریں ادب سے مجلس ماتم میں آچکیں
زہرا جناں سے رونے کو تشریف لا چکیں (۲)

ایک جگہ ان حاضرین مجلس سے شکایت کرتے ہیں، جو مجالس کے آداب سے بے پروا ہی برتتے تھے :-

گویا خبر نہیں، کہ یہ دربار کون ہے کس کی عزا ہے ؟ اور عزادار کون ہے ؟
آنسو کا کیا بہا ہے ؟ خریدار کون ہے ؟ عاصی ہے کون ؟ رحمت غفار کون ہے ؟

آیا نہیں خیال، کہ یہ کیا مقام ہے ؟
ادنیٰ ثواب رونے کا اعلیٰ مقام ہے (۳)

---

(۱) مرثیہ " اے شمس و قمر نور کی محفل ہے یہ محفل " مراثی دبیر ج ۱ نولکشور ۱۹۳۷
(۲) مرثیہ "کوہ رقیم پر جو علی کا گذر ہوا " ایضا " ص ٦
(۳) مرثیہ " کس کے زبان سے پیاس نے پائی یہ آبرو " ایضا " "

میر انیس کے نزدیک بھی ان مجالس کے فضائل و مکارم یہی تھے ۔ چنانچہ فرماتے ہیں :

فرماتے ہیں یہ شہ‌مون کے حق میں شہِ اکرم یہ بزم عزا ہوتی ہے جس گھر میں فراہم
بن جاتے ہیں اشک ان کے مرے زخموں کے مرہم یہ لوگ ہیں سب میرے مصاحب مرے ہمدم
ہوجاتا ہے کوئی تو بکا کرتا ہوں میں بھی
ان کے لئے بخشش کی دعا کرتا ہوں میں بھی

کیوں مومنو ! کیا فیض ہے کیا لطف و عطا ہے کیا مرتبۂ اشک ہے، کیا اجر بکا ہے
گوہر ہیں یہ، وہ جن کا خریدار خدا ہے جو کچھ ہے سو بس دوستیٔ آلِ عبا ہے
دنیا یہ، نہ دولت یہ، توجہ ہے نہ زر پر
زہرا کی نظر پڑتی ہے، اشکوں کے گہر پر ۔

جو لوگ ہیں پاک، انہیں دوزخ سے نہیں باک منہ اشکوں سے دھویا کہ گناہوں سے ہوئے پاک
ہے دولتِ ایمان، غم سبطِ شہِ لولاک ہوجاتی ہے کیا بعد بکا طبع فرحناک
آنکھوں کی ضیا رخ کی صفا، دل کی جلا ہے
سب ایک طرف گلشن فردوس ملا ہے

مرزا دبیر مرحوم، ایک جگہ مجالس عزا کے انعقاد کی غرض و غایت کے علاوہ خود تخلیقِ مرثیہ کا سبب بھی بیان کرتے ہیں :-

پوچھا خرد نے نزع کے غم سے حزین ہے جان فرمایا جان نثارِ حسینی کو ہے امان
پوچھا لحد میں چین ہو کیونکر، کہا کہ ہاں تکیہ حسین پر ہے تو ہے قبر بھی جنان
کی التجا، کہ شوق ہے جنت کے بیت کا "
بولے مسیح، "مرثیہ کہہ اہل بیت کا" (۱)

۱۔ مبتذل، مرثیہ "شمعیاں کے عارضہ سے جو دلِ ناتواں بکرا"
ص ۱۴۵ - ج ۱ - نولکشور ۱۹۳۲ء

مرثیہ اور مذہبی شاعری | ابھی تک یہ طے نہیں ہوپایا تھا کہ مرثیہ "داخلی شاعری" میں شامل ہے یا نہیں، مگر مرثیہ کے مقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے ہم مذہبی شاعری کی حدود میں داخل ہوگئے ہیں اور اگر یہ ثابت ہوجائے کہ مرثیہ " مذہبی یا دینی شاعری " کی اصناف میں سے ہے،تو یہ دنیا کے عظیم ادب میں شامل نہیں ہوسکتا ۔

ایلیٹ کا مرثیہ کے متعلق ایک اشارہ اس سے پیشتر نقل کیا جا چکا ہے ۔وہ رلکے کے مراثی کو تفکرانہ (meditative) نظم سے تعبیر کرتا ہے (۱) اور یہ کلمہ مذہبی رجحان کی طرف رہنمائی کرتا ہے ۔

ایلیٹ نے اپنے ایک اور مضمون مذہب اور ادب میں دونوں کے تعلقات کو اس طرح واضح کیا ہے :۔

" مذہب اور ادب میں دوسرا تعلق وہ ہے جس کی جھلک ہمیں مذہبی اور دینی شاعری میں دکھائی دیتی ہے ۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ مشتاقان شعر و سخن کا دینی شاعری کے متعلق نقطہ نظر کیا ہے ۔میرا مطلب ان لوگوں سے ہے، جو شعر و ادب سے براہِ راست لطف اندوز ہوسکتے ہیں، نہ کہ ان لوگوں سے جو دوسروں کی تعریف و توصیف کے مقلدی ہیں یا اولی الذکر اشخاص، غالبا" یہ کہیں گے، کہ جب آپ کسی شاعر کے کلام کو مذہبی شاعری سے موسوم کرتے ہیں، تو اس کا مطلب یہ ہے، کہ آپ نے اس کے کلام کی چند واضح کمزوریوں کی طرف اشارہ کیا ہے، کیونکہ شعر و سخن کے دلدادگان کی اکثریت مذہبی شاعری کو ادنی شاعری

(۱) اس کے الفاظ یہ ہیں :۔

" I feel sure such poems as Rilke's Duinese Elegies and Volery's La Jeune Parque where he speaks of 'Lyric Poetry' them I should prefer to say 'meditative verse'.

Page 97. Essay 'The Three Voices of Poetry " on Poets and Poetry, T.S. Eliot, Faber & Faber 1957.

کی ایک قسم سمجھتی ھے ۔ مذھبی شاعر سے مراد ایسا شاعر نہین جو اپنا سارا کلام مذھبی رنگ مین بیان کرتا ھے بلکہ ایسا شاعر مراد ھے جو کہ اس موضوع کے ایک محدود حصہ سے بحث کرتا ھے اور ان جذبات کو نظر انداز کردیتا ھے، جنہین لوگ شدید جذبات سے تعبیر کرتے ھین اور اس طرح ان سے اپنی لاعلمی کا اقبال کرتا ھے (۱) ۔

"The second kind of relation of religion to literature is that which is found in what is called 'Religious' or devotional poetry. Now that is the usual attitude of the lover of poetry __ and I mean the person who is genuine and first hand enjoyer and appreciater of poetry, not the person who follows the admiration of others ___ towards this department of poetry .... He believes, not always, explicitly, that when you qualify poetry as 'religious' you are indicating very clear limitations. For the great majority of people who love poetry, religious poetry is a variety of minor poetry: the religious poet is not a poet who is treating the whole subject-matter of poetry in a religious spirit, but a poet who is dealing with a confined part of this subject matter: who is leaving out what men consider their major passions, and thereby confessing his ignorance of them."

Eliot. T.S., Religion and Literature, Selected Essays, Page 390, Faber & Faber, 1951.

اب تک ہماری بحث جس انداز سے چلتی رہی ہے، اس سے یہ اخذ ہوتا ہے کہ "مرثیہ میں " بقول کلیم الدین احمد صاحب " مضمون ایک پرزور مذہبی جذبہ سے تعلق رکھتا ہے ۔ اس لئے اس کے بیان میں وہ شاعرانہ حسن وصداقت عموماً" ممکن نہیں جو رستم و سہراب کی خونی داستان میں موجود ہے ۔ شاعر اور سامعین اس زبردست مذہبی جذبے سے متاثر ہوتے ہیں کہ اس لئے شاعر اسے محض شاعری تصور نہیں کرتا اور سامعین بھی اسے معیار شاعری سے نہیں جانچتے " (۱) لیکن موصوف یہ بھی فرماتے ہیں کہ "بیشتر مذہبی مضامین موضوع شاعری ہوسکتے ہیں بشرطیکہ شاعر ان سے اپنی شخصیت کو علیحدہ کر سکے اور ان پر دور سے ناقدانہ نظر ڈال سکے (۲)

ادب عالم میں بہت سے ایسے شاہکار موجود ہیں جن کا موضوع بنیادی طور پر مذہبی عقائد سے متعلق ہے ۔ مگر وہ اعلیٰ شاعری کا حصہ ہیں ، مثلاً" رامائن " " فردوس گم گشتہ " جہنم " وغیرہ ۔ اصل مسئلہ انسانی اقدار پر ہمہ گیر بحث کا ہے ۔ اگرچہ شاعر کا خطاب بنیادی طور پر اپنی ذات سے ہوتا ہے اور ناظرین کی حیثیت محض ثانوی ہوتی ہے ۔ لیکن اس وقت تک جب تک کہ ناظرین شاعر کے دل کی بات کو اپنے دل کی کیفیات کے مطابق نہیں پاتے انہیں اس کے کلام سے کوئی دلچسپی پیدا نہیں ہوتی ۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا مرثیہ (باوجودیکہ اس کی وجہ تخلیق مجالس کی مانگ کو پورا کرنا ہے) اپنے اندر اس قدر جاذبیت رکھتا ہے کہ اس سے غیر شیعہ بلکہ غیر مسلم بھی اسی طرح لطف اندوز ہوسکیں، جس طرح کہ عقائد کا پابند، ثواب کا طالب اور بخشش کا طلبگار؟

---

(۱) اردو شاعری پر ایک نظر ۔ کلیم الدین احمد ص ۱۳۱ ۔
(۲) ایضــــــاً "

ڈاکٹر احسن صاحب فاروقی کی اس رائے پر کہ مرثیہ کے مخاطب بنیادی طور پر شیعہ غالی اور پنجتنی ہیں، تبصرہ کرتے ہوئے مرزا جعفر علی خان صاحب اثر یوں رقم طراز ہیں:(الف)

" فاروقی صاحب کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے، کہ مجلس عزا فرقہ شیعہ کی ایک اہم مذہبی رسم ہے اور مرثیہ کو بالکل مجلس سے الگ کرکے مرثیہ کی کوئی ضرورت یا اہمیت نہیں سمجھی جاتی تھی (۱) ۔فاروقی صاحب کا یہ ادعا بھی صحیح نہیں کہ مجلس عام طور پر اس لئے برپا کی جاتی تھی، کہ امام حسین کی دردناک شہادت کا بیان کیا جائے —— بلکہ مجلس کا منشا صرف یہی نہیں ہوتا تھا بلکہ امام حسین اور ان کے اعزہ و رفقا و اہل بیت کے کردار کی مصوری بھی ہوتی تھی ۔ان کے فضائل و مکارم اخلاق بھی بیان کئے جاتے تھے ۔ اور خاتمہ کسی دردناک واقعہ پر ہوتا تھا جس کا حکمی ہونا قدرتا" لازم تھا " (۲)

جہاں تک مرثیہ اور مجالس کی غرض و غایت کا تعلق ہے، اس میں اختلاف کی قطعا" کوئی گنجائش نہیں کہ مدح آل عبا، ذکر مصائب شہدائے کربلا اور اس پر گریہ و بکا، کو مرثیہ کے مقاصد سے خارج نہیں کیا جاسکتا ۔البتہ ان مقاصد کے حصول کے لئے اعلی ادبی شعور اور فنکاری سے کام لیا جاتا ہے ۔اس لئے جمالیاتی اقدار اور انسانی فطرت کی پیچیدگیوں کے اسرار و رموز، مرثیہ کے حدود میں غیر شعوری طور پر شامل ہونگے، کیونکہ شاعر، فن کار، مصور، سنگتراش، چاہئے حقیقت کی کوئی قدر بھی ملحوظ رکھے، نہ صرف یہ کہ اس کا اظہار وہ صرف پیرایہ جمال ہی میں کرے گا، بلکہ اس میں خلوص احساس خود بخود پیدا ہوجائے گا، کیونکہ حقیقت اور خلوص علحدہ علحدہ اشیا نہیں ۔اس حالت میں مرثیہ پر نہ تو " مہیج اور ردعمل " کے اصول کا اطلاق ہوگا اور نہ ہی ہمیں مرثیہ گو شعراء کے خلوص احساس پر شبہ ہوگا کیونکہ

---

(۱) انیس کی مرثیہ نگاری ص ۱۰ اثر لکھنوی مطبوعہ دانش محل لکھنؤ

(۲) ایضا" ص ۱۳

الف (فاروقی صاحب کی جن آرا کا ذکر جناب اثر نے کیا ہے وہ ان کی کتاب مرثیہ نگاری و انیس مطبوعہ اردو اکاڈمی لاہور ص ۲۳ تا ۲۵ پر درج ہیں ۔)

بقول برٹرینڈرسل "احساسِ حقیقت یا اعتقاد کی داخلی ماہیت یہ ہے کہ اس احساس کا تعلق بہ نسبت دیگر اشیا کے جذبات سے قریب تر ہے" (۱) لہذا ہم اس صنفِ سخن کو بین الاقوامی عظیم ادب سے خارج نہیں کرسکتے ۔

مرثیہ کے دیگر مقاصد ۔ مداحی | چنانچہ مرثیہ گو شعراء کے کلام کے مطالعہ سے گریہ و بکا کے علاوہ دیگر مقاصد کا سراغ بھی ملتاہے ۔ دبیر ؎

موزوں ہو شانِ مصحفِ ناطق کی اس نمط　　　سبحان کہے عنایت سبحان ہے یہ فقط

مکے کے شاعروں کے ہیں دعوے کروں غلط　　　حسان سے لوں غلامیٔ حُسنِ بیان کا خط

میزانِ قدر میں مرے مضموں تُل گئے
اب سبعۂ معلقہ کعبے سے کُھل گئے　(۲)

مندرجہ بالا بند سے یہ صاف ظاہر ہے کہ مرزا دبیر اپنے مرثیہ کا ایک مقصد، مصحف ناطق، یعنی حضرت امام حسین علیہ السلام کی شان کا بیان بھی سمجھتے ہیں، نیز اعلیٰ ادبی شعور کا دعوی بھی کرتے ہیں ۔

کردار نگاری | ہماری زبان میں کسی کی تعریف سے مراد نہ صرف اس کی مدح ہوتی ہے بلکہ تعارف بھی مقصود ہوتا ہے ۔ مثلاً " آپ کی تعریف کیا ہے ؟ یا زاویہ قائمہ کی تعریف کرو" اس لئے مدح و ستائش کے پردہ میں آئمۂ اطہار اور دیگر افرادِ داستان کے کردار کے بعض پہلو بھی نمایاں ہوتے ہیں مثلاً دبیر کہتے ہیں :-

ذکر اس کے سخن کا ہے، جو فخرِ فصحا ہے　　　خود آیہ رحمت ہے، سخن وحیِ خدا ہے

گویا اس شعر میں حضرت کے کردار کی بعض صفات، فصاحت، رحمت اور صاحبِ وحی ہونے کا بیان ہے، بعض مقامات پر خود کردار کی زبانی اس کی بعض صفات، مکالمات کی شکل میں بیان ہوتی ہیں نیز ان مکالمات میں ہمیں ان کرداروں کی ذہنی کشمکش اور جذبات و احسات کا

Bertrand Russel, The Analysis of Mind" chapt. XII at Page 252, Unwin Bros. Woking. 1951

(۲) مراثی دبیر ج ۱ ص ۲۸ (مرثیہ انگشتری عرش کا یارب نگین دکھا) نولکشور ۱۹۳۷ء

In its inner nature, belief or the sense of reality is a sort of feeling more allied to the emotions than to anything else"

بھی پتہ چلتا ہے ۔ جو عمل اور رد عمل کے اصول پر ظاہر ہوتے قدرتی ہین :

مثلاً حضرت امام حسین علیہ السلام لشکر کفار سے خطاب فرماتے ہین (دبیر) ۔

پانی نہ ملا اس کا نہ شکوہ نہ گلا ہے ۔ تم ظلم و ستم کرتے ہو گویان لب پہ دعا ہے

ھقدم سے ہر اک سانحہ پر صبر کیا ہے ۔ پر اب بھی برائی سے جو باز آؤ بھلا ہے

مظلوم کا بیکس کا ستانا نہین اچھا

سید کا مسافر کا رلانا نہین اچھا

خیر اس پہ بھی راضی ہون امام اپنا نہ سمجھو ۔ پر چاہتا ہون یہ کہ مزاحم نہ میرے ہو

لے کر حرم احمد مختار کو یا رو ۔ مین یہان سے چلا جاؤن کسی اور طرف کو

بستی مین کسی سے نہ ملاقات کرون گا

جنگل مین بسر اپنی مین اوقات کرون گا (۱)

ظاہر ہے کہ اس خطاب مین حضرت کے کردار کے بعض پہلو مثلاً تحمل دور اندیشی اور صبر و شکر نمایان ہوتے ہین نیز دیگر افراد مرثیہ بلکہ فریق مخالف کے بعض افراد کے کردار پر بھی روشنی پڑتی ہے اور ان کے جذبات کی ترجمانی بھی ہوتی ہے ۔ (۲)

مرثیہ اور المیہ الخ : اس قسم کی کردار نگاری کی بنیاد پر بعض حضرات مرثیہ کے ڈانڈے المیہ سے بھی ملاتے ہین ۔ لیکن وہ اس امر کو نظر انداز کر جاتے ہین کہ المیہ بنیادی طور پر اسٹیج کے لئے مخصوص ہے ۔ مرثیہ اپنے اسلوب بیان کے لحاظ سے المیہ کے ذیل مین شمار نہین کیا جاسکتا ۔ اگرچہ اس مین کوئی شک نہین کہ واقعۂ کربلا دنیا کا سب سے بڑا المیہ ہے اور یہ بھی درست ہے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی ذات بابرکات ایک عمدہ المیہ کا

---

(۱) مراثی دبیر ج ۱ ص ۱۱۶ نولکشور ۱۹۳۷ء

(۲) جذبات کی اس ترجمانی کے لئے ضروری ہے کہ شاعر اپنے آپ کو متعلق کردار کی جگہ فرض کر کے محسوس کرے ایسے جذبات کو "جذبات مفوضہ" (Vicarious emotions) کا نام دیتے ہین ۔

هیرو بننے کے لئے نہایت موزون هے ـ مگر موضوع بحث صنفِ مرثیه هے نه که واقعه کربلا ـ دونون کو ایک سمجھنا منطقی غلطی هے ـ هان واقعات کے بیان مین کئی جگه المیه کے بنیادی عناصر ابھر آتے هین اور خوف اور رحم کے جذبات کی انگیخت کا موجب هوتے هین، جن سے اعلیٰ اخلاقی اقدار کی طرف توجه منعطف هوتی هے ـ

مرثیه مین واقعات کا بیان

ایپک اور مرثیه کی بحث مین یه واضح کیا جاچکا هے که مرثیه گو شعراء تمام داستان کو ایک مربوط صورت مین بیان کرنا نهین چاهتے ـ کیونکه مرثیه ایک ایسی مجلس مین پڑھنے کے لئے لکھا جاتا هے، جو ایک محدود وقت کے اندر ختم هوجاتی هے ـ اس لئے ایک مجلس مین ایک هی واقعه بیان کیا جاسکتا هے ـ

چونکه هر واقعه کا تعلق زندگی کے کسی مخصوص پہلو سے هوتا هے اس لئے واقعه نگار کے لئے زیاده تفصیلات مین جانا ضروری نهین ـ بلکه وه ایک مخصوص پہلو نقطه نظر، ماحول فضا یا کردار کو نمایان کرتا هے ـ البته مواد کی ترتیب مین اِسے بمقابله دیگر اصناف سخن کے مرثیه مین زیاده احتیاط اور فنکاری سے کام لینا پڑتا هے، تاکه مناسب فضا کی تشکیل هوسکے ـ انتشار کا خطره باقی نه رهے اور توازن و مسلسل ارتقاء کی کیفیت شروع سے آخر تک قائم رهے ـ اس لئے وه ان جزئیات اور تفصیلات کو خارج کردینے مین حق بجانب هوتا هے جو شدت تاثر مین ممد نه هون ـ

زندگی بڑے متضاد عناصر کے مجموعے کا نام هے اور انهی عناصر کی باهمی آویزش سے واقعات کی تشکیل هوتی هے ـ یه چپقلش یا نزاع یا تو خارجی حالات اور اتفاقات کی بنا پر هوتی هے، یا اس کے اسباب و علل، کردارون کی نفسیاتی تشکیل مین تلاش کیے جاسکتے هین ـ پہلی صورت مین کردارون کی حیثیت ضمنی هوتی هے، اور ان کی شخصیت مجموعی طور پر زیر بحث نهین هوتی ـ کیونکه عین ممکن هے، که وه خاص واقعه، متعلقه کردار کی شخصیت کے کسی ایک هی پہلو کو نمایان کرتا هو ـ دوسری حالت مین کردارون کی داخلی کیفیات کی جائزه

کے لئے ان کے نفسیاتی جائزہ کی ضرورت ہوتی ہے، دونوں حالتوں میں موضوع کا منطقی ارتقا تسلسل اور انضباط، بے حد ضروری امور ہیں ۔یہاں اس امر کا ذکر بھی بے حد ضروری معلوم ہوتا ہے، کہ اکثر واقعہ نگار کرداروں کی تحت الشعوری گتھیاں سلجھانے کی بجائے اپنے تحت الشعور کی تلاشی لینا شروع کر دیتے ہیں ۔اسی طرح بیان میں الجھن پیدا ہوتی ہے ۔

واقعات کے بیان میں پلاٹ اور کرداروں کی اہمیت کو کلی طور پر نظر انداز کرنا تو بے حد مشکل ہے، لیکن ان کی حیثیت بیشتر ثانوی بھی ہوسکتی ہے ۔اصل چیز تو وہ بنیادی خیال ہے، جو پلاٹ اور کرداروں کی تشکیل کرتا ہے ۔مرثیہ میں واقعات کے پیش کرنے کا پیرایہ انداز، فضا، ماحول کی تشکیل اور تعارف کے لئے کافی گنجائش پیدا کردیتا ہے اور مرثیہ گو اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھاتے ہیں ۔

وحدتِ تاثر کے علاوہ مرثیہ گو شعراء کے سامنے چند مخصوص مقاصد بھی ہوتے ہیں مثلاً شہداء و دیگر مظلومین کربلا کی عظمت کو اجاگر کرنا ۔فریقِ مخالف کی شقاوت، ظلم اور بے رحمی کو نمایاں کرنا اور اس طرح مجلس میں گریہ و بکا پیدا کرنا ۔اس لئے وہ احساسِ تحیر سے زیادہ احساساتِ الم پر زیادہ زور دیتے ہیں ۔

مرثیہ کی طوالت | جہاں تک بیانِ واقعات کے سلسلہ میں وقت کی تعیین کا تعلق ہے، اس کے متعلق کوئی حتمی فیصلہ نا ممکن ہے ۔ایک ہی واقعہ طویل بھی ہوسکتا ہے اور مختصر بھی ۔مگر مجلس کے وقت کی رعایت سے، مرثیہ گو شعراء بھی اپنے مراثی کو محدود کرلیتے ہیں۔ انیس کے ہاں بعض مرثیے دو سو بند سے بھی طویل ہیں ۔دبیر کے طویل مرثیے بھی دو سو بندوں تک پہنچ جاتے ہیں لیکن جو مرثیے آخر الذکر نے سوزخوانوں کے لئے لکھے وہ چالیس پچاس بند کے اندر اندر ختم ہوجاتے ہیں ۔

اس طویل بحث کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ہمارے بیان کردہ اصطلاحی معانی کے مطابق مرثیہ اردو شاعری سے مخصوص ہے ۔دنیا کی غالباً" کسی بھی

زبان مین ان اصطلاحی معانی مین مرثیہ نہین لکھا گیا (۱) یہی وجہ ہے کہ اصنافِ ادب متعین کرتے وقت اردو مرثیہ اصطفاف اور طبقہ بندی (Classification) کے معین مغربی اصولون کے مطابق کسی ایک تخلیقی محرک سے مخصوص نہین کیا جاسکتا ـ اس کے محرکات متنوع ہین ـ اس کا تعلق ذوق داستان سرائی (۲) سے بھی ہے اور ذوق خود نمائی (۳) اور ذوق بزم آرائی سے بھی ـ میر انیس مرحوم نے اپنے مندرجہ ذیل مشہور و معروف بند مین مرثیہ کی اس ہمہ گیری کو کیا خوب نظم کیا ہے ؎

بزم کا رنگ جدا ، رزم کا میدان ہے جدا یہ چمن اور ہے زخمون کا گلستان ہے جدا
فہم کامل ہو تو ہر نامہ کا عنوان ہے جدا مختصر پڑھ کے رلا دینے کا سامان ہے جدا

دبدبہ بھی ہو مصائب بھی ہون توصیف بھی ہو ،
دل بھی محظوظ ہون رقت بھی ہو تعریف بھی ہو .

مرثیہ کی اس ہمہ گیری کی وجوہات چند در چند ہین ـ اول یہ کہ یہ صنفِ سخن ایک مخصوص ماحول اور معاشرہ کی پیداوار ہے جس کے طبعی تقاضے اس امر کے متقاضی تھے

---

(۱) ملاحظہ ہو کاشف الحقائق (سید امداد امام اثر) جلد ۱ ص ۱۲۱
مرثیہ نگاری اور انیس (محمد احسن فاروقی) ص ۱۲
غزل اور متغزلین (ابواللیث صدیقی) ص ۶۲
لکھنئو اور اردو ادب (آل احمد سرور) مطبوعہ بہترین ادب ۱۹۵۰ء ص ۴۹ و ۵۰

(۲) (۳) (۴) ـ کراشا نے اپنی کتاب (تعبیر ادب) مین ادبی تخلیقات کے تین بنیادی محرک قرار دیے ہین ـ ذوق داستان سرائی سے وہی محرک مراد ہے جسے مغربی انتقاد Narrative Impulse کہتا ہے ـ ذوق خود نمائی وہ تمام عوامل تخلیق مراد ہین جو ذاتی کوائف اور شخصی واردات کے بیان سے پیوستہ ہین (اس محرک پر تفصیل سے بحث ہوچکی ہے) ذوق بزم آرائی سے وہ تمام محرکات بزم آرائی مراد ہین جو انسان کو اس امر کی ترغیب دلاتے ہین کہ وہ اپنے ہم جنسون کی زندگی کی تصویر کھینچے اور ان کے افکار و تصورات دوسرون تک منتقل کرے ـ (The impulse to portray human life and character)

کہ مجالس میں ایک طویل اور متنوع نظم پڑھی جائے، جو نہ صرف مقاصد کی تکمیل کے علاوہ ان کے لئے ذہنی لذت کا بھی باعث ہو — اور ایک فارغ البال طبقے کی عام تہذیبی قدروں کو باقی رکھنے کی سعی بھی کرے — ~~اور پھر~~ خود مرثیہ گو بھی، اپنی مجالس کو بارونق اور دلچسپ بنانا چاہتے تھے — ان کے تبلیغی مقاصد بھی اس امر کے متقاضی تھے کہ حاضرین کی تعداد روز افزوں ~~گرچکی~~ رہے — ان سب محرکات نے مل جل کر مرثیہ کا قالب تیار کیا اور اس میں مدغم ہوگئے —

دوسرے بقول پارکر "قدیم یونانیوں کے عہد سے لے کر آج تک بہت سی نئی اصناف، مثلاً انشائیہ، ناول اور افسانہ وغیرہ ظہور میں آچکی ہیں اور ہر ایک کے لئے علیحدہ نام اور تعریف کی ضرورت ہے — بعض ایسے شاہکار بھی تصنیف ہوچکے ہیں، جن کے ڈانڈے ایک سے زیادہ اصنافِ سخن کی سرحدوں سے جا ملتے ہیں — مثال کے طور پر شیکسپیئر نے بھی کبھی خالص المیہ یا طربیہ نہیں لکھا — بلکہ زندگی کے بیان میں اس نے ان دونوں کو سمونے کی کوشش کی ہے — اور اس طرح نئے اور مزید زور دار اثرات پیدا کرنے کے علاوہ انہیں زندگی کے قریب تر کردیا ہے" (۱)

Critical Essays of to-day,Parker.E, Macmillan,London, 1932- Page X

اصل عبارت یوں ہے :-

" Since Greek times, however, " New forms" like ~~this~~ the essay, the novel, the short story have arisen, each of which needs a fresh definition of its own. Further, there have been produced literary works which partake of the characters more than one of the simple Greek forms. Shakspere, for example, seldom wrote pure comedy or pure tragedy, but he preferred in his "imitation of life" to blend these forms and thereby achieved new and often very powerful effects, as well as, what we feel a stronger resemblance to actual life ~~to~~ of his plays".

اس نظریہ کا اطلاق اردو کے "اصطلاحی مرثیہ" پر بہ نسبت دیگر اصناف سخن کے زیادہ ہوتا ہے ۔کیونکہ بقول سید مسعود حسن صاحب ادیب " اردو کے خزانے میں مرثیہ ہی وہ بیش بہا گوہر ہے کہ اگر شاعری کے بازار میں ہماری زبان صرف اسی جنس کو لے جاکر کھڑی ہوتو نگاہ دار جوہریوں کی نظر میں کم سرمایہ دار نہ ٹھہرے ۔واقعہ نگاری، جذبہ نگاری، سیرت نگاری اور منظر نگاری، غرضیکہ شاعری کے ملک میں کونسا سکہ رائج ہے کہ مرثیے کا خزانہ اس سے خالی ہے " (۱)

صنف مرثیہ پر بالعموم ایک یہ اعتراض بھی کیا جاتا ہے، کہ اس میں لکھنوی ثقافت، عربی ماحول پر چھا گئی ہے اور اس طرح عرب کا مخصوص ماحول ابھرنے نہیں پاتا ۔عربی کرداروں کو ہندوستانی بلکہ لکھنوی ماحول میں اس طرح پیش کیا گیا ہے، کہ ان کی شخصیتیں مسخ ہوگئی ہیں ۔منطقی اور تاریخی لحاظ سے اس اعتراض کی صحت پر شبہ نہیں مگر بحیثیت ایک صنف ادب کے مرثیہ کا یہی نقص اس کی خوبی میں تبدیل ہوگیا ہے ۔اگر مرثیہ میں یہ خصوصیت نہ ہوتی، تو پھر اس کی ادبی حیثیت بھی شاید مشتبہ ہوجاتی ۔کیونکہ اس حالت میں یا تو تاریخی پہلو غالب ہوتا، یا مذہبی ۔شاعرانہ حسن کے نکھار کے لئے ضروری تھا کہ یہ اسی ماحول کو اجاگر کرتا، جس میں اس کی پرورش ہوئی ۔فریڈرک شلجل کے حوالے سے اسکاٹ جیمز نے ادب اور ماحول کے تعلقات کو کیا خوب واضح کیا ہے :

"فریڈرک شلجل نے کہا کہ ادب کسی قوم کی ذہنی زندگی کی ہمہ گیر روح ہے ۔اس نے زندگی اور ادب دونوں کو مختلف تسلیم کرنے سے انکار کردیا اور کہا کہ دونوں کا تعلق ایک ہی عالم سے ہے ۔اس نے چند بندھنوں کا بھی ذکر کیا، جو اقوام عالم کو متحد بناتے اور ان کی تحریکات کی رہنمائی کرتے ہیں ۔ان میں سب سے پہلی طاقت زریعنی تجارت کی ہے ۔

---

(۱) ہماری شاعری ص ۱۵۸ ـ ۱۵۹

دوسری حکومت کی' تیسری مذھب کی اور چوتھی قوت خیال اور نظریات کی ۔ اس کا خیال ھے کہ ادب انسان کی ذھنی زندگی کے ساتھ ساتھ چلتا ھے جس مین شاعری' تاریخ' تفکر' نقد ونظر اور فصاحت شامل ھین " (1)

---

(1) "Fredrik Schlegel declared, " Literature is comprehensive essence of the intellectual life of a nation". He denied that it is possible to put literature in one world and life in other. Their world is the same. He spoke of few bounds which " serve to unite the family of mankind and direct their movements - Power of money and commerce, the Power of state, the Power of Religion, the Power of intellect. The literature, as he saw it, was co-extensive with the whole of man's intellectual poetry, history, speculation, wit and eloquence."

Scot James, R.A. Making of Literatures
London Marton Secker Ltd, 1946.

مــرثیہ دبیر سے پہلے

اردو ادب کی ایک خاص صنف کی حیثیت سے،مرثیہ کی اصطلاحی شکل جو آج معین ہوچکی ہے،اس کی قدیم ترین شکل وہ دکھنی نوحے ہیں،جنہیں شخصی مرثیے تو کہا جا سکتا ہے، مگر وہ اصطلاحی مرثیہ کی صنف میں نہیں رکھے جاسکتے (١) ان میں مرثیہ گو

---

(١) دکنی ریاستیں (عادل شاہی قطب شاہی اور نظام شاہی) مجالس عزا و رسومات محرم کی سرپرستی کرتی تھیں جب یوسف عادل شاہ نے مملکت بیجاپور قائم کی تو اپنی نذر کے مطابق خُطبہؐ میں آئمہ اہل بیت کے مقدس ناموں کو بھی شریک کیا ــ اور ان کے توسل کو اپنــــی زندگی میں ذریعۂ نجات سمجھتا رہا ــ جب سے اس سلطنت اور پھر نظام شاہیوں اور بعد کو قطب شاہیوں میں مجالس میلاد و عزا کا دستور ہوگیا (داستان اردو نواب نصیر حسین خیال ص ٦٩ مطبوعہ دارالاشاعت اردو حیدرآباد دکن)

قطب شاہی سلسلے (دارالخلافہ گولکنڈہ ٩١٦ ھ تا ١٠٩٨ھ) کے دو بادشاہوں محمد قلی قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ خود شاعر تھے اور دونوں نے مرثیے کہے ہیں۔قطب شاہی سلسلہ کے مرثیہ گو شعرا محمد قطب شاہ،عبداللہ قطب شاہ، وجہی، غواصی، خیالی، لطیف، کاظمؔ افضل، شاہی، مرزا اور نوری کے کلام کا نمونہ ملتا ہے ــ

عادل شاہی دور (دارالحکومت بیجاپور ٨٩٥ ھ تا ١٠٩٧ ھ) میں ہاشمی اور مرزا کی مرثیہ گوئی کے نمونے دستیاب ہوتے ہیں ــ

نظام شاہی خاندان (دارالحکومت احمد نگر ٨٩٥ ھ تا ١٠٢٣ ھ) کا بانی،احمد نظام شاہ شیعہ نہ تھا ــ اس کا لڑکا برھان نظام شاہ (٩١٢ ھ تا ٩٦١ ھ) امامیہ مذھب میں منسلک ہوا (ماخوذ از دکن میں اردو نصیر الدین ھاشمی ــ مکتبہ معین الادب ــ لاھور)

دکن میں مرثیہ کی مقبولیت کے اسباب دو ہیں اول حکومت کا مذھب دوسرے مرثیہ کی تاثیر اور تبلیغی اہمیت ــ مرثیہ شہدائے عظام و متعلقین کے جو شالی کردار پیش کرتا ہے ــ ان کی تبلیغی قدر و قیمت سے انکار نہیں کیا جاسکتا (مولف)

کا ذاتی تاثر اور جذبۂ خطابت غالب ہے ۔ کہیں کہیں واقعہ نگاری اور بعض جگہ مکالمہ بھی موجود ہے ۔گویا محرکات داخلی کے ساتھ ذوقِ داستان سرائی وتخیل نگاری کے دھندلے دھندلے نقوش بھی تلاش کئے جاسکتے ہیں ۔جو آگے چل کر ذرا اُبھرنے لگتے ہیں ۔ حتّٰی کہ جب ہم علی محمد خان المتخلص بہ ہاشم علی برہان پوری کا کلام دیکھتے ہیں تو یہ جھلک نمایاں ہونے لگتی ہے (۱)

(۱) ۱۱۲۹ھ تک زندہ تھا تاریخ وفات معلوم نہ ہوسکی ۔داستان اردو (نواب نصیر حسین خیال) ص ۷۰ انتخاب انیس و دبیر مقدمہ حامد حسین قادری مطبوعہ شاہین برقی پریس پشاور ص ۷ وتذکرہ سلک گہر (جاوید انصاری) ص ۸۶ ـ ۸۹ (نسخہ پنجاب پبلک لائبریری) نمونہ کلام آخرالذکر سے ہی لیا گیا ہے ۔

فاطمی کبری (دختر حسین) کی زبان سے

کیسی یونک خدائی وکیسی ہے یو برات | آتا فراق تم سون یہ جلوہ کی آج رات
گھر کون نہ لے گئے ہو نہ بولے ہو مجھے بات | دیکھا نہیں جمال کو بھر کے نین مرا

اس کربلا کے بن مین اکیلی مین کیون رہون | تجھ باج مین جہان مین پھراید کیا کرون
جد کے مدینہ کیونکہ مین اس شمار سے بھرون | تم اپنے ساتھ لیکے دکھاؤ وطن مرا

جاتے ہو چھوڑ رن کی طرف مجھ کون تم رلا | نیس شرم کا ہنوز یہ سر سون گھونگٹ کھلا
کرتے نہیں محبت و جاتے ہیا بھلا | اس زندگی سون آج بھلا ہے مرن مرا

شعلہ لگا ہے دل منے اس غم کا کیا کرون | مجھ کو روا ہوا ہے اگر زہر کھا مرون
دوری مین ہائے تیری دن رین کیون بھرون | فرقت کی آگ سے تئیں جلے گا بدن مرا

قاسم پر اس تقریر کا اثر اور جواب

قاسم کھڑا تھا رتے نین سن دلہن کی بات | غم ناک اپنا دیکھ کے دامن دلہن کے ہات
تب آہ درد ناک سون بولا دلہن کے سات | اے بوستان راحت و سرو چمن مرا
مجھ کو نہیں ہے تیری جدائی کا اختیار | تیرے فراق ساتھ مین جاتا ہون اشکبار
مین کیا کرون صلاح نہیں حکم کردگار | حق نے کیا ہے رن مین مقرر رہن مرا
ہے داغ دل مین تیری جدائی کا کیا کرون | ثین ہے اجہد رن سے پھر آگے تجھے ملون
جو کچھ ہوا مقدرون مین راستی کہون | وعدہ ہوا ہے حشر مین تم سون ملن مرا

(بعض جگہ سے اور بعض جگہ سون اور اسی طرح بعض جگہ یہ اور بعض جگہ یو دل مین کھٹکتی ہے)

تقریبا" اسی زمانہ مین شمالی ھند مین بھی مرثیہ گوئی کا رواج ھوگیا ۔یہ تو وثوق سے نہین کہا جاسکتا کہ اس علاقہ کا پہلا مرثیہ گو کون تھا (۱) فضلی کی " کربل کتھا " (۱۱۲۵ ھ مطابق ۱۷۳۲ ع) کو ھی شمالی ھند کی مرثیہ گوئی کا پہلا نمونہ قیاس کیا جاتا ھے ۲۰ جلوس محمد شاھی (۱۱۵۱ ھ) کی منقولہ ایک قلمی بیاض (مملوکہ مسعود رضوی) سے ڈاکٹر نورالحسن صاحب ھاشمی نے چند مرثیے نقل کیے ھین (۲) اور اس عہد کے بہت سے مرثیہ گو شعراء کا پتہ دیا ھے ۔میرحسن کی تحریرون اور دیگر ذرائع سے بھی یہ ثابت ھوتا ھے کہ محمد شاھی عہد (۱۱۳۱ ھ مطابق ۱۷۱۹ع تا ۱۱۶۱ ھ تا ۱۷۴۸ ع) تک شمالی ھند مین مرثیہ گوئی کا رواج ھوچکا تھا ۔مسکین، حزین اور غمگین (جو تینون بھائی تھے) کے متعلق تو یہ ثابت ھے کہ وہ اپنے وقت مین خاصی شہرت کے مالک اور مرثیہ گوئی کی بدولت فکر معاش سے آزاد تھے ۔ (۳)

---

(۱) یہ امر پایہ تحقیق کو پہنچ گیا ھے کہ ولی نے مرثیہ نہین کہا ۔مثنوی دہ مجلس جو اس کی طرف منسوب تھی، ولی ویلوری کے وجود کے اثبات کے بعد اس کی کلیات سے خارج ھوچکی ھے ۔دیکھئے مقدمہ کلیات ولی (سید نورالحسن ھاشمی) ۱۹۵۲ع ایڈیشن ص ۹

۲) دلی کا دبستان شاعری ص ۵۲ ۔ ۵۳

(۳) نواب درگاہ قلی لکھتے ھین " ولے بزبان ریختہ مہارت تمام دارند ۔ درھمہ شہر کلام اینہا شہرت دارد و در واقعہ ھرسہ کس بسیار می گوئند والفاظ الم آور بہ مضامین حسرت آگین ایجاد می کنند. نواسنجان مرثیہ بخدمت اینہا طرفہ رجوعے ست ۔مسودہ اشعارش بہ تلاش بدست می آرند و در امثال و اقران افتخاری کنند ۔طرز ھائے عجیب و تلاشہائے غریب در فکر این عزیزان بنظر می آید حق تعزیہ در کلام خود ادای کند و خلوص محبت طیبین و طاھرین برھمگنان ظاھراست ۔صلہ معتدبہ کہ کفاش وفا کوز از مکانہائے معین دارند وفکر غیر از منقبت بخاطر نمی رسانند اے از استماع مرثیہ ھائش بہ ارباب تعادی می رسد کہ از روضۃ الشہدا محصور نیست و از وقائع مقبل قدردان مراتب الم و جاشنی گیران مائدہ غم اعتبار می کند (لکھنؤ کا دبستان شاعری ص ٦٦٨ و سودا (شیخ چاند) ص ۲۸۳ مطبوعہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد ۱۹۳٦ع ۔

اس عہد کے جن شعراء کی مرثیہ گوئی کے نمونے دستیاب ہوئے ہیں، ان کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے، کہ قدیم دکنی مرثیوں اور ان میں بجز زبان کی صفائی کے کوئی فرق نہیں — اور اصطلاحی مرثیہ کی صف میں ان نوحوں کو ہرگز شامل نہیں کیا جاسکتا — لیکن میر تقی میر، ہیں یکلخت قدیم ڈگر سے ہٹتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، جو نہ صرف یہ کہ بقول خواجہ احمد فاروقی، " کربلا کے جن واقعات کو وہ اپنے تخیل سے اندرونی تجربات میں تحلیل کرسکے ہیں — ان میں نسبۃً " درد اور کسک زیادہ ہے مثلاً " حضرت امام حسین کی شہادت کے بعد عورتوں کی فریاد اور حضرت عابد کی ہیبت، ان کی ذمہ داریاں، ان کی تنہائی کے بیانات، میر کے خاص موضوع ہیں — سردار کا مارا جانا، گھر کی تباہی، مخدرات کے بین، شہ امام کی مجبوریاں، بے شبہ ایسے بیانات ہیں، جو سننے والوں کا جگر خون کرسکے ہیں " (۱) یہ ان کی طبیعت کا خاص انداز ہے، غم و الم سے ان کی طبیعت بہت زیادہ حد تک مانوس ہے — اور یہ طبعی مناسبت ان کے مراثی میں درد کی شدت اور چبھن پیدا کردیتی ہے — یوں معلوم ہوتا ہے، کہ وہ اہلِ بیت کا نہیں، اپنا غم رو رہے ہیں — اور یہی خلوص ان کے مراثی کو رسمی اور تشریفاتی حدود سے نکال کر داخلی شاعری کے اعلیٰ نمونے بنادیتا ہے — ہم اگر ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صاحب کی یہ رائے تسلیم بھی کرلیں کہ " میر کے یہاں بزم، بین اور رزم کا رنگ بہت پھیکا ہے، خارجی اور بیانیہ شاعری بھی اونچے درجے کی نہیں ہے " (۲) لیکن اس سے انکار نہیں کہ میر کے مراثی میں وہ سب کچھ ایک ہیولیٰ کی حیثیت سے موجود ہے، جو بعد میں "لکھنوی اصطلاحی مرثیے" کی صورت میں جلوہ گر ہوا — میر نے مجالس کی رعایت سے مختلف موضوعات پر مرثیے لکھے — (۳)

---

(۱) میر تقی میر حیات اور شاعری ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ص ۲۲۸

(۲) ایضاً " ص ۲۵۹

(۳) محرم کا نکلا ہے پھر کر ہلال " دل تنگ ہو مدینے سے جب اٹھ چلا حسین " ابتدائی مجالس کے لئے ہیں " قاسم کی شادی اسی دن رچائی " کسی حد تک حضرت قاسم کے حال میں ہے " نکلا ہے خیمہ شام کو شاہ کا جلا ہوا " سجاد کو فلک نے کس کس طرح ستایا " نہ چھوڑی دشمنوں نے گھر میں شئے دوست حضرت عابد کے حال میں ہیں — " چہلم ہے اے محبان اس شہ دوسرا کا " چہلم کی تقریب میں زیادہ مراثی واقعات روز عاشورہ میں ہیں — مراثی انیس سرفراز محرم نمبر لکھنؤ —

(نیز دیکھیے راقم الحروف کا مضمون، اردو مرثیے کے ارتقاء میں میر کا حصہ، مطبوعہ اورینٹل کالج میگزین، لاہور فروری ۱۹۶۹ء)

جہاں تک مرثیہ کی ہیئت کا تعلق ہے ۔ میر بھی ان شعراء میں شامل ہیں، جنھوں نے اسے مسدس کا روپ دیا ۔ سودا یا سکندر کی تخصیص نہیں ۔ مولف حیاتِ دبیر (افضل حسین ثابت) نے خلیفہ محمد علی، سکندر کو مسدس مرثیہ کا موجد قرار دیا ہے (۱) ۔ لیکن موجودہ مندرجہ ذیل یہ بیان صحت کے قرین نہیں ۔ کیونکہ میر حسن، میر اور سودا کو متوسطین اور سکندر کو " از مرثیہ گویانِ متاخرین " کہتے ہیں (۲)

دوسرے سودا اور سکندر کی شہرت سے کچھ پہلے ۱۱۵۱ھ میں مرثیہ مسدس میں لکھا گیا (۳) ۔ مصحفی نے جب اپنا تذکرہ ہندی لکھا تو سودا وفات پاچکے تھے، مگر سکندر کی عمر وہ اسوقت صرف " متجاوز از پنجاہ " بتاتا ہے (۴)

سکندر کو اگرچہ تقدم زمانی حاصل نہیں لیکن اس کے مرثیہ میں داستان سرائی کے بیچ اپنے معصروں کی طرح موجود ہیں ۔ فاطمہ صغریٰ کی زبان سے جو الفاظ (تقریباً بشکلِ مکالمہ) اس کے مرثیے میں ادا کیے گئے ہیں ان میں نہ صرف ایک بیمار اور اعزہ و اقارب سے بچھڑی ہوئی لڑکی کے جذبات کی صحیح ترجمانی ہوتی ہے، بلکہ اس کے حالی کردار پر بھی روشنی پڑتی ہے ۔ ہمیں یہ تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں، کہ اصطلاحی مرثیے کے واضح نقوش مرثیۂ زیرِ بحث میں بھی موجود ہیں :

ہے روایت شترا سوار کسی کا تھا رسول ان دنوں شہر مدینہ میں ہوا اس کا نزول
جس محلہ میں بہم رہتے تھے حسینؑ و بتولؑ ایک لڑکی کھڑی دروازہ پہ بیمار و ملول
خط لئے کہتی تھی بڑے کے قرین زار و نزار
ادھر آتجھ کو خدا کی قسم اے ناقہ سوار

---

(۱) حیات دبیر ج ۱ ص ۱۱۷

(۲) دیکھئے تذکرہ میر حسن انجمن ترقی اردو دہلی ۱۹۴۰ ص ۸۲ و ۹۳ و ۱۵۱

(۳) بیاض قلمی محمد مراد محررہ ۲۰ جلوس محمد شاہی مملوکہ سید مسعود حسن رضوی رضوی ادیب بحوالہ دلی کا دبستان شاعری (نورالحسن ہاشمی) ص ۵۲ ۔ ۵۳

(۴) تذکرہ ہندی مصحفی مطبوعہ جامع برقی پریس دہلی ۱۹۳۳ء ص ۱۱۷ و ص ۱۲۶
(یوں تو مسدس ہمیں کے کلام میں بھی موجود ہے لیکن مضامین میں وہ تنوع نہیں جو سودا یا میر کے ہاں ہے دیکھئے مضمون ڈاکٹر غلام مصطفےٰ مطبوعہ رسالہ اردو اپریل ۱۹۵۶ء

ناگہان سن کے شتر اسوار وہ آواز حزین　　با ادب آن کے کہنے لگا پردہ کے قرین
کوئی اس گھر مین دلاسے کوبھی ہے کہ نہین　　اتنی سی عمر ہے کیا دکھ ہے جوتو ہے غمگین
کون سے قوم کی لڑکی ہے تو بیمار و صغیر
کیا ترا نام ہے تو کس کے لئے ہے دلگیر

وہ لگی کہنے کہ سن بندۂ حی القیوم　　میرا نانا ہے نبی بابا علی باب علوم
یہ محلہ بنی ہاشم کا ہے سب کو معلوم　　اور مین لڑکی جو بیمار ہون دکھیا مغموم
فاطمہ صغرا اسی واسطے ہے میرا نام
دادی زہرا کی سی صورت ہے مرے منہ کی تمام

ایک تو فاقہ کشی دوسرے مین ہون بیمار　　ایک دانہ نہین کیا دون تجھے اے ناقہ سوار
ایک مقنعہ ہے مرے سر پہ سو دیتی ہون اتار　　مین نے بخشا مرے بھائی میرا خط لیکے سدھار
کہیو رو رو کے زبانی یہ میرا سب سے پیام
بندگی میری بڑون کو مرے چھوٹون کو سلام

میری مان جائے سے کہیو کہ تو اتنا کیجو　　میری جانب سے سکینہ کی بلائین لیجو
اور میری بہنون سے رو رو کے یہی کہ دیجو　　کھانا وان کھاؤ تو یہان آن پانی پیجو
بھائی اکبر سے یہ کہیو کہ وطن کو جاؤ
پھیر بابا کو مدینے کی طرف لے آو

سودا نے ضرورت اور مواقع کے اعتبار سے مرثیے کی مختلف شکلین اختیار کی ہین ــ کچھ شب خوانی کے لئے، کچھ سوز کے واسطے، کچھ منبر پر تحت اللفظ پڑھنے کی غرض سے ہین ــ کچھ نوحے ہین، کچھ روضہ خوانی کے لئے ماتمی دستون کے واسطے ہین ــ اس کے علاوہ کچھ ایسے بھی ہین، جو خطابت اور نقیبانہ انداز سے پڑھے جاتے رہے ہون گے ــ بعض جگہ امام حسین، یا ان کے اسلاف و اخلاف، یا انصار و اعزہ کی جزئلت کے مرقعے کھینچے

گئے ہین ـ اکثر جگہ واقعات لکھے ہین ـ آمد، پیاس کی شدت، اقربا کی شہادت، خیمۂ اطہر کی لوٹ اور لٹے ہوئے قافلے کا شام جانا سب کچھ مسلسل انداز سے بیان کیا ہے ـ

جہان کہین واقعات بیان کئے ہین، سب ایک ہی زنجیر کی کڑیان ہین اور ذہن انسانی بلا تکلف ایک واقعہ سے دوسرے واقعہ کی طرف منتقل ہوتا جاتا ہے ـ ہر مرثیہ مین بیان کا ربط، ذہنی تسلسل اور نفسیاتی ترتیب شامل ہے ـ دوسرے الفاظ مین سودا کے ہان وہ تمام ادبی کیفیت کسی حد تک موجود ہے، جس نے آگے چل کر ضمیر، انیس اور دبیر کے کلام مین "اصطلاحی مرثیہ" کی شکل اختیار کی۔ (۱) ـ اگر میر کے مراثی کو ارتقا کی پہلی منزل کہا جائے تو سودا کی دوسری اور میر ضمیر اور ان کے معصرون کی تیسری منزل ہوگی ـ

عربی کردارون کو ہندوستانی ماحول مین پیش کرنے کی ایجاد سودا ہی نے کی ـ (۲)

حقیقت تو یہ ہے کہ " سودا اپنے بعد مین آنے والون کے لئے ترقی کی راہین کھول گئے ہین" اس مین شبہ نہین کہ بقول شیخ چاند، سودا کے مرثیون مین مرثیت بڑی حد تک مفقود ہے ـ مرثیے کی بڑی غرض و غائت غم انگیز مضامین کو رقت خیز پیرائے مین بیان کر کے رلانا ہے ـ سودا کے مراثی مین یہ جوہر نہین " (۳) اس مین میر، سودا سے زیادہ کامیاب ہین

سودا ہی کے قریب العہد ایک بزرگ ظہور علی خلیق کا ایک (۴) مسدس مرثیہ، طبقات الشعراء مین مندرج ہے (۵) جو نہ صرف واقعہ نگاری اور داستان سرائی مین سودا

---

(۱) ماخوذ از مضمون سودا کے مرثیے ـ طالب الہ آبادی ادبی دنیا ـ نومبر ۱۹۳۳ء

(۲) تاریخ ادب اردو (سکینہ) ص ۱۰۲

(۳) سودا (شیخ چاند ص ۲۸۹)

(۴) ۱۱۹۹ھ مین نظامت بنگالہ کی سرکار مین منسلک تھے ـ رسالہ معاصر حصہ ۲ عظیم آباد ـ مقالہ قاضی عبدالودود صاحب ـ

(۵) بحوالہ رسالہ معاصر مذکور

کے مراثی سے بہتر ہے بلکہ جذبات کی ترجمانی اور کردار نگاری کے لحاظ سے بھی ترجیح کا مستحق ہے (۱) —

دلّی کی تباہی نے آرزو، سودا، میر سوز، میرحسن وغیرہ جیسے ارباب کمال کو بتلاش معاش و سکونِ خاطر، شاہان اودھ کے دربار سے منسلک کردیا، چونکہ حکمرانوں کے اس سلسلہ کا تعلق امامیہ مذہب سے تھا تو اِس لئے قدرتی طور پر ان کے عہد میں مرثیہ گوئی کو فروغ حاصل ہوا — میر اور سودا کی مرثیہ گوئی کا ذکر ہوچکا ہے — میرحسن بھی اپنے تذکرہ میں اپنی مرثیہ گوئی کی طرف اشارہ کرتے ہیں (۲) لیکن جن لوگوں نے ان بزرگوں کی قائم کردہ بنیادوں پر اصطلاحی مرثیہ کی عمارت کھڑی کی — وہ میر خلیق، میر ضمیر، فصیح اور دلگیر ہیں —

میر خلیق کا کلام نہیں ملتا اور جو ملتا ہے، وہ ان کے اخلاف میر مونس اور میر انیس کے مطبوعہ کلام میں بھی شامل ہے (۳) اس لئے یہ یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ اس صنف کے

---

(۱) پہلا بند

هوا صغری پہ جب ظاہر کہ بابا کا سفر ٹھیرا   مجھی کو چھوڑنا گھر میں انہیں مد نظر ٹھیرا
یہ شب ہے درمیاں اب کوچ کہنے کا سحر ٹھیرا   دم اس بیمار کا غم سے لبوں پر آن کر ٹھیرا
لگی کہنے الٰہی آج میرا دم نکل جاوے
جو بابا کے جدا ہونیکا دل سے غم نکل جاوے

ساتواں بند

یہ باتیں تھیں کہ اتنے میں سحر ہونے لگی پیدا   ادا کرکے نماز صبح وہ فرزند حیدر کا
لگا تب مانگنے پوشاک بانو نے کہا تب آ   چھپاتے جس سے تھے تم راز دل کا اور سفر اپنا
اسی تقریر میں روتے ہی گذری رات بھر اس کو
دل آگہ نے اس کے آگے کردی ہے خبر اس کو

(۲) درخدمت نوازش علی خان صحبت گزیدم .... چنانچہ تاحال بہ هرنوع گذران می نمائم اکثر بفرمائش نواب معلی القاب مرثیہ امام علیہ السلام نیز بہ گفتن می آید " تذکرہ میرحسن — مطبوعہ صفحات

(۳) ۱۱۸۶ھ مطابق ۱۷۷۲ء سولہ سال کی عمر میں مصحفی کے شاگرد ہوئی (اس حساب سے تاریخ پیدائش ۱۱۷۰ھ مطابق ۱۶۲ ۱۱ء) وفات ۱۲۶۰ھ میرحسن اور خاندان کے دوسرے شعرا محمود فاروقی ص ۲۳۱

۴) موازنہ انیس و دبیر (شبلی) ص ۲۳ (مبارک علی ایڈیشن)

(۱)
ارتقاء میں ان کا حصہ کس قدر ہے ۔ اصطلاحی مرثیہ کو موجودہ شکل عطا کرنے کا سہرا میرضمیر کے سر ہے ۔ ان سے پہلے مرثیے اس قدر طویل نہیں ہوتے تھے ۔ اس لئے ان میں مضامین کا تنوع کم تھا ۔ مگر ان کے بعض مرثیے تو سو سو بند کے ہیں اور اکثر اسّی ۸۰، نوّے ۹۰ بند کے ۔ واقعہ نگاری، منظرکشی (۲) اور اظہارِ جذبات کے ساتھ ساتھ ان میں کردار نگاری کا ملکہ بھی تھا ۔ کرداروں کے جذبات کے اظہار میں ان کی عمر اور درجہ ملحوظ رکھتے تھے ۔ میر ضمیر کا عہد، ہزل، ریختی اور ڈرامے کی ابتدا کا عہد تھا ۔ شعراء کے معرکوں شعروشاعری کے چرچوں موسیقی اور رقص کے رواج نے اودھ کی معاشرت میں ایک خاص قسم کا جمالیاتی ذوق پیدا کردیا تھا ۔ رعایتِ لفظی، ضلع جگت، طرزبیان کی ندرت اور تکلفِ حسن ادا کی خصوصیات

---

(۱) سید مظفر حسین ضمیر کے والد میر قادرحسین (یا قادرعلی) حوطن پنگورہ ضلع گوڑگانوہ نواب آصف الدولہ کے خواجہ سرا میاں الماس کے ملازم تھے ۔ جب نواب مذکور نے فیض آباد سے لکھنؤ میں رہائش منتقل کی تو میرضمیر بھی اپنے والد کے ہمراہ لکھنؤ چلے آئے مصحفی سے مشورۂ سخن کرتے تھے اور اس پر نازاں تھے ؎

اس طرح کے کہنے کا سلیقہ مجھے کب ہے — واللہ کہ استاد کی شفقت کے سبب ہے

۱۲۷۲ ھ میں بعہد واجد علی شاہ وفات پائی ۔ پیام زندگی (جلد اول) تاجور

(۲) منظر صبح

نکلا جو سر مہر گریبان سحر سے — انجم کے گہر گر گئے دامان سحر سے
مہتاب کا رنگ اڑگیا دامان سحر سے — روشن ہوا صحرا رخ تابان سحر سے
جو وادئ ایمن میں ہوا طور کا عالم
وہ خیمۂ شبیر میں تھا نور کا عالم

وہ نور کا تڑکا ادھر اور صبح کا عالم — گھٹنا مہ و انجم کی تجلی کا وہ کم کم
آتی تھی صدائے دھل صبح بھی پیہم — چلتی تھی نسیم سحری دشت میں تھم تھم
کرتا تھا چراغ سحری عزم سفر کا
اور شور درختوں پہ وہ مرغان سحر کا

شہیر چکی تھین — ایسے ماحول مین مرثیہ جیسی غم انگیز اور اخلاقی شاعری (۱) کو رواج دینا اور عوام کی توجہ کو اپنی طرف منعطف کرانا، آسان کام نہ تھا — میر ضمیر کے کلام مین یہ سب اوصاف موجود تھے — اور ان کے مشن کی کامیابی مین ممد ثابت ہوئے — عوام کا یہ متنوع ذوق، مرثیہ کی طوالت کا باعث ہوا — جس نے مختلف مضامین، رزم و بزم امور تخیل و کردار کو اپنے اندر سمولیا — اور اس طرح " اصطلاحی مرثیہ " اپنی موجودہ شکل مین عالم وجود مین آگیا (۲)

فصیح اور میان دلگیر، ضمیر ہی کے معاصرین مین سے تھے — میان دلگیر (۳) ایک پرگو مرثیہ نگار تھے — تقریباً" ایک لاکھ اشعار کہے — وہ تمام خصوصیات جو میر ضمیر کے کلام مین بیان کی گئی ہین — دلگیر کے کلام مین موجود تھین — البتہ عرب کردارون کو ہندوستان ماحول کے پس منظر مین بیان کرنے کا رجحان ان کے کلام مین دوسرون سے زیادہ ہے — فصیح (۴) کا کلام مقدار مین ان دونون سے کم ہے —

---

(۱) کھولے جو ذرا دیدۂ عبرت کوئی انسان | دنیا نظر آوے اسے بازی گہ طفلان
ہم دیکھتے ہین روز تہ گنبد گردان | جاتا ہے اگر ایک تو ایک آتا ہے مہمان

دنیا کو اگر غور سے دیکھے تو سرا ہے
یا فاعتبروا یا اولی الابصار کی جا ہے

ہم جس کو وطن سمجھے ہین وہ بے وطنی ہے | ہر وقت اجل مستعد راہ زنی ہے
کس کام کی یہ دولت دنیائے دنی ہے | محتاج کفن ہے کوئی محتاج و غنی ہے

جو آیا ہے اس کوچہ مین سو راہ گذری ہے
یہ رخت کفن دوش پہ رخت سفری ہے

(۲) ادب کی ہر صنف ایک پورے ادبی ماصنف کی وارث ہوتی ہے " مولشن (حوالہ

(۳) لالہ جھنگو لال قوم کائستھ سکینہ دلگیر تخلص ناسخ کے شاگرد تھے — آخر مین اسلام قبول کیا اور تمام عمر مداحی اہل بیت مین بسر کی — مرثیہ خوانون اور سوزخوانون مین بہت مقبول تھے — جیساکہ مندرجہ ذیل عبارت سے ظاہر ہے :—

" مدار کل خوانندگان مرثیہ و شائقین گریہ باحوال آل عبا علیہم السلام کا اسی پر ہے علی الخصوص نامی خوانندگان کا بلکہ موجد طرز سوزخوانی میر علی صاحب و سلطان علی خان صاحب اور اکثر اہل کمال سوزخوانی و خوانندگی انہین مرثیون پر تھی —" عبارت خاتمہ کلیات مرثیہ دلگیر جلد سوم ص ۲۹۶ مطبوعہ نولکشور ۱۸۹۷ع —

(۴) مرزا جعفر علی فصیح لکھنوی پیدائش ۱۲۲۱ ھ اور ۱۲۷۲ ھ تک زندہ تھے کربلا شریف لے گئے واپس نہین آئے (پیام زندگی)

باب چہارم

(دبیر کے کلام کا تجزیہ ــــــ داخلی عناصر)

1. دبیر کے کلام کے بعض بنیادی عناصر
2. مرزا دبیر کے کلام میں داخلی شاعری کے عناصر
3. مرزا کی جھلک ان کے کلام میں
4. احساس حقیقت یا اعتقاد کی داخلی ماہیت
5. یاسیت اور مفروضہ جذبات
6. انسانی زندگی کے دو پہلو (ایک تاریخ کے لئے اور دوسرا داستان کے لئے)
7. دبیر کی اپنے کرداروں کے جذبات کو سمجھنے کی اہلیت (مثالیں) شدتِ تاثر اور جذباتِ غم ــ وجدانی تجربات
8. حضرت امام کی جامع الصفات شخصیت کی ترجمانی
9. مدح اور اس میں خلوص جذبات ــ مداح اور ممدوح کے قلبی روابط

باب چہارم

دبیر کے کلام کا تجـــــزیہ

مرثیہ گو شعراء مین دبیر کا مقام متعین کرتے وقت مندرجہ ذیل حقائق ہمارے پیش نظر رہنے چاہئین جن کا استنباط مقالہ ہذا کے حصہ اول سے ہوتا ہے :-

۱ ـ مرزا دبیر کی مرثیہ گوئی کا آغاز نصیر الدین حیدر (۱۸۲۷ء تا ۱۸۳۷ء) کے عہد مین ہوا ـ

۲ ـ بادشاہ اور ان کی والدہ دونون نہایت ضعیف الاعتقاد شیعہ تھے ـ یہی حال ان کے جانشینون کا تھا ـ

۳ ـ اپنی شاعری کے آغاز ہی سے مرزا دبیر، شاہی عزاخانے مین بلائے جانے لگے ـ یہ شاہی سرپرستی تا انتزاع سلطنت (۱۸۵۶ء) بلکہ دبیر کی وفات (۱۸۷۵ء) تک قائم رہی ـ

۴ ـ اس زمانے مین محسناتِ شعر، شکوہٗ الفاظ اور مبالغہ کو کمالِ شاعری سمجھا جاتا تھا ـ یہان تک کہ نثر بھی اس سے بری نہ تھی (مثلاً فسانہٗ عجائب)

۵ ـ مرثیہ کا بنیادی مقصد مجالسِ عزا کی مانگ پورا کرنا تھا، جو مرثیہ زیادہ سے زیادہ ماتم اور سینہ کوبی کا باعث ہوتا، وہی کامیاب ترین سمجھا جاتا ـ

۶ ـ مرثیہ کا دوسرا بڑا مقصد مدحِ شہِ کربلا و متعلقین ہے ـ "وصف" کے لئے شکوہٗ الفاظ، تشبیہ و استعارہ کا فنکارانہ استعمال اور مبالغہ لازمی اجزاء ہین ـ

۷ ـ مرزا دبیر کی تعلیم اس عہد کے معیار کے مطابق خاصی تھی ـ عربی اور فارسی ادب کے منتہی ہونے کی وجہ سے، ان کے کلام مین، ان زبانون کے مشہور شعراء کے افکار و خیالات تراکیب تلمیحات اور محاورات کا استعمال اکثر غیر معتدل اور بعض اوقات ناگوار معلوم ہونے لگتا ہے ـ لیکن جہان توجہ سے کام لیا ہے، وہان جذبہ اور خیال کی پر پیچ وادیون کو عبور کرنے

میں انہیں تکلیف تکلفات سے مدد لے کر افہام وتفہیم کی منازل کامیابی سے طے کرگئے ہیں۔

۸ ۔میر ضمیر اور ان کے معصر مرثیہ گو حضرات کی بدولت مرثیہ کے دامن میں وسعت اور مضامین میں تنوع پیدا ہوچکے تھے ۔مجالس کا انعقاد بکثرت تھا' اس لئے تازہ اور عمدہ مراثی کی مانگ بہت زیادہ تھی ۔اس مانگ میں اضافے اور حاضرین کے ذوق کی تسکین کے لئے مرثیہ گو تازہ مضامین ،نادر تشبیہات' زور بیان اور صنائع بدائع کو زیادہ اہمیت دینے لگے تھے ۔یہ فنکارانہ موشگافیاں' اگرچہ آج کل ذوقِ سامعین پر گران گزرتی ہیں ۔مگر زبان کی ترقی وسعت اور نکھار میں ان کاوشوں کا حصہ قابلِ قدر ہے ۔

اس پسِ منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے' مرزا دبیر کے کلام کا مطالعہ کریں تو ان کی عظمت سے انکار ناممکن ہوجاتا ہے ۔

مرزا دبیر کے کلام میں داخلی شاعری کے عناصر

دبیر کے حالاتِ زندگی کے مطالعہ سے یہ مستنبط ہوتا ہے' کہ ان کی اٹھان خالص مذہبی ماحول میں ہوئی تھی ۔سیادِ الہٰسی اور اہلِ بیت سے محبت وعقیدت ان کے کردار کی نمایاں خصوصیات ہیں ۔اس لئے جب وہ یہ ادعا کرتے ہیں کہ ؎

دل خود بخود افسردہ ہوا جاتا ہے
بے روئے نہیں ہم سے رہا جاتا ہے (۱)

تو ہم یہ نہیں کہ سکتے کہ شاعر واردات قلبی کے بیان کی بجائے تکلف سے کام لے رہا ہے ۔بیانِ واقعات کے دوران بھی اکثر شدتِ تاثر سے مجبور ہوکر اپنی قلبی کیفیات کو انھوں نے اس طرح واشگاف کیا ہے :

ہے ہے ابھی تو پڑھتے تھے تم عصر کی نماز سجدے میں جلتی ریت پہ تھا خم سرنیاز
بہرِ قنوت ہاتھ کیے تھے ابھی دراز ہے ہے سلام پڑھتے تھے کو تھے شہِ حجاز

اتنے میں ہم غریبوں کی قسمت الٹ گئی
قاتل بھی بیٹھا سینہ پہ گردن بھی کٹ گئی

---

(۱) مراثی دبیر جلد ۱ ص ۱۱۰ نولکشور ۱۸۷۷ء (ص ۲۱۱ ۱۹۳۷ء)

خاندانِ رسالت سے بے پناہ محبت دبیر کے رگ و ریشہ میں سرایت کرچکی تھی ـ آخری عمر میں جب کہ ایک نوجوان لڑکا بھی انتقال کرچکا تھا اور اس حادثۂ جانکاہ کی بدولت طبیعت میں دنیا سے بے نیازی اور مذہبی رجحان کا غلبہ وافر ہوچکا تھا ـ مرزا نے ایک طویل مرثیہ لکھا جس کا مطلع یہ ہے ع انگشتریٔ عرش کا یارب نگین دکھا

اس مرثیہ کے پہلے بیس بندوں میں ایک مناجات پیش کی گئی ہے، جس میں نہایت خلوصِ قلب سے مقاماتِ مقدسہ کی سیر کی توفیق کے لئے بارگاہِ خداوندی میں دعا مانگی گئی ہے ـ یہ مناجات شاعر کے جذبات کی پرخلوص ترجمانی کرتی ہے اور اس لحاظ سے داخلی شاعری کا نہایت عمدہ نمونہ ہے ـ جذبات و احساسات کے خلوص کی وجہ سے اس میں ایک خاص قسم کی لذت اور کیفیت پیدا ہوگئی ہے ـ یوں بھی انسان جب خدا کے حضور میں پیش ہوتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ وہ ذاتِ پاک اپنے بندے کے اسرار و عیوب سے کماحقہ واقف ہے ـ کوئی عمل یا حتیٰ کہ خیالات تک اس سے پوشیدہ نہیں، تو اس وقت جو بات سچے دل سے نکلتی ہے اس کے خلوص اور تاثیر میں کیا شبہ ہوسکتا ہے؟ یہی حال اس مناجات کا ہے:

انگشتریٔ عرش کا یارب نگین دکھا ایوانِ بارگاہِ سلیمانِ دین دکھا
اگتا ہے تخمِ علو جہاں، وہ زمین دکھا سرکارِ شاہزادۂ روح الامین دکھا
مٹی مری عزیز اگر وہ زمین کرے
جنت بھی پھر بلائے تو بندہ نہیں کرے

بے تابی ملاحظہ ہو:

یارب کبھی جہان میں وہ دن بھی آئیگا مجھ سا شکستہ پا جو یہ معراج پائے گا
طالع تو نارسا ہے، وہاں لے نہ جائے گا ہاں خضرِ فضلِ حق درِ مولا دکھائے گا
اُڑ کر ابھی میں گرد پھروں اس رواق کے
دے مرکبِ مراد کو شہ پر مراد کے

یارب چہل چراغ کی دل کو لگی ہے لو   کس شب نظر پڑیں گے، وہ چالیس ماہ نو
قندیل تختِ قبہ کی دیکھوں کاکب میں ضو   دم لے بس اب وہیں فرسِ عمر گرم رو
دیکھوں مزارِ شہ پہ چمک دل کے داغ کی
روضہ میں روشنی میں کروں اس چراغ کی

جاؤں وہاں تو دل میں نہ حب وطن رہے   پیش نظر حسین کا روضہ حسن رہے
مرنے پہ بھی حضوریٔ شہِ زمن رہے   روضے میں روح، صحنِ حرم میں بدن کھلا رہے
بعد از فنا نہ جسمِ مثالی ملے مجھے
ہاں ظل رحمت شہِ عالی ملے مجھے

اک جان اور ہزار تمنا ہے، اے کریم   ادنیٰ کو شوقِ منصب اعلیٰ ہے، اے کریم
پر تیری بارگاہ میں کمی کیا ہے، اے کریم   بندہ کی آرزو یہ سراپا ہے، اے کریم
قالب نجف میں، روح رواق حسین میں
آنکھیں رضا کے روضے میں، دل کاظمین میں

پیاس اک طرف، حیات سے بھی قطع آس ہے   پیری گواہ صورت اظہار یاس ہے
ہر دم زوال طاقت و ہوش و حواس ہے   لا تقنطو کا حرز فقط آس پاس ہے
اب سیرِ کربلا سے مجھے جلد سیر کر
اپنے حسین پیارے کا صدقہ نہ دیر کر

عصیاں ہیں سنگ راہ، قدم لنگ، راہ تنگ   تدبیر میں شتاب ہے، تقدیر میں درنگ
ادبار سے ہے صلح، اور اقبال سے ہے جنگ   نیرنگ سے ہے زرد، گلِ آرزو کا رنگ
مرتا ہوں اس زمیں پہ دل زندہ کرنے کو
جیتا ہوں کربلائے معلی میں مرنے کو

دل مردہ سینہ مرقدِ تاریک و تار ہے   آٹھوں پہر شکنجۂ لیل و نہار ہے
ہے اس زمیں کے مجھ کو عذابِ فشار ہے   فریاد الغیاث کہ اب اضطرار ہے

ہو رقعہ یہ فشار جو اپنے ولی کو بھیج

لے میں درود بھیجتا ہوں تُوطی کو بھیج

آدم کو خلد اور مجھے کربلا نصیب مجھ کو یہ خاک خضر کو آب بقا نصیب

بندے کو یہ مقام جو ہوئے خدا نصیب کہ دون کہ لوح قبر پہ لکھنا خوشا نصیب

حاجی ہوا جو داخل بیت الحرم ہوا

ناجی ہوا جو زائرِ شاہِ امم ہوا

ان طائرون کا جلد سنا مجھ کو شور و شین دیتے ہیں راہ میں جو خبر کشتہ شد حسین

دکھلا وہ روضہ اور وہ روضے کی زیب و زین روح القدس کو جس کی زیارت ہے فرض عین

توشہ غریب کو سفرِ کربلا کا دے

پروانہ راہداریٔ دار الشفا کا دے

اس دائم المرض کی دوا تیرے ہاتھ ہے عسرتؔ فلاحؔ دردؔ شفا تیرے ہاتھ ہے

بیدست و پا کی شرم و حیا تیرے ہاتھ ہے کاسہ ہے میرے ہاتھ عطا تیرے ہاتھ ہے

خاکِ درِ حسین، جو یہ کم نصیب ہو

ذرے کو اوجِ نیّرِ اعظم نصیب ہو

پیری نے سب اثاثہ میرا ضبط کر لیا منہ دیکھتا میں رہ گیا گنج گھیر لیا

زورِ بدنؔ قرار جگرؔ ہوش سر لیا شاھد ہے بےدلی کے مسافر کا گھر لیا

اب ایک نقد جان نہ ابھی لے غلام کا

ھدیہ ہے یہ ضریح حسینؑ کے نام کا

وہ پاؤں ہے فلک پہ جو اس سرزمین پہ ہے وہ سر ہے عرش پر جو درِ شاہِ دین پہ ہے

صدقے اس آنکھ کے جو ضریح جبین پہ ہے تحسین لامکان کی وہین کے مکین پہ ہے

ہے کحل خاک پاک پہ ذرون کا شور ہے

گر چشم آفتاب کی بھی ہے تو کور ہے

رضوان نامور کو مبارک درِ جنان　　روح القدس کو سدرہ مسیحا کو آسمان

اختر کو برج در کو صدف گل کو بوستان　　مجھ کو جناب شاہ شہیدان کا آستان

پایا یہ جس نے، عرشِ علا اس کا ہوگیا

جس کے ہوئے حسین، خدا اس کا ہوگیا

اب کربلا سے شکوہ درد و فراق ہے　　روئے نیاز سوئے حسینی رواق ہے

کیوں کربلا تجھے بھی، میرا اشتیاق ہے؟　　مجھ کو تو زیست، شوق زیارت میں شاق ہے

صاحب سے اپنے کہہ، کہ بلالیں غلام کو

مرنے نہ دیں یہاں ہو جلالیں غلام کو

اے قبلۂ منورہ قلبی لک الفدا　　اے بے نوا کرم کریں ہوں سخت بے نوا

اے کربلا امان کہ میں ہوں مسود بلا　　اے ماریہ مدد، کہ ولا میں ہوں بے ریا

ذرہ ترا ملے تو ہزار آبرو ملے

اکسیر خاک چھان رہی ہے کہ تو ملے

اب صبر زیرِ عشق، تزلزل ہے یا حسین　　پامالِ ضعف نبضِ تحمل ہے، یا حسین

فریاد، شمعِ عقل، مری گل ہے، یا حسین　　مجھ کو حضور ہی سے توسل ہے یا حسین

لِلّٰہ بارگاہ میں اب یاد کیجئے

لبیک! میرے نام پہ ارشاد کیجئے

حیدر سے سعی کیجئے اے سرورِ ہدا　　مغرب سے لائیے شمس کو مشرق میں مرتضیٰ

روشن ہے غرب و شرق کا دنیا میں فاصلہ　　ہندوستان سے دور نہیں اتنی کربلا

گر اک نگاہ مہر کریں ~~کھوئیں ہنر~~ کمترین پر

ذرّہ ہو اِس زمین سے ابھی اُس زمین پر

اب زندگی ہے شاق مدد یا علی مدد　　طاقت ہے دل کی طاق مدد یا علی مدد

دشوار ہے فراق مدد یا علی مدد　　ہے جوش اشتیاق مدد یا علی مدد

مشہور آفتاب کی رجعت کا حال ہے

ذرے کی اس زمین پہ طلب کیا مجال ہے (۱)

یہاں پر یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ مندرجہ بالا اشعار میں محض ایک مذہبی عقیدہ ہے اور اس لحاظ سے ان کا داخلی شاعری سے کوئی تعلق نہیں — لیکن برٹرینڈ رسل نے جیمز کے حوالے سے اعتقاد کا یوں تجزیہ کیا ہے :—

" احساس حقیقت یا اعتقاد کی داخلی ماہیت یہ ہے کہ یہ ایک ایسا احساس ہے جس کا تعلق بہ نسبت اور چیزوں کے جذبات سے قریب تر ہے " (۲)

ب — نیابتی یا مفوضہ جذبات | مرثیہ گو شعراء بالعموم اپنی قلبی کیفیات کے اظہار سے گریز کرتے ہیں — کیونکہ ان کا اصل مقصد، واقعات کربلا کا شاعرانہ انداز سے، صدقہ یا غیر صدقہ روایات کی روشنی میں بیان کرنا ہے — اس سلسلے میں وہ قصے کے افراد کے احساسات و جذبات، داخلی اور ذہنی کشمکش اور قلبی کیفیات کی مصوری بھی کرتے ہیں — کیونکہ ان کے کردار احساس سے عاری، پتھر کے مجسمے نہیں، بلکہ جیتے جاگتے، گوشت پوست کے زندہ انسان ہیں، جو مختلف واقعات اور حالات سے اثر پذیر ہوکر مناسب ردِ عمل اور تغیر کا اظہار کرتے ہیں — ایسی صورت میں شاعر اپنے آپ کو کردار کے ماحول میں فرض کر کے یہ سوچتا ہے، کہ اگر بعینہٖ یہ واقعات اس پر گذرتے تو اس کا اپنا رد عمل کیا ہوتا — اس طرح مصنوعی طور پر وہ ان جذبات کو اپنے اندر پیدا کرتا ہے اور پھر ان کو بیان کرتا ہے — ایسے جذبات کو مفوضہ یا نیابتی جذبات Vicarious emotions کا نام دیا جاتا ہے — یہ ممکن ہے کہ ان میں سطحیت اور تصنع ہو — مگر

---

(۱) مراثی دبیر جلد ۱ ص ۲۵ تا ۲۸ نولکشور ۱۹۲۷ء

(۲) " In its inner nature, belief or the sense of reality, is a sort of feeling more allied to the emotions than to any thing else.
Burtrand Russel, The Analysis of mind, Chapt 12 Page 252, Unwin Bros. Ltd, Woking 1951.

جب ایک سچا شاعر ان کو اپنا لیتا ہے، توپھر ان مین سچے جذبات کی تڑپ بھی پیدا ہوجاتی ہے ۔ غیر شخصی ادب اکثر وبیشتر اسی کا مظاہرہ ہے ۔ ڈرامہ نگار، ناول نگار اور قصہ نگار سب دوسرون کے رنج و مسرت کے نقشے کھینچتے ہین* ۔ مگر ان کو اپنائے بغیر یہ کام نہین ہوسکتا فارسٹر نے اس حقیقت کا اظہار اس طرح کیا ہے :-

" دلچسپ اور حساس فرانسیسی نقاد موسوم بہ "ایلی ان" کی اس بحث پر رائے اگرچہ نرالی ہے مگر مدد ضرور ہے ۔ وہ اپنے دل کی گہرائیون سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا ہے، مگر اس قدر نہین جس قدر کہ مین اپنے متعلق محسوس کررہا ہون ۔ لیکن یہ ممکن ہے کہ ہم دونون مل کر کنارے جالگین ۔ "ایلی ان" یکے بعد دیگرے، جمالیات کے مختلف شاہکارون کا معائنہ کرتے ہوئے، داستان پر پہنچتا ہے اور کہتا ہے کہ ہر انسان کی زندگی کے دو پہلو ہوتے ہین جن مین سے ایک تاریخ کے لئے اور دوسرا داستان سرائی کے لئے موزون ہے ۔ کسی انسان کے متعلق جو مشاہدے مین آتا ہے وہ اس کے اعمال کے علاوہ اس کا روحانی وجود ہے جو اس کے

فردوسی نے سہراب کی موت پر رستم کے جذبات کی تصویر کس خوبی سے کھینچی ہے

" The interesting and sensitive French critic under the name of Alian has some helpful, if slightly fantastic remarks, on this point. He gets a little out of his depth but not as much as I feel myself out of mine, and perhaps together, we may move towards the shore. Alian explains in his turn the various forms of aesthetic activity and coming to the novel (Le roman), he asserts that each human being has two sides, appropriate to history and fiction. All that is observable in a man - that is to say his actions and that of his spritual existence, as can be deducted from his actions ____ falls into the domains of history. But his romanceful or romantic side (Sa partie romanequ) includes the pure passions, that is to say, dreams, joys, sorrows and self comming which politeness or shame prevent him from mentioning and to express

Communing

Contd ..... Next sheet

افعال کی روشنی میں مستخرج ہوتا ہے ۔ اس کا تعلق تاریخ سے ہے، مگر اس کی زندگی کا رومانی پہلو جو خالص جذبات پر مشتمل ہے، یعنی اس کے سپنے، خوشیاں، غم، اپنے دل سے مکالمے، جنہیں وہ اخلاقی اقدار اور شرم کے بندھنوں کے مارے کھلے بندوں بیان نہیں کرسکتا ۔ داستان سرا کا سب سے بڑا فریضہ انسانی زندگی کے اس پہلو کا بیان ہے " ۔

دبیر اپنے کرداروں کے دلوں کی دھڑکنوں کو خوب سمجھتا ہے ۔ وہ ان کی نبض کی رفتار کو اچھی طرح پہچانتا ہے وہ ان کے غم کے ساتھ روتا ہے اور ان کی مسرتوں میں برابر کا شریک ہوتا ہے ۔ اس کی دروں بینی اور فطرت شناسی کے جوہر ہر موقعہ پر نکھرتے ہیں ۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں وہ اپنے ہمعصر شعراء سے بہت بلند ہوجاتا ہے ۔

دسویں محرم کی صبح کو حضرت امام حسین علیہ السلام کے دل کی کیفیت کی تصویر ملاحظہ ہو :۔

سجادے کو زہرا کے نمازی نے بڑھایا ۔۔۔ اور دست دعا کو طرف قبلہ اٹھایا
اللہ کو روکر یہ بصد عجز سنایا ۔۔۔ یا رب میں تری راہ میں مرنے کو ہوں آیا
اے رہبر کل توشۂ تسلیم و رضا دے
تو منزل مقصد پہ مسافر کو لگا دے

تو خالق غفار ہے میں بندۂ احقر ۔۔۔ مادر نہیں بابا نہیں نانا نہیں سر پر
دشمن مرے لاکھوں ہیں اور انصار بہتر ۔۔۔ اک خشک مرا حلق ہے اور سینکڑوں خنجر
یہ میں نہیں کہتا کہ ظفر دیجیو یارب
مقبول شہادت تو مری کیجیو یا رب

بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ اسی ورق کی دوسری طرف ملاحظہ فرمائیں ۔
[illegible]

یارب ہے خطرناک ترے عشق کی منزل   یہ راہ رسولون نے بہی کی قطع بمشکل

پہر کچہ نہین مشکل جو ترا فضل ہو شامل   معمور کر اب عشق سے اپنے تو مرا دل

سینے کو مرے مخزنِ تسلیم ورضا کر

ثابت قدمی تو مرے قدمون کو عطا کر

یوسف کو جو کچہ حسن کا اپنے ہوا دعویٰ   بس چند درم کو وہ بکے اے مرے مولا

لب پر ارنی حضرت موسیٰ کے جو آیا   وہ غش ہوئے دیکہا ترے نور کا جلوہ

جس دم یہ رسولون کا ترے حال ہوا ہو

اس بندۂ احقر کو نہ کیون خوف ورجا ہو

یارب ہے عیان تجہ کو مرے دل کا ہر اک راز   یہ فخر نہین تاج امامت سے ہون ممتاز

نازان نہین اس پر کہ ہون مین صاحب اعجاز   ہے فخر تو یہ فخر جو ہے ناز تو یہ ناز

تجہ سا مرا معبود ہے مین بندہ ترا ہون

تو شاہ مرا ہے مین ترے در کا گدا ہون

جب سنگ سے ٹوٹے در دندان پیمبر   وہ شکر بجالائے تیرا اے مرے داور

دروازہ گرا جب مری امان کے شکم پر   فریاد نہ کی رہ گئین پہلو کو پکڑ کر

رسی مین ترے شیر کو جب باندہ لیا تہا

قدرت تہی ہر اک طرح کی پر صبر کیا تہا

بہائی کو مرے زہر دغا جبکہ پلایا   صد پارہ جگر ہو کے دہن سے نکل آیا

ان ٹکڑون کو بہی سبحۂ صد دانہ بنایا   جز شکر کوئی حرف شکایت کا نہ لایا

خنجر کا مرے حلق پہ بہی جبکہ گذر ہو

امت کی دعا لب پہ ہو اور سجدے مین سر ہو (۱)

---

(۱) ج ۱ نولکشور ۱۹۳۷ء ص ۱۰۷ـ۱۰۸

اھل بیت زندانِ یزید میں ھیں کہ ھند کی آمد کی اطلاع ھوتی ھے ۔حضرت زینب اپنی پریشان حالت کو دیکھتی ھیں اور انہیں خیال پیدا ھوتا ھے کہ وہ خاندان نبوت کی چشم و چراغ ھیں اور اس بے پردگی اور فلاکت میں کسی سے ملنا خاندانی روایات کی توھین ھے ۔لیکن ایک قیدی کا کون سا فعل اس کے اپنے اختیار میں ھوتا ھے کہ اِس مجبوری اور بے بسی کی حالت میں حضرت کے دل کی کیفیت ملاحظہ فرمائیں :

بھائی کو یاد کرکے یہ زینب نے کی فغـان　　　فریاد یا حسین چھپوں جاکے میں کہاں

رھجائے پردہ پاس بلالو جو بھائی جان　　　دیکھے نہ ھند آکے کھلے سر مجھے یہاں

ھے ھے میں کیا کروں مجھے پہچان لے گی ھند

شرماؤں گی، ردا جو ترس کھا کے دے گی ھنـد

یہ تو نہیں سوال کہ زندان سے تم چھڑاؤ　　　ذلت کے وقت میں مگر وارثی کو آؤ

چادر بتول کی، نہ عبا مرتضی کی لاؤ　　　اپنا لہو بھرا ھوا دامن مجھے اوڑھاؤ

پھر بولی آہ بھول گئی بے کفن ھو تـم

دامن کہاں سے لاؤگے عریاں بدن ھو تـم

تھی سخت اضطراب میں زینب کی جانِ پاک　　　گاھے تو بیٹھان وہ چھپاتی تھی زیرِ خاک

گہ طوق اتارتی تھی گلے سے وہ سینہ چاک　　　گہ توڑتی تھی ھاتھوں کی رسی وہ دردناک

جب کچھ نہ بنتا تھا تو یہ کہتی تھی کیا کروں

آئے قضا تو شکر کا سجـدہ ادا کـروں (۱)

حضرت عباس دریائے فرات پر پہنچنے میں کامیاب ھوجاتے ھیں ۔پیاس سے نڈھال ھیں پانی پینا چاھتے ھیں، مگر حضرت امام حسین علیہ السلام اور دیگر افراد خاندان کا خیال آجاتا ھے تو پینے کا ارادہ ترک کر دیتے ھیں ۔حضرت کے اپنے دل سے مشورے دبیر کی زبانـی سنئے :

---

(۱) ص ۷۱ جلد ۱ نولکشور ۱۹۳۷ع

چلو بھرا فرات سے سرکا کے آستین | غیرت سے دیر تک اسے دیکھا کئے وھین
پھر لائے امتحان کے لئے ہوشون کے قرین | سینہ مین دل تڑپ کے پکارا نہین نہین

گو مہرِ فاطمہ ہے پہ مجھپہ حرام ہے
وارث جو فاطمہ کا ہے وہ تشنہ کام ہے

پانی جو بے حسین کے منہ سے لگائے گا | ہے ہے وفا کا نام ابھی ڈوب جائے گا
اس وقت آبرو جو گئی، پھر نہ پائے گا | یہ روز اب زمانے مین کا ہیکو آئے گا

حضرت کہان، فرات کہان، کربلا کہان
تا عصر خاتمہ ہے یہ دکھیہ بلا کہان

غازی نے دل کے مشورہ پر موجپا کہا | دریا سے روکے پیاسون کا سب ماجرا کہا
کاندھے پہ مشک بھر کے رکھی، یا خدا کہا | چلتے ہوئے اجل نے پیام قضا کہا

ہے ہے نصیب پیاسون کا رستے مین پھر گیا
سقہ حرم کا فوج کے طوفان مین گھر گیا (۱)

حضرت اکبر علیہ السلام میدان جنگ مین جانے کی تیاری کر رہے ہین ـ جاتے ہوئے اپنے خیمہ کی طرف نگاہ ڈالتے ہین ـ افرادِ خاندان کی حالت عجب ہے ـ تباہی، ویرانی، یاس، ماتم، پیاس، غم، الم، صبر، شکر، تسلیم، رضا، موت یکے بعد دیگرے تصاویر کی طرح آنکھون کے سامنے آجاتی ہین ـ دبیر، حضرت اکبر کی اس قلبی کیفیت کی تصویر کرتے ہین ـ

کھانے کی تمنا ہے نہ پانی کی تمنا | نے سلطنت عالمِ فانی کی تمنا
پھر کیا ہے فقط مرگ جوانی کی تمنا | پہلی ہے یہی احمد ثانی کی تمنا

مرنا تو ہے برحق سبھی اک روز مرین گے
لیکن یہ شباب اور اجل یاد کرین گے

(۱) ص ۱۶۰ جلد ۱ نولکشور ۱۹۳۷ء

چہرے سے مصیبت بھی تحمل بھی عیان ہے   آنکھون سے شجاعت بھی تجلی بھی عیان ہے
فاقے مین قناعت بھی توکل بھی عیان ہے   سودینے مین عجلت بھی تامل بھی عیان ہے

جلدی کا سبب شوق حضوریٔ خدا ہے

وقفہ کی جہت الفت شاہ شہدا ہے

برہم ہین یہ ماتم کی صفین دیکھ کے ہرسو   سر ننگے جو کنبہ ہے تو بل کھاتے ہین گیسو
خالی ہے جو خیمہ تو بھرے آتے ہین آنسو   عباس سا مہرو ہے نہ قاسم سا ہے گلرو

حیران ہون کہ دربار پدر ہوگیا خالی

رن بھر گیا گھر والون سے گھر ہوگیا خالی

حضرت حر اپنے سابقہ اعمال پر متاسف ہین ـ کیفیت دیکھئے ـ

حر صبح سے علحدہ گوشہ مین تھا کھڑا   انگشت خجالت جھف لب کے تلے اور یہ تھی حیا
اللہ توبہ آہ بڑی مین نے کی خطا   سید کو گھیر کر یہان لایا غضب کیا

نرغہ ہے ظالمون کا شہ خوش خصال پر

پانی ہے بند ساقیٔ کوثر کے لال پر   (لے ا نولکشور ۱۹۲۷ع ص ۲۶۵)

بالعموم دیکھا گیا ہے کہ جب کسی انسان سے قلبی تعلق ہو تو اس کی تکلیف کا احساس خود بخود ہوجاتا ہے ـ اگر کسی کا بچہ پردیس مین کسی مصیبت مین گرفتار ہو تو مان کا دل گھر مین بے قرار ہوجاتا ہے ـ قریبی رشتہ دارون پر حادثات کے وقوع سے یونہی دل بجھا بجھا سا رہنے لگتا ہے ـ خواہ ان کے مصائب کا علم ہویا نہ ہو ـ ہند زوجہ یزید کو اہل بیت کے مصائب کا علم نہین، مگر اپنے قلبی تعلق کی وجہ سے وہ بے حد بیقرار ہے ـ مگر اس بے چینی کے سبب سے قطعی لاعلم ہے ـ اس کی اس بیقراری اور بے چینی کی تصویر دیکھئے ـ

پر ہند کا توفیقِ خدا سے تھا عجب حال   مسند پہ وہ بیٹھی تھی رکھے آنکھون پہ رومال
تھا آنسوؤن کا تار بندھا اور کھلے بال   تہلیل ہوئی جاتی تھی گھڑیون وہ خوش حال

بے نذر وہ لیتی تھی نہ تسلیم کسی کی
حاشا نہ مدارات نہ تعظیم کسی کی

جس دم کسی عورت کی اترتی تھی سواری ۔ منہ پھیر کے دروازے سے وہ کرتی تھی زاری
سکتے میں کھڑی تھیں امرازادیاں ساری ۔ کہتی تھیں کہ یہ جشن ہے یا تعزیہ داری
ہم نذر کو آئے ہیں کہ پرسے کو کسی کے
کھلتے نہیں یہ راز جناب احدی کے

نذروں پہ نظر ہی نہیں فرماتی ہیں بی بی ۔ بے ساختہ اشک آنکھوں سے برساتی ہیں بی بی
کچھ سہم کے ہر بار لرز جاتی ہیں بی بی ۔ یوں روتی ہیں جو ہم کو بھی رلواتی ہیں بی بی
دولت ہے ریاست ہے حکومت ہے حشم ہے
حیرت ہے الٰہی انہیں کس بات کا غم ہے

تب ہند پکاری مجھے خود نہیں معلوم ۔ آنکھیں کیسے روتی ہیں میں ہوں کس لئے مغموم
سکتہ ہے مجھے شہر میں اس جشن کی ہے دھوم ۔ دل کڑھتا ہے کس کے لئے ہے کون وہ مظلوم
کھلتا نہیں کچھ بھی یہ کیا مجھ کو ہوا ہے
کیوں بال بکھیرے ہیں مرا کون موا ہے

در پر تو مرے جشن کی نوبت ہے سحر سے ۔ رونے کی صدا کان میں آتی ہے کدھر سے
دل ٹکڑے ہوا جاتا ہے کیوں درد جگر سے ۔ کیا ہے کہ گری پڑتی ہے چادر مرے سر سے
ہوں سوگ میں اور علم نہیں کس کی عزا ہے
کھلتا نہیں کیوں آنسوؤں کا تار بندھا ہے

حضرت امام حسین علیہ السلام کی شخصیت بڑی گونا گونان صفات کی حامل ہے ۔ ایک طرف تو وہ منصبِ امامت پر جلوہ گر ہیں ۔ اس منصب سے وابستہ وقار اور ذمہ داریاں ہیں ۔ دوسری طرف تمام جاں نثاروں کے ایک ایک کرکے کٹ کٹ کر مرجانے کا غم ہے اور تیسرے بس ماندگان کی

بے کسی، بے بسی اور متوقع بے حرمتی کا احساس ہے اور سب سے بڑھ کر اپنے معبود حقیقی کی رضا اور خوشی کے سامنے سر تسلیم خم ہے ۔ ان سب چیزوں نے مل کر آپ کی شخصیت کو متحرک (Dynamic) اور جامع الصفات بنا دیا ہے ۔ ایسے حالات میں ان کے جذبات و احساسات کی ترجمانی بڑا مشکل کام ہے ۔ کیونکہ اگر شاعر صرف روحانی اقدار، تسلیم و رضا، صبر و شکر اور راہ خدا میں قربان ہوجانے کی مسرت پر زور دیتا ہے، تو ان کی شخصیت کا وہ پہلو دب جاتا ہے جو انہیں ایک عظیم انسان، شفیق باپ اور مہربان بھائی، چچا یا دوست کے طور پر حاصل ہے ۔ اگر شاعر ان کے اس غم کا تذکرہ کرتا ہے، جو انہیں اپنے عزیزوں کے شہید ہوجانے یا پس ماندگان کی متوقع بیکسی اور مصائب پر ناگزیر تھا، تو یہ خطرہ ہے کہ کہیں یہ بیان منصب امامت کے وقار اور ان کی روحانی حیثیت کے منافی ہونے کی حد تک نہ چلا جائے ۔ غرضیکہ حضرت امام علیہ السلام کے جذبات کی ترجمانی میں یہ مقام بہت نازک ہے ۔ دبیر پر بالعموم یہ الزام عاید کیا جاتا ہے کہ اس موقعہ پر وہ حضرت امام کو ایسی حالت میں پیش کرتے ہیں کہ ایک سخت قسم کا جذباتی آدمی غم سے بے تاب ہوکر آہ و زاری اور سینہ کوبی میں مصروف ہے ۔ یہ الزام صرف اس حد تک درست ہے کہ مرثیہ کا ایک مقصد ماتم کے لئے مہیج اور تحریک کا سامان پیدا کرنا بھی ہے ۔ لیکن یہ نہ بھولنا چاہئے کہ جو حالات حضرت امام کو پیش آئے ان میں رو دینا یا درد سے بے قابو ہوجانا فطرت انسانی کے عین مطابق ہے ۔ دبیر اپنی ذمہ داریوں کو فن کاری سے نبھاتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ کوئی پہلو تشنہ نہ رہ جائے ۔ چند مرثیوں کے منتخب بند دیکھئے ۔

واقف ہے تو کہ تارک دنیا ہوں اے کریم — بچپن سے بہر ذبح مہیا ہوں اے کریم
مہماں ہوں اور نہر پہ پیاسا ہوں اے کریم — قاتل ہیں چار لاکھ میں تنہا ہوں اے کریم
شوق وصال سے مرا دل سب سے سیر ہے
میں مستعد ہوں وقت شہادت میں دیر ہے

سب قوم قتل ہوگئی اک میں جیا تو کیا — اب ظالموں نے رحم بھی مجھ پر کیا تو کیا
پہلے تو پانی بند کیا اب دیا تو کیا — کنبہ ترس کے مرگیا میں نے پیا تو کیا

بیچارگی کے وقت تو ہی چارہ ساز ہے
بندہ نیاز مند ہے تو بے نیاز ہے

سب نور چشم سامنے آنکھون کے مرگئے — عباس خاتمہ میرے لشکر کا کرگئے
قاسم کو مان پکار رہی ہے کدھر گئے — اکبر ناموادِ جہان سے گذر گئے

شش ماہہ سو رہا ہے مرا قتل گاہ مین
اچھی کمائی تھی کہ لٹی تیری راہ مین

اکبر کا سینہ نیزۂ کین سے ہوا فگار — بے شیر کے گلے سے ہوا تیرِ ظلم پار
بازو کٹا کے مرگئے عباس نامدار — پامال سبزہ سان ہوا پھر کا گلعذار
مہمان ہو کے رنج ہی کھایا حسین نے
پانی نہ ملک کے مہر کا پایا حسین نے

مجھ سے ارادہ جنگ کا ہے دور از قیاس — انسان لڑے تو اس سے کہ ہون جس مین کچھ حواس
اب فوج پاس ہے نہ علمدار میرے پاس — اسکے علاوہ بھوک ہے اور تین دن کی پیاس
فرزند کوئی قتل حضور نظر نہ ہو
وہ بے خبر ہون سر جو کٹے کچھ خبر نہ ہو

اب کس لئے فرات کو گھیرے ہے یہ سپاہ — عباس کو سکینہ نے کیا مشک دی ہے آہ
اب نہر علقمہ کی عبث روکتے ہین راہ — سقہ مرا تو قتل ہوا پیاسا بے گناہ
کیون تیغین تیز کرتے ہین شرم و حیا نہین
کہہ دو کہ اب ادھر کوئی پیاسا رہا نہین

یا خدا تجھ پہ مین صدقے میرا لشکر بھی نثار — دل فدا جان فدا روح فدا سر بھی نثار
علی اکبر بھی نثار اور علی اصغر بھی نثار — تجھ پہ باقر بھی فدا عابد مضطر بھی نثار

نادار ہوں میں حال مرا تجھ پہ ہے حالی　　دربار ہے بڑ تر تری سرکار ہے عالی

دامن مرا خالی ہے مرے ہاتھ میں خالی　　اب شوم ترے ہاتھ ہے اے خلق کے والی

کانپیں جو قدم ہاتھ پکڑ لیجیو میرا

ھدیہ کے لئے ہاتھ میں سر دیجیو میرا

امت نے بھلایا ہے مجھے تو نہ بھلانا　　توپاک ہے دنیا سے مجھے پاک اٹھانا

سب چھوڑ کے تنہا ہوئے منزل کو روانا　　یا ہادر خدا قبر کی وحشت سے بچانا

جب گور غریباں کا اندھیرا نظر آئے

ہر سمت کو جلوہ مجھے تیرا نظر آئے

نے گھر کی مجھے یاد ہے نے حب وطن ہے　　ہر خار تری منزل الفت کا چمن ہے

نے قبر کی فکر نے پروا ہے کفن ہے　　محتاج تری خلعتِ رحمت کا بدن ہے

مرضی ہو تو بے نام و نشان ہو کے مروں میں

عابد کو بھی باقر کو بھی قربان کروں میں

یارب مجھے راحت ہو نہ زخموں کو شفا ہو　　جو عضو ہیں بے درد انہیں درد عطا ہو

رگ رگ سے رواں خون ہو ہر بند جدا ہو　　جو آرزوئے دل ہے وہ پامال فنا ہو

مظلوم کے مرنے میں بہت اجر و جزا ہے

پانی نہ ملے تیغ کے نیچے تو مزا ہے

مدح میں خلوص جذبات (۳) شدتِ تاثر اور جذباتِ غم کے بیان کے علاوہ دبیر کے کلام میں داخلی شاعری کے اعلیٰ نمونے خدا کی حمد، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت اور آئمہ عظام کی منقبت میں ملتے ہیں (۱) ان کے اس نوع کے کلام سے خلوص قلب، سچی تڑپ اور گہری عقیدت کا اظہار ہوتا ہے ۔ دبیر کے زمانے میں جبکہ لفظی صنعت گری کا بازار گرم تھا ان کی یہ خصوصیت انہیں دوسرے شعراء سے ممتاز کردیتی ہے ۔

(۱) قصیدہ اور غزل جذباتی شاعری میں داخل ہیں ۔ شبلی شعرالعجم ص ۲۲۷ ج ۲ طبع عام آگرہ ۱۹۱۲ء

مین نے جو کچھ تیرے دربار سے پایا مولا

سب تری راہ مین خوش ہو کے اٹھایا مولا

وہ کلیجے پہ دھرے ہاتھ پڑے ہین اکبر ہے وہ عباس دلاور، وہ حسن کا دلبر

ایک اک پیارے کو قربان کیا گن گن کر کی امانت مین خیانت نہ ذرا اے داور

تو نے دولت جو تھی وہ خاک نشین سونپی سونپی

وہ امانت ترے بندے نے زمین کو سونپی

تو شہنشاہ ہے شہنشاہون کا ہے بار خدا ہین برابر تری درگاہ مین سب شاہ و گدا

خاطرِ عاشق جانباز ہے البتہ جدا اے خوشا حال کہ مجھ سے ہو ترا عشق ادا

حلق پر تیغ رہے، سینہ پہ جلاد رہے

لب پہ ہو نام ترا دل مین تری یاد رہے

در دندان میرے نانا نے تجھے نذر دیا لے گئین نذر کو پہلوئے شکستِ زہرا

سرخرو ہے ترے دربار مین بابا ~~میرا~~ میرا دل کے ٹکڑے مرے بھائی نے کئے تجھ پہ فدا

آج شبیر بھی ان ~~کے~~ سب کے مقابل ہو جائے

سر مرا گر تری سرکار کے قابل ہو جائے

لشکر دیا کنبہ دیا گھر بھی دیا تو نے سردار بھی تو نے کیا سر بھی دیا تو نے

مشکل پیمبر سا پسر بھی دیا تو نے یہ حوصلہ، یہ دل، یہ جگر بھی دیا تو نے

کیا فخر جو پیارون کو رہِ حق مین دیا ہے

تیری ہی عنایت کو فدا تجھ پہ کیا ہے

مجھ مین تھی قدرت کہ بھرے گھر کو لٹاؤن بازو ہو جدا ہاتھ نہ امت پہ اٹھاؤن

وان قتل ہو اکبر ادھر اصغر کو مین لاؤن تڑپے یہ مرے ہاتھون پہ مین لب نہ ہلاؤن

یون خوش کوئی ہنگام تباہی نہین ہوتا

بندے سے یہ بے فضل الٰہی نہین ہوتا

بدقسمتی سے ہمارے ملک اور زبان میں مدح کا لفظ بدنام ہے ۔ اس کے سنتے ہی ہمارا ذہن فارسی اور اردو کے ان قصائد کی طرف منتقل ہوتا ہے جو شاہانِ سلف اور امرائے دربار کی شان میں لکھے گئے اور بے جا مبالغے، بے تکی تعریفوں، اور لایعنی خرافات سے بھرپور ہیں ۔ فی الحقیقت ان مدحیہ قصاید کو سچی شاعری میں کوئی مقام حاصل نہیں، الا یہ کہ کہیں کوئی تشبیب داخلی عناصر کا امتزاج لئے ہوئے ہے یا یہ کہ کہیں مداح اور ممدوح میں قلبی روابط حقیقت کا رنگ دے گئے ہیں ۔ مگر بالعموم تمام خرافات، درباراداری کی ضروریات کی بنا پر عالم وجود میں آئی ۔ اور ان کی معنوی قدر و قیمت انہیں درباروں تک محدود رہی ۔ ان قصائد کی تخلیق کرنے والوں کو خُود بھی اس امر کا احساس تھا کہ جو صفات وہ اپنے ممدوحین سے منسوب کر رہے ہیں فی الواقعہ وہ ان میں موجود نہیں مگر جب دبیر یہ کہتے ہیں کہ ؎

قائل ہیں سب کہ ثانیٔ مولا محال ہے　　　اور ہے تو آئینے میں انہیں کا جمال ہے

تو وہ سچے دل سے اسے درست بھی تسلیم کرتے ہیں، کیونکہ اس دعوٰی کی اساس ان کے جذبات عقیدت اور روحانی تجربات پر ہے ۔ ان کا یہی اعتقاد ان سے یہ کہلواتا ہے ؎

آدم کا دادرس بنی آدم میں کون ہے ؟　　　یکتا خدا کے بعد دو عالم میں کون ہے ؟

دبیر کے کلام میں ان اندرونی مہیجات اور وجدانی تجربات کا یہ قدرتی نتیجہ ہے کہ ان کے کلامِ مدح و منقبت میں بے تکلفی اور سادگی کے علاوہ فطرت سے بھی ربط و تطابق پایا جاتا ہے مثلاً

آئینہ کہا رُخ کو تو کچھ بھی نہ ثنا کی　　　صنعت وہ سکندر کی، یہ صنعت ہے خدا کی

واں خاک نے صیقل، یہاں قدرت نے جلا کی　　　طالع نے کس آئینہ کو خوبی یہ عطا کی

ہر آئینہ میں چہرۂ انسان نظر آیا

اس رخ میں جمالِ شہ مرداں نظر آیا

اس سلسلے میں دبیر کے کلام سے مثالوں کا انتخاب زیادہ وقت طلب نہیں ۔ کسی مرثیہ

مین سے بھی انتخاب کیا جا سکتا ہے ۔ حمد مین مندرجہ ذیل بند دیکھئے ۔

طغری نویسِ کن فیکون ذوالجلال ہے ۔۔۔ فرمان روائے حق سلطنت بے زوال ہے
بندے سے ہو خدا کی ثنا یہ محال ہے ۔۔۔ اس جا زبانِ طوطیٔ سدرہ کی لال ہے
عالم کو اپنے زور کا عالم دکھا دیا
ظلمت کو نور، خاک کو آدم بنا دیا

خورشید کا غروب قمر کا طلوع ہے ۔۔۔ آخر ہوئی جو شب تو سپیدہ شروع ہے
ہر ایک سوئے قبلہ طلعت رجوع ہے ۔۔۔ ظاہر ہے ماہ نو سے کہ صرف رکوع ہے
لطف و غضب سے چہرے سفید و سیاہ ہین
وحدت پہ اس کی شام و سحر دو گواہ ہین

اے جل شانہ وہ غفور الرحیم ہے ۔۔۔ ہم سب ہین دردمند وہ کل کا حکیم ہے
رحمان و مستعان و رؤف الرحیم ہے ۔۔۔ اس کے سوا بھلا کوئی ایسا کریم ہے
ایمان بھی دے، مراد بھی دے، عزوجاہ بھی
روزی بھی بخشی خلد بھی بخشے گناہ بھی

ماہی کو آب، ماہ کو بخشا ہے قرص نان ۔۔۔ تارون کو نقل، شمس کو تنویر آسمان
نرگس کو آنکھ، غنچہ کو گل، سرو کو زبان ۔۔۔ پتھر کو لعل، کوہ کو بخشی شکوہ و شان
قطرے کو در عطا کیا، ذرے کو زر دیا
ہر خشک و تر کو فیض سے آسودہ کر دیا

نعت

حمد سے فوراً نعت کی طرف گریز کیا ہے ۔ ذرا کمالِ شاعری ملاحظہ ہو ۔

کیا کیا بیان کرون مین عنایاتِ کبریا ۔۔۔ پیدا پیمبرون کو پئے رہبری کیا
ہم کو محمدِ عربی سا نبی دیا ۔۔۔ بسم اللہ صحیفۂ فہرست انبیاء

آئے جو انبیائے ذوی الاقتدار تھے
محبوب کردگار کے وہ پیش کار تھے

آفاق بہرہ ور ہوا حضرت کی ذات سے — آگاہ ذات نے کیا حق کی صفات سے
تصدیق حکم حق کی ہوئی بات بات سے — رفتار نے لگا دیا راہِ نجات سے
سیکھے طریقے قرب خدا کے حضور سے
گمراہ آئے راہ پہ نزدیک و دور سے

سینوں سے سب کے دُور ہوا دردِ بیدلی — باقی رہی نہ پیکروں میں سستی و کاہلی
معراج ان کے ہاتھ سے معراج کو ملی — وان چاند ٹکڑے ہوگیا انگلی جہاں ہلی
انگلی سے دو قمر کو کیا کس جلال سے
فل تھا کہ فال چاند کا کھولا ہلال سے

سرتا قدم لطیف تھا پیکر مثال جان — اس وجہ سے نہ سایہ بدن کا ہوا عیاں
قالب میں سایہ ہوتا ہے، پُر روح میں کہاں — سایہ انہیں کا ہے یہ زمینوں پہ آسمان
معراج میں جو وارد چرخ نہم ہوئے
سایہ کی طرح راہ سے جبریل گم ہوئے

سایہ بدن کا پاس ادب سے جدا رہا — محبوب سے ہمیشہ وصال خدا رہا
یہ عاشق خدا بھی خدا پر فدا رہا — سایہ سے اپنے دور رسول خدا رہا
دیکھو یہ باغ نظم جو رغبت ہو سیر کی
پرچھائیں تک نہیں یہاں مضمون غیر کی

یہاں ۸ یہ اعتراض ممکن ہے کہ ان اشعار میں ایک مخصوص قسم کے مذہبی اعتقاد کی بنا پر شاعر نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے ۔ اس لئے اس قبیل کے کلام کو شاید دنیا کے عظیم ادب میں جگہ نہیں دی جاسکتی ۔ ممکن ہے کہ اس اعتراض میں کسی حد تک وزن ہو

کیونکہ زندگی کی اقدار کے ساتھ ساتھ ادبی اقدار بھی تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ مگر ادبی دنیا کے اکثر عظیم شاہکار مثلاً رامائن مہابھارت ایلیڈ شاہنامہ وغیرہ کی بنیاد مخصوص مذہبی اعتقادات پر ہے۔ ان میں اصنام خیالی کا بھی ذکر ہے اور معبود حقیقی کا بھی اصل چیز تو شاعر کے احساسات کا خلوص ہے کیونکہ "دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے" صرف اس شاعری کو عظیم ادب سے خارج کیا جاسکتا ہے جو تبلیغی نوعیت کی ہو۔ یہاں تو محض اس الفت کا اظہار ہے جو شاعر کو معبود حقیقی یا چند تاریخی ہستیوں سے ہے جو اتفاق سے اس کے مذہبی رہنما بھی ہیں۔

دوسرا امر جو دینی شاعری کو عظیم ادب سے علحدہ کرتا ہے وہ جذبات کا فقدان ہے۔ یہاں یہ اعتراض بھی وارد نہیں ہوتا کیونکہ ان اشعار میں نہ صرف یہ کہ جذبات عقیدت کی فراوانی ہے، بلکہ ایک گہری وابستگی، قلبی تاثر اور محبت کا احساس بھی موجود ہے۔

تیسرے ان اشعار میں شاعر کا خطاب بنیادی طور پر اپنی ذات سے ہے وہ اپنے ممدوح کی چند نمایاں صفات سے متاثر ہوکر (جنہیں وہ سچے دل سے درست سمجھتا ہے) ان کے اعتراف کو ناگزیر سمجھتا ہے۔ ایسی صورت میں انہیں داخلی شاعری سے خارج نہیں کیا جاسکتا۔ مدح و مناقب کے سلسلے میں ابھی چند مثالوں کی گنجائش ہے جو درج ذیل ہیں:

منقبت جناب امیر علیہ السلام

اہل عطا میں تاج سر اہل اتّقا یہ ہیں
اخیار ذی زمن میں، شہ لافتیٰ یہ ہیں

خورشید انور فلکِ اِنّما یہ ہیں
کافی ہے شرف یہ کہ شہ مشکل کشا یہ ہیں

ممتاز گو خلیل، رسولان دین میں ہیں

کاشف ہے لو کشف یہ زیادہ یقین میں ہیں

● ● ● ● ● ●

مقام ولادت حضرت امیرالمومنین

کعبہ کو فخر اس شہ گردون نشین سے ہے
ممتاز وہ ولادت سلطان دین سے ہے

بے شک شرف مکان کا ذات مکین سے ہے — کرسی کا پایہ اوج پہ عرش بوین سے ہے

ہر حقِّ خانہ زادیٔ حق کیا ادا کیا

مسجد مین روزے دار نے سر کو فدا کیا

....

مناقب حضرت فاطمة الزہرا خاتون جنت

بلقیس پاسبان ہے، یہ کس کی جناب ہے — مریم درود خوان ہے، یہ کس کی جناب ہے

شان خدا عیان ہے، یہ کس کی جناب ہے — دہلیز آسمان ہے، یہ کس کی جناب ہے

کرسی زمین سے لیتی ہے گوشے پناہ کے

بیٹھا ہے عرش سایہ مین اس بارگاہ کے

حوران ہشت خلد مین اک اہتمام کو — دارالسلام در پہ جھکا ہے سلام کو

سجدہ یہین حلال ہے بیت الحرام کو — سورج نثار صبح کو ہے چاند شام کو

دیکھا کرین کھڑے ہوئے اس آستان کو

یان بیٹھنے کا حکم نہین آسمان کو

صحرائے لامکان کی فضا اس سے تنگ ہے — جنت کا نام اس کی بزرگی کا ننگ ہے

فضل خدا کے سایہ کا ہر جا پہ ڈھنگ ہے — یان دھوپ مین بھی کاغذ ابری کا رنگ ہے

زائر کو اس حریم کے عیش و نشاط ہے

اس کا بچھونا رحمت حق کی بساط ہے

ہر خشت روضہ دفتر حکمت کی فرد ہے — معدوم یان زمانے کا ہر گرم و سرد ہے

یان غم کا ہے غبار نہ کلفت کی گرد ہے — ہر صاحب رواق کے پہلو مین درد ہے

ہم تم یہ جانتے ہین کہ سوتی ہین فاطمہ

اس کی خبر نہین ہے کہ روتی ہین فاطمہ

مدھوش ھین فضائل زھرا مین چشم وگوش — خود بے لباس اور خلائق کی پردہ پوش

عسرت سے بے حواس مگر یاد حق کا ھوش — فاقہ سے چھرہ خشک مگر دریادلی کا جوش

مستغنی المزاج ھین عالم نواز ھین

زیور سے مثل ذات خدا بے نیاز ھین

رخ جلوہ گاہ قدرت پروردگار ھے — دل رازدار خلوت پروردگار ھے

سرجان نثار رحمت پروردگار ھے — تن خاکسار طاعت پروردگار ھے

تسبیح سے عیان شرف فاطمہ ھوا

ذکر خدا کا فاطمہ پہ خاتمہ ھوا

باغون مین خلد نہرون مین کوثر ھے انتخاب — قبلون مین کعبہ صحفون مین آخری کتاب

تارون مین آفتاب مین پھولون مین گلاب — سو عورتون مین فاطمہ مردون مین بوتراب

شاہ زنان وقت مسیحا کی مان ھوئین

زھرا ھر ایک عصر مین شاہ زنان ھوئین (ص ۱۷۹ ج ۱ نولکشور ۱۹۳۷ء)

مندرجہ بالا اشعار مین اگر مذھبی جذبات سے قطع نظر تمام مدح کی بنیاد محض قلبی خلوص ھی پر رکھی جائے / پھر بھی مدح کے حسن و خوبی مین کوئی فرق نہین پڑتا یہی حال حضرت امام حسن علیہ السلام کے مندرجہ ذیل مناقب و فضائل کا ھے ؎

حضرت امام حسن علیہ السلام

کیا خُلق حَسن تھا حَسن زیبِ قبا مین — کیا خوب فضائل تھے شہ ارض و سما مین

سر سجدۂ حق مین تو قدم راہ رضا مین — دل یادِ خدا مین تو زبان ذکر خدا مین

ان کے لئے قرآن تھا وہ قرآن کی خاطر

سینہ سپر حفظ تھا ایمان کی خاطر

ھر تارِ نفس رشتۂ اجزائے شریعت — بازو تھا ھر اک قوت بازوئے امامت

منظور نظر چشم کو مردم پہ عنایت اور دست گہربار کو دستور سخاوت

رفتار نے روشن یہ کیا تھا شہ دین کو

عینک تھا ہر ایک نقش قدم اهل زمین کو

لکھا ہے سرپاک سے تا سینۂ انور محبوب الہی سے مشابہ تھا وہ سرور

اور سرخ و سپید آپ کا تھا رنگ مطہر گردن کی صفا طلعت خورشید سے بہتر

رخسار سے نسبت نہین کچھ شمس و قمر کو

اک شب کو نثار اس پہ کرون ایک سحر کو

آنکھون کی سفیدی و سیاہی کو کہون کیا دیکھو سحر و شام تو سیری نہ ہو اصلا

ہر دیدۂ انور تھا پسندیدۂ دنیا تھا صاف سیاہی و سفیدی سے یہ پیدا

دنیا مین جو کچھ ہوتا ہے ہر شام و سحر مین

وہ حال شب و روز تھا سب ان کی نظر مین

دندان بجگہ جو گہر تھے دہن معدن گوہر تقریر تھی سلک در شہوار سے بہتر

پر زہر سے ٹکڑے جو کلیجہ ہوا یکسر اور لخت جگر منہ سے نکلنے لگے باہر

یاقوت سا ہر لخت جگر سرخ ہوا تھا

اس وقت دہن معدن یاقوت بنا تھا

ہے نام حسن حسن مین وہ چہرۂ اسلام مشق حسنات ابدی سے ہوا تام

اس خاصۂ اللہ کا انعام تھا یہ عام سب خاص بھی اور عام بھی سب مورد انعام

آنکھون مین حیا زور ~~خدا~~ خداداد بدن مین

موجود تھے سارے حسنات ایک حسن مین (ص ۳۶۲ ج ا نولکشور ۱۹۳۷ء)

حضرت امام حسین علیہ السلام مرثیہ گویون کے اعلیٰ کردار ہین ۔ ساری کہانی ان کے گرد گھومتی ہے ۔ اس لئے ان کی مدح مین انتہائی زور صرف کیا جاتا ہے ۔ یون بھی آپ کے کردار

کی خصوصیات اتنی دلآویز ہین کہ بے اختیار تعریف کو جی چاہتا ہے ۔عقیدہ کے لحاظ سے بھی حضرت امام حسین علیہ السلام کی ذات والا صفات دبیر کے لئے بڑی محترم تھی ۔اسی لئے تو وہ کہتے ہین ؎

کر مدحت حسین اسی مین نجات ہے دنیائے بے ثبات کوان سے ثبات ہے

بے عیب حق کی ذات ہے یاان کی ذات ہے حکم ان کا اور کلام محمد ایک بات ہے

کس منزل نیاز کے سالک حسین ہین

جب تک خدا کا ملک ہے مالک حسین ہین

باران وقطرہ باغ وگل ومعدن وگہر صحرا وذرہ برج ونجوم آتش و شرر

طور وکلیم آب بقا خضر نامور ظلمات ونور وشہر وبیابان وخشک وتر

قائل ہین سب کہ ثانیٔ مولا محال ہے

اور ہے تو آئینہ مین انہین کا جمال ہے

بندے مین شان رب صمد جل شانہ ہر وقت عاجزون کی مدد جل شانہ

امت کی مغفرت مین یہ کد جل شانہ مذبوح اور حیات ابد جل شانہ

ہم کچھ نہین جو یہ جانتے کیسے حسین ہین

مالک ہین سب خدائی کے ایسے حسین ہین

نقاش ونقش کاتب وخط بانی وبنا بود ونبود وذات وصفت ہستی و فنا

آدم ملک زمین فلک گرد کیمیا دنیا ودین حدوث وقدم بندہ وخدا

شاہد ہین سب کہ صاحب اعجاز ہین حسین

جان آفرین کے عاشق جانباز ہین حسین (ص ۲۸ ۔ ۲۹ ج ۴ انولکشور ۱۹۳۷ء)

سراپا

مندرجہ ذیل سراپا جو مدح ہی کا دوسرا نام ہے تخیل کی بلندی کی ایک عمدہ مثال ہے :۔

اللہ رے حسنِ رخ پر نور کا عالم — ظلمات کے عالم کو کیا نور کا عالم
اک سنگ مین سوطور کی طلعت ہے فراہم — اک ذرّہ مین روشن ہین کئی نیّر اعظم

قابیل نے ھابیل کو جو قتل کیا ہے
نعم البدل آدم کو یہ خالق نے دیا ہے

چہرہ چمن قدرتِ خلاق دو عالم — خورشید ہے اس باغ کا اک قطرۂ شبنم
عیسیٰ ہے سخن ہونٹ طہارت مین ہین مرہم — اور روح مسیحا لب جان بخش کا اک دم

ہر صنعتِ حق اک رخِ روشن سے عیان ہے
جان قالبِ آئینہ مین اس رو سے روان ہے

ہر جلوۂ حق حصے مین اس چشم کے آیا — صانع نے جمال آنکھ کے پردے مین اٹھایا
نور نظر اس چشم سے آفاق نے پیدا کیا پایا — یہ وجہ ہے جو آنکھ مین سرمہ نہ سمایا

سرمہ کی سلائی اسے درکار نہین ہے
محتاج عصا مردم بیمار نہین ہے

سرگوشی ادھر کرتے ہین الہام الٰہی — وان کان مین کچھ کہتے ہین احکام الٰہی
لینے کو چلے آتے ہین پیغامِ الٰہی — ہوشون کا نشان کیا ہے فقط نام الٰہی

یا ذکر ہے یا شکر اسے رب ھدا کا
سانچہ ہے یہ منہ نامِ خدا نامِ خدا کا

کیا غلغلۂ ابروئے پیوستہ اٹھے ہین — تعریف کو مداح کمربستہ اٹھے ہین
ہاتھون پہ لئے نظم کا گلدستہ اٹھے ہین — میزان کی طرح مصرعۂ برجستہ اٹھے ہین

ابرو کا رخ صاف پہ پرتو نظر آیا
خورشید کے دامن مین مہِ نو نظر آیا

شب کے ہین فقط چار پہر خلق مین مشہور — انتیس کا یا تیس کا ہے چاند بدستور

پر ماہ کئی سال کا ہے یہ رخ پر نور طول شب کا گل سے تحیر مین ہین جمہور

بڑھ کر رخ روشن سے یہ کاغذ ہے یہ پڑی ہے

لو قدرت حق ماہ سے یہ رات بڑی ہے

مدّاح کو اب رخ کی ثنا مدّ نظر ہے عارض پہ فدا آئینہ شمس و قمر ہے

وصف لب رنگین مین زبان موج گہر ہے انوار مضامین پہ طبیعت کا گذر ہے

ابواب فصاحت کو دہن کھول رہا ہے

موتی ہی نرے وقت سخن کھول رہا ہے

بالون کے محاسن کے محاسن ہین فراوان زلفون پہ شب بدر و شب قدر ہے قربان

پیدا ہے یہان خط و کاکل رخ تابان ثابت ہوا آیا ہے انہین راتون مین قربان

تازہ ہے یہ رخ چشمۂ امید کے مانند

یک رو ہے بد و نیک سے خورشید کے مانند

سلک در دندان کو عجب حسن ملا ہے یہ نور فقط ذکر الہی کا صلہ ہے

گردش ہی سے تسبیح کے دانون کو جلا ہے دندان و لب پاک مین کیا ربط و ولا ہے

ان موتیون کے رشتہ مین یاقوت اگر ہین

یہ لعل وہ ہین جن کی قرابت مین گہر ہین

مدح حضرت عباس

بے مثل جبین ہے نگہ اہل یقین مین بس ایک یہ خورشید ہے افلاک و زمین مین

جلوہ ہے عجب ابروون کا قرب جبین مین دو مچھلیان ہین چشمۂ خورشید مبین مین

مردم کو اشارہ ہے یہ ابرو کا جبین پر

ہین دو مہ نو جلوہ نما چرخ برین پر

بینی کو کہوں شمع تو لو اس کی کہاں ہے　　پر نور ہوں پر مجھے شعلہ کا گمان ہے

دو شعلے اور اک شمع یہ حیرت کا مکان ہے　　عان زلفوں کے کوچوں سے ہوا تند رواں ہے

سمجھو نہ یہ ہوں بس کہ ہوا کا جو گذر ہے

یہ شمع کی لو گاہ ادھر گاہ ادھر ہے

گر آنکھ کو نرگس کہوں ہے عین حقارت　　نرگس میں نہ پلکیں ہیں نہ پتلی نہ بصارت

چہرے پہ مہ عید کی بن جائے اشارت　　وہ عید کا مژدہ ہے یہ حیدر کی بشارت

ابرو کی مہ نو میں نہ جنبش ہے نہ ضو ہے

اک شب وہ مہ نو ہے یہ ہر شب مہ نو ہے

....

مدح حضرت اکبر

صورت گر آئینہ الفاظ و معانی　　لکھتا ہے یہ اب اکبر کا سراپائے جوانی

نازک بدنی، سروقدی، غنچہ دہانی　　افسردہ دلی، خستہ تنی، تشنہ دہانی

نقشہ یہ کھچے جبکہ یہ سامان بہم ہو

انگشت و کف روح امین، لوح و قلم ہو

یہ رخ ہے کہ قدرت کا ہے آئینہ اسرار　　آئینہ گر آئینہ پہ صیقل کرے سو بار

اس آئینہ ضو ہو نہ تا حشر نمودار　　برسوں میں بھی اس شکل کا ہے کھینچنا دشوار

ضو چہرۂ حیدر کی نظر آتی ہے اس میں

تصویر پیمبر کی نظر آتی ہے اس میں

....

حر علیہ الرحمت کی تعریف میں

اب وصف خط و خال قلمبند کیجئے　　اس بند پر ستاروں کو اسپند کیجئے

دل مدح رخ کے لکھنے سے خورسند کیجئے　　نقطہ پہ فخر چاند سے دہ چلند کیجئے

وصف جبین و عارض و خال آشکارا ہے

خورشید میں قمر ہے قمر میں ستارا ہے

رخ پر عرق کے قطرون کا ہے دھوپ مین ظہور　　یا ہے گہر کا چشمۂ خورشید سے ظہور

ہے عازم جہاد و جو گری مین یہ غیور　　قطرے نہ سمجھو منہ پر برستا ہے آج نور

یہا ہیلا سا نثار ہوتا ہے اپنے امام پر

نیسان گہر فشان ہے حر نیک نام پر

باب پنجم

دبیر کے کلام مین ایپک کے عناصر

هر مرثیه کی آزاد حیثیت ـ مرثیون کو ملاکر مناسب استخاب سے ایپک کی تشکیل ـ

دبیر کے کلام مین داستان سرائی کے عناصر ـــ موضوع کی جاذب نظری ـ

حیرت کا عنصــــر ـ نیک وبد کردارون کا تضاد وتقابل ـ اور ان کا نفسیاتی تجزیه

کهانی مین مقصدیت ـ ایک مرثیه " دست خدا کا قوت بازو حسین هے " کا تجزیه ـ

مرثیه کے اندر ایک اور مرثیه " اے مومنو حسین سے مقتل سے قریب هے ـ

دبیر کے کلام میں ایپک کے عناصر

" مرثیہ اور دوسرے اصناف سخن " کی بحث میں اس صنف سخن کا ایپک سے مقابلہ کرتے ہوئے یہ بیان کیا گیا تھا کہ مرثیہ گو شعراء ایک مربوط اور مسلسل ایپک ہرگز نہیں لکھنا چاہتے تھے ۔ ان کا کہا ہوا ہر مرثیہ دوسرے مرثیہ سے آزاد اور علیحدہ حیثیت کا مالک ہوتا ہے ۔ سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب نے بھی انیس کے مراثی کا ذکر کرتے ہوئے " رزم نامہ انیس " (مطبوعہ سرفراز قومی پریس لکھنؤ) کے دیباچہ میں اعتراف فرمایا ہے کہ " انیس کا ہر مرثیہ ایک مستقل نظم ہے " (ص د) نیز یہ بھی فرمایا ہے " کہ کاش اس شاعر اعظم (انیس) نے کربلا کے عظیم واقعے پر ایک طویل رزمیہ نظم تصنیف کی ہوتی جو ہماری شاعری کی عظمت میں اضافہ کرتی ۔ اور جسے ہم دنیا کی عظیم رزمیہ نظموں کے مقابلے میں پیش کرسکتے (ص م) بعینہٖ دبیر کے متعلق بھی یہی کہا جاسکتا ہے کہ اس نے ہر مرثیہ ' ایک مخصوص مجلس کے لئے لکھا جس میں موقعہ کی مناسبت سے ایک یا ایک سے زیادہ واقعات بیان کئے ۔ مراثی کی ترتیب میں کسی نظام کا خیال نہیں رکھا ۔ بلکہ موقعہ کی ضروریات کو زیادہ اہمیت دی ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی ایک مرثیہ میں چھوٹے بڑے متعدد اجزا مل جائیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ دبیر کے کلام کو اس طرح مرتب کرلیا جائے کہ ایک طویل ایپک کی تشکیل ہوجائے ۔ مگر پورے مراثی کو ابواب کی حیثیت عطا نہیں کی جاسکتی ۔ انیس کے کلام سے بھی ایپک کی تشکیل اسی طرح کی جاتی ہے :-

" یہ شرط (عام یک رنگی اور ہمواری) پوری کرنے کی غرض سے کہیں کسی بیان کی جگہ بدلی گئی ۔ کہیں ایک بیان کے اندر بندوں کی اور کہیں ایک بند کے اندر مصرعوں کی ترتیب بدلی گئی ۔ کبھی ایک بند کے چار مصرعے کہیں سے اور بیت کہیں اور سے لی گئی ۔ اور کہیں ایک مصرعے کی جگہ کسی دوسرے مصرعے کو دی گئی ۔ کسی بند کو ایک جگہ سے ہٹاکر دوسری

جگه رکھتے وقت ربط کلام اور مناسبت مقام کے تقاضے سے کبھی کبھی ایک دو لفظ اور دو چار جگه جہان کوئی اور صورت ممکن نه تھی پورا مصرعه بدلنا پڑا " (۱) ظاہر ہے که اس قطع و برید کے بعد جو ایک تشکیل پائی ہے اس کی داد کے مستحق میر انیس مرحوم سے کہین زیادہ جناب رضوی صاحب خود ہین ۔ کہنا یه ہے که مرثیه گو شعراء کے ہان ایک کی تلاش بے سود ہے ۔ ہان ایک کے بعض عناصر بلاشبه موجود ہین ۔

دبیر اور داستان گوئی | جان بیوکن گذشته صدی کی کہانیون کو شاہکار قرار دیتے ہوئے ان کی خوبیان اس طرح اجاگر کرتا ہے :

" سب سے پہلی چیز کہانی ہے جو قاری کے دل و دماغ پر قبضه پالیتی ہے ۔ جس مین نه صرف یه که تحیر اور ڈرامے کے عناصر پائے جاتے ہین ۔ بلکه ایسے کردارون کی بھی کثرت ہے جو چلتے پھرتے زنده انسانون کی طرح جانے پہچانے جاسکتے ہین ۔ نیز راوی ان کے متعلق اپنا فیصله دینے سے قطعی گریز نہین کرتا ۔ وه ایک فریق کو حق پر اور دوسرے کو باطل پر سمجھتا ہے ۔ تیسرے وه اپنی کہانی کو غیر ضروری واقعات کی فہرست نہین بناتا بلکه دانائی سے ان کا مناسب انتخاب پیش کرتا ہے ۔ چوتھے راوی اپنے منتخب کرده واقعات مین بنیادی دلچسپی تو لیتا ہے مگر ان کے متعلق اپنے ردّ عمل اور ذہنی کیفیات کے بیان کرنے سے پرہیز کرتا ہے ۔ آخر مین اس کہانی کے بیان مین ایک مقصد یا عقیده کی تبلیغ بھی کارفرما ہوتی ہے ۔"

---

(۱) ص د ۔ دیباچه رزم نامه انیس ۔ سید مسعود حسن رضوی ادیب ۔ کتاب نگر لکھنؤ

"In the first place they tell a good story-some-thing which grips and enthrals the reader, with ~~xxxxxxxxxx~~ true drama and wonder in it. In the second place, they are full of characters recognisable as real types and they pass judgement on these characters; that is, the story teller regards some definitely good and some as definitely bad. In the third place, their method of reproducing reality is not that inventry of details but of a judicious selection. In the fourth place, the story teller is primarily interested in the events he has to tell of, and not jargon of today calls his "reaction" to them. He does not stop to obtrude his own mind. Lastly, he has a dominant purpose, a lesson, if you like, to teach, a creed to suggest." Jhon Bukan, the Novel and the Fairy Tales, More Modern Essays, P22, 23 Longman & Green, 1949.

مندرجہ بالا اقتباس سے مندرجہ ذیل نتائج برآمد ہوتے ہین :-

۱ ۔کہانی کے موضوع مین جاذب نظری جسے ندرت پلاٹ کی خوبی اور اسلوب بیان سے پیدا کیاجاسکتا ہے ۔

۲ ۔ حیرت کا عنصر جسے علمائے نفسیات "تحیر اور نقاد حضرات التوائے حقیقت سے تعبیر کرتے ہین ۔

۳ ۔ نیک اور بد کردارون کے تضاد وتقابل سے کہانی مین دلکشی پیدا ہوتی ہے ۔

۴ ۔کردارون کے تجزیہ کے ساتھ ساتھ راوی کا خود اپنا تجزیہ اسے بعض اوقات کہانی کے فطری ارتقا سے ہٹا کر اپنے تحت الشعور کی وادیون مین پہنچا دیتا ہے (لیکن اپنے آپ کو کردار کے روپ مین ڈھال کر اس کے جذبات اپنالینا اور ان کا اظہار خوبی ہے) ۔

۵ ۔کہانی کے بیان مین بالواسطہ طور پر کسی مقصد یا عقیدہ کی تبلیغ کی جاسکتی ہے الغرض، پلاٹ کردار فضا ماحول اور نقطہ نظر (مقصد) سے کہانی کی تشکیل ہوتی ہے اسلوب بیان ان سب عناصر پر محیط ہے جیساکہ ممتازحسین نے کہاہے :-

" پہلے موضوع کو جانچیے کہ آیا کہانی لکھنے والے نے اپنے موضوع کے ارتقا مین تمام جزئیات سے کام لیا ہے یا نہین ۔وہ اپنی شخصیت کو کردار کے پیچھے رکھتا ہے یانہین واقعات کو بیان کرنے مین خارجیت کو قائم رکھتاہے یا نہین ۔اگر وہ اس کو پورا کرچکا ہے تو پھر اندازبیان کو جانچیے " (۱)

ایپک کی بحث مین عام داستانون کے انداز کو شامل کرلینا بظاہر کچھ چونکاسادیتاہے لیکن اگر ~~انہین اصولون~~ کسی منظوم داستان مین " ہیرو کی عظمت اور اس کے مقاصد کی بلندی " کو شامل کردیا جائے تو باقی امور دونون حالتون مین یکسان ہین ۔

---

(۱) ممتازحسین نقد ۔ حیات ص ۱۱۰ مطبوعہ الہ آباد پبلشنگ ہاؤس الہ آباد ۱۹۵۰ء

دبیر کے کلام کا اس حیثیت سے جائزہ لینے کے لئے "دست خدا کا قوت بازو حسین ہے" ایک سو نو بند کا مرثیہ انتخاب کیاجاسکتا ہے ۔ اس میں حضرت امام حسین کے سفر مدینہ سے لے کر ان کی شہادت تک کے جملہ واقعات کا بیان کیا گیا ہے ۔ راقم الحروف کے خیال کے مطابق داستان گوئی کے لحاظ سے یہ دبیر کا نمائندہ مرثیہ ہے ۔ اس کا انتخاب بطور ضمیمہ شامل ہے انتخاب میں صرف وہی بند قطع کئے گئے ہیں جن میں یا تو تکرار تھا یا محض" بین " ۔ اس امر کی پوری احتیاط کی گئی ہے کہ کوئی ایسا بند قطع نہ ہونے پائے جس سے داستان کے تسلسل اور ربط پر اثر پڑے (اس سے طویل مرثیے بھی دبیر کے ہاں موجود ہیں مگر اس مرثیے میں زیادہ سے زیادہ واقعات بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے) ۔

مرثیہ کی ابتدا چند مدحیہ اشعار سے ہوتی ہے اور پھر جبرئیل کی زبانی "بیعت" کے جھگڑے سے متعارف کروادیا جاتا ہے ۔ اور اس طرح داستان کا آغاز ہوتاہے ۔ سفر کی ابتدا کے ساتھ ساتھ موسم کا بیان کیاجاتا ہے جو ایک مناسب فضا کی تشکیل میں مدد دیتا ہے ۔ اور نہایت مناسب اور برمحل ہے ۔ راستے میں فریق مخالف نے حضرت امام حسین علیہ السلام اور ان کے رفقا کو تنگ کرنے جاہ وحشم کے اظہار اور بعض سیاسی مقاصد کی تکمیل کے لئے جو انتظامات کر رکھے تھے ان کا ذکر بھی اشارةً کردیا گیا ہے ۔ لیکن بعض اہم واقعات جن میں حر کا راستہ روکنا اور نامہ وپیام بھی شامل ہیں ۔ شاعر نے نظر انداز کر دیے ہیں ۔ حالانکہ اس المیہ سانحہ کی تعمیر میں ان واقعات کا بھی بہت بڑا حصہ ہے ۔ لیکن شاعر ان کو چنداں اہمیت نہیں دیتا ۔ وہ انہیں کسی دوسری مجلس میں بیان کرچکا ہے ۔ اور جانتا ہے کہ اس کے ناظرین ان تفصیلات سے بے خبر نہیں ۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اس مجلس میں جس میں یہ مرثیہ سنانے کے لئے لکھا گیا تھا وہ اسقدر تفصیلات کو چنداں اہمیت نہیں دینا چاہتا ۔ اس موقعہ پر اس کی دلچسپی کا مرکز داستان کا اعلی کردار ہے اور اس کے سامنے داستان کے چند پہلویا حصے بیان کرنے کا ہے ۔ چنانچہ جلد ہی وہ راستہ کی تفصیلات کو نظر انداز کرتے

ہوئے سفر کی آخری منزل پر پہنچ جاتا ہے اور جائے قیام کی جغرافیائی کیفیت بیان کرتے ہوئے کہانی کے انجام کی پیشین گوئی کردیا ہے ۔اس سے شاعر کا مقصد " شدت تاثر " تو پورا ہوجاتا ہے مگر کہانی میں جو فوائد التوائے حقیقت Suspense سے حاصل کئے جاتے ہیں وہ فوت ہوجاتے ہیں ۔اس موقعہ پر ایک تازہ مطلع بھی موجود ہے (اے مومنو حسین سے مقتل قریب ہے) یعنی اگر کوئی چاہے تو پہلے سارے واقعات بھی نظر انداز کردے اور یہیں سے مرثیہ شروع کرلے بلکہ اس امر کی اجازت ایک نوٹ کے ذریعہ سے دے دی گئی ہے (ملاحظہ ہو یہ مرثیہ ۔مراثی دبیر جلد اول میں مطبوعہ ۱۹۳۷ع نولکشور) ۔ اس کی بڑی وجہ سوز خوانوں کی سہولت ہے جو طویل مرثیوں کے متحمل نہیں ہوسکتے ۔

ڈیرے ڈالے جاچکے ہیں ۔پانچ بند حضرت امام حسین علیہ السلام کے خیمہ کی تعریف میں ہیں اور پھر لشکر کے قیام کے مختلف پہلو اور داستان کے افراد کے اشغال بیان کئے گئے ہیں ۔جزئیات اور تفصیلات سے کام لیا گیا ہے ۔تھکے ماندے اور گرمی کے مارے افراد کو دریا کے قریب اترنے کی وجہ سے جو فرحت حاصل ہوئی اسے کمال چابکدستی سے بیان کیا گیا ہے ۔اہل قریہ کا زیارت کے لئے آنا اور خیموں اور لشکریوں کو دیکھ کر عورتوں کی آپس میں گفتگو اور اظہار رائے خاصہ دلچسپ اور موقع کے مطابق ہے ۔

اچانک داستان کو پھر پیچھے کی طرف پلٹتا ہے اور دورباش کی آواز کے ساتھ حرم کی سواریوں کے اترنے کا سماں بیان کرنے لگتا ہے ۔پردہ کے اہتمام کے بیان کے ساتھ ہی شاعر آئندہ کے واقعات کے متعلق دوبارہ پیشینگوئی کردیتا ہے ۔اس سے یہ فائدہ تو ہوجاتا ہے کہ مجلس قبل از وقت گریہ وبکا کے لئے تیار ہوجاتی ہے مگر وحدت زمان قائم نہ رہنے سے کہانی کی دلکشی ختم ہوجاتی ہے ۔

خیمے لگ گئے اور لوگ نذریں لے کر آنے لگے ۔ حضرت امام کھڑے ہوجاتے ہیں اور نذروں کو چھوتے ہیں ۔یہ قبول نذر کا وہ طریق ہے جو دبیر کے زمانہ میں شاہان اودھ کے

دربار میں رائج تھا ۔ (۱) یہ داستان کی خوبی ہے کیونکہ مقامی ماحول کا رنگ پاکر داستان حقیقی اور مؤثر ہوگئی ہے ۔

شاعر اس کے بعد کے جملہ واقعات کو نظر انداز کرتے ہوئے فوراً دھم محرم پر پہنچ جاتا ہے اور حضرت امام حسین کو تن تنہا لشکر یزید کے مقابلہ پر دکھاتا ہے ۔ اگر کوئی شخص چاہے کہ اسے صرف اس مرثیہ کے مطالعہ سے کربلا کے پورے واقعات کا تصور ہوجائے تو اسے مایوسی ہوگی ۔

حضرت امام حسین کی جنگ کے واقعات کو البتہ بڑی تفصیل سے بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے ان کے مقابلہ پہ ایک بہادر اور دیو ہیکل پہلوان لایا گیا ہے ۔ دونوں کے رجز بیان کئے گئے ہیں جن میں دونوں کے مدارج اور حفظ مراتب کا بڑا خیال رکھا گیا ہے ۔ ساتھ ساتھ جذبات غم کی انگیخت کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا اور اس مقصد کے لئے جابجا حضرت زینب کی بیقراری ناامیدی غم تڑپ اضطراب اور بے چینی کو بڑی چابکدستی سے بیان کیا گیا ہے ۔ ہر وہ شخص جسے بہن کی محبت کا تجربہ ہے دبیر سے اتفاق کریگا ۔

یہاں تک داستان میں ایک نہایت عمدہ ربط تسلسل اور سادگیٔ بیان اور تدریجی انداز چلا آرہا تھا مگر جونہی دو بہادروں کی جنگ کا منظر پیش کرنے کا موقعہ آیا دبیر نے معمولی انداز بیان ترک کرکے رعایت لفظی کے دامن میں پناہ لے لی اور فطری انداز بیان رخصت ہوگیا اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ شاعر نے میدان جنگ کے مناظر کا نظارہ کبھی ظاہری آنکھ سے نہیں کیا ۔ تخیل کی آنکھ بصیرت سے جو کچھ نظر آیا لکھ دیا ۔ جو کمی رہ گئی اسے شکوہٗ الفاظ سے پورا کردیا ۔ مناظر جنگ کا مقابلہ عام واقعات سے کریں تو فرق نمایاں ہوجاتا ہے ۔

اس کے بعد حضرت کی شہادت اور قطعٔ فرق مبارک کے واقعات کو بڑے دردناک الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اور پھر "بین" کے بعد یہ مرثیہ ایک سو نو بند پر ختم کردیا جاتا ہے ۔

اس مرثیہ کو ہم نے بحیثیت ایک مسلسل اور مربوط داستان کے جانچنے کی کوشش کی

(۱) ملاحظہ ہو دی لائف آف این ایسٹرن کنگ از ناٹن (ترجمہ اردو از احمد علی شباب لکھنو مطبوعہ الناظر پریس لکھنئو)

ہے ۔ اور اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ دبیر مسلسل اور مربوط ایپک لکھنے کے خواہش مند نہ تھے ۔ مرثیہ زیر بحث میں اگرچہ انہوں نے زیادہ سے زیادہ واقعات کے بیان کی کوشش کی ہے مگر صرف ایک ہی کردار کو مد نظر رکھا ہے ۔ اس میں بھی بعض نہایت ضروری واقعات نظر انداز کر دیے ہیں جن کے بغیر حضرت امام موصوف کا کردار بھی پورے طور پر نہیں ابھرتا حالانکہ یہی واقعات دوسرے مراثی میں فرداً فرداً بالتفصیل مرقوم ہیں مثلاً آپ کا دشمنوں سے اتمام حجت کے طور پر خطاب کرنا اور مختلف شرائط پیش کرنا ان کے سامنے ان کے اعزہ و اقربا کا ایک ایک کر کے کام آنا شیرخوار معصوم اصغر کا شہید ہوجانا اور آپ کا آہ بھر کر رہ جانا یہ سب واقعات اس مرثیہ میں بیان کیے جاسکتے تھے اور وحدت تاثر پر کوئی اثر نہ پڑتا تھا بلکہ داستان کا ضروری جزو تھے مگر حذف کردیے گئے ۔

دبیر مروجہ روایات کے نظم کرنے میں اس امر کا بھی خیال نہیں رکھتے تھے کہ یہ متضاد ہیں یا ایک روایت کی دوسری روایت نفی کرتی ہے مثلاً " جب داغ بیکسی نہ سکینہ اٹھا سکی " والے مرثیے میں وہ سکینہ بنت حسین کی قید یزید میں وفات کا ذکر کرتے ہیں مگر " روشن کیا جو حق نے چراغ انتقام کا " والے مرثیہ میں (جو مختار کے حال میں ہے) موصوفہ کو زندہ بیان کرتے ہیں :-

تقدیر میں سکینہ نے ماتم جو پایا ہے | چھوٹا سا ایک تعزیہ خانہ بنایا ہے
عباس کا علم سر منبر لگایا ہے | عابد سے روز کہتی ہے غم دل پہ چھایا ہے

بھائی بہن حقوق شہ دیں ادا کریں
تم مرثیہ پدر کا پڑھو ہم بکا کریں

بہلانے اس کو آتی ہیں ہمجولیاں اگر | کہتی ہے اب نہ کھیلوں گی میں تم میں بیٹھ کر
تم سب ہو باپ والی میں دکھیا ہوں بے پدر | ماتم ہے کربلا کے شہیدوں کا مرے گھر

اماں ہماری بیوہ ہوئیں بابا مر گئے
رونے کے دن ہیں کھیلنے کے دن گذر گئے [1]

[1] غیر مطبوعہ ۔ ملکیت مرزا محمد صادق صاحب صادق ۔ ابن مرزا طاہر رفیع ۔

اس امر سے یہاں بحث مقصود نہیں کہ دونوں میں سے کون سی روایت تاریخی لحاظ سے درست ہے ـ کہنا صرف یہ ہے کہ ایک داستان میں دونوں روایات کو کس طرح تطابق دیا جائے ـ

نوٹ۔ اس باب میں "داستان گوئی" یا "داستان سرائی" کی اصطلاحات اُن اصطلاحی معانی میں استعمال ہوئی ہیں۔ جن سے قدیم فنِ داستان گوئی مراد ہے۔ مثال کے طور پر جس کا ذکر مرزا عبدالرؤف صاحب عشرت نے اپنے مضمون "لکھنؤ کی داستان گوئی"[1] میں کیا ہے۔ البتہ یہ امر باعثِ تعجب ہے کہ مرثیہ گو شعراء اس قدیم فن سے بھی کسی حد تک متاثر ہوں۔ ۔ مؤلف ۔

[1] مطبوعہ "نگار" مئی سنہ ۱۹۳۵

باب ششم

دبیر اور واقعات نگاری

واقعہ اور طویل داستان ـ واقعہ اور افسانہ ـ مرثیہ اور افسانہ ـ
بیان واقعات میں زندگی کی جھلک ـ خارجی حالات ـ اتفاقات ـ
اسباب و علل ماحول اور نفسیاتی جائزہ ـ وحدت تاثر ـ رمزیت اور مقصدیت ـ
دبیر کے کلام پر واقعہ نگاری کے لحاظ سے تبصرہ ـ دبیر کی حیرت انگیز قوت مشاہدہ ـ
فضا کی یکرنگی اور تسلسل ـ

دبیر اور واقعہ نگاری

واقعہ کو داستان سے وہی تعلق ہے جو ناول سے افسانہ یا ڈرامہ سے ایک ایکٹ کے کھیل کو ہے ۔ اگر ہر قصہ میں خواہ وہ طویل داستان کی شکل میں ہو یا مختصر افسانہ کی صورت مین فضا ماحول پلاٹ کردار اور نقطہ نظر ضروری عناصر ہین ۔ لیکن واقعہ نگاری مین افسانہ نگاری کی طرح پلاٹ اور کردار کے مقابلہ مین مرکزی خیال اور وحدت تاثر کو زیادہ اہمیت حاصل ہے ۔ مرثیے مین واقعہ کا تعلق داستان کربلا کے کسی ایک کردار سے ہوتا ہے ۔ اس لئے واقعہ نگار زیادہ تفصیلات مین نہین جاتا بلکہ صرف ایک کردار کو اجاگر کرتا ہے جو واقعہ زیر بحث سے متعلق ہے ۔ اس سلسلے مین وہ جزئیات اور تفصیلات کو ایک خاص حد تک استعمال کرتا ہے ۔ البتہ مواد کی ترتیب مین دوسرے اصناف سخن سے زیادہ احتیاط اور فن کاری سے کام لیتا ہے تاکہ مناسب فضا کی تشکیل ہوسکے ۔ انتشار کا خطرہ باقی نہ رہے نیز توازن اور مسلسل ارتقا کی کیفیت شروع سے آخر تک قائم رہے ۔

مرثیہ اور افسانوی ادب | چونکہ مرثیہ بھی افسانہ کی طرح ایک ایسا بیانیہ ہے جو ایک ہی نشست مین پڑھا جاتا ہے اور سامعین پر ایک تاثر طاری کرنے کے لئے تخلیق کیا جاتا ہے ۔ اس لئے اس مین سے ان جزئیات اور تفاصیل کو خارج کردیا جاتا ہے جو شدت تاثر مین مدد نہ ہون (۱) ۔ زندگی بڑے متضاد عناصر کا مجموعہ ہے اور انہین عناصر کی باہمی آمیزش سے واقعات کی تشکیل ہوتی ہے ۔ اس لئے ان کے بیان مین زندگی کا احساس اور جھلک نمایان ہوتے ہین اگر ایسا نہ ہو تو واقعات مصنوعی معلوم ہون گے اور ان مین منطقی ارتقاء کی کمی ہوگی

واقعہ کے بیان مین کردارون کی اہمیت بھی بعض اوقات ضمنی ہوجاتی ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ واقعات کی تشکیل مین بعض اوقات ماحول خارجی حالات اور اتفاقات بھی نمایان حصہ لیتے ہین ۔ اور یہ بھی ضروری نہین کہ کسی واقعہ مین کسی کردار کی شخصیت مجموعی

(۱) افسانہ کی تعریف مین بعینہ یہی الفاظ ایڈگرامین پو نے استعمال کئے ہین ملاحظہ ہو کہانی کا فن ۔ دیوندر اسر ۔ مطبوعہ نقوش ص ۱۹۵ لاہور جون ۱۹۵۶ ع

طور پر زیر بحث ہو کیونکہ ممکن ہے کہ واقعہ زیر بحث اس کی شخصیت کے کسی ایک پہلو کو نمایاں کرتا ہو اور باقی حصہ اجاگر نہ ہوتا ہو۔ ہر قصہ کے وجود کے خارجی یا داخلی اسباب وعلل ہوتے ہیں ۔خارجی اسباب کو ماحول میں تلاش کیا جاتا ہے مگر داخلی کیفیات کی جانچ کے لئے کرداروں کے نفسیاتی جائزہ کی ضرورت ہوتی ہے ۔اس لئے موضوع کے ارتقاء میں تسلسل اور انضباط بے حد ضروری ہے ۔یہاں اس امر کا خطرہ بھی موجود ہے کہ شاعر واقعہ کے کرداروں کی تحت الشعوری گتھیاں سلجھانے کی بجائے کہیں اپنے تحت الشعور کی تلاشی شروع نہ کردے ۔اکثر وبیشتر ایسا ہوتا ہی ہے ۔

واقعات کے بیان میں پلاٹ اور کرداروں کی اہمیت کو کلی طور پر نظرانداز کرنا تو مشکل ہے لیکن یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی حیثیت ثانوی ہے ۔اصل چیز تو وہ بنیادی خیال ہے جو پلاٹ اور کرداروں کی تشکیل کرتا ہے ۔

مرثیہ میں واقعات بیانیہ انداز میں پیش کئے جاتے ہیں ۔اس لئے فضا اور ماحول کی تشکیل اور تعارف کے لئے شاعر کے پاس کافی گنجائش ہوتی ہے اور وہ بالعموم اس سے فائدہ اٹھاتا ہے ۔

وحدت تاثر کے علاوہ واقعات کے بیان میں ایک قسم کی رمزیت اور مقصدیت بھی پائی جاتی ہے ۔مرثیہ گو شعراء کے سامنے واقعات کربلا کے کرداروں کی عظمت کا بیان ان کی مدح و ستائش اور مصائب کے ذکر سے مجلس میں گریہ وبکا پیدا کرنا ہے ۔ اس لئے مرثیہ میں احساس تحیر کی بجائے احساس غم پر زیادہ زور دیا جاتا ہے ۔

جہاں تک واقعہ کے بیان کی طوالت کا تعلق ہے اس کے لئے کوئی حتمی فیصلہ مشکل ہے ایک ہی واقعہ طویل بھی ہوسکتا ہے اور مختصر بھی ۔مگر مجلس کے وقت کی رعایت سے مرثیہ کی طوالت متعین ہے اور ایک ہی نشست میں مرثیہ کو ختم کرنے کی پابندی روایتی طور پر موجود ہے ۔دبیر کے مرثیوں کی بڑی/زیادہ سے زیادہ طوالت دو صد بند کے قریب ہے ۔

البتہ جو مرثیے سوزخوانون کے لئے لکھے گئے ہین وہ چالیس پچاس بند کے اندر اندر ختم ہوجاتے ہین ۔

دبیر کی واقعہ نگاری کی جانچ کے لئے کسی مخصوص مرثیے کی ضرورت نہین ۔کوئی بھی مرثیہ انتخاب کیاجاسکتا ہے چونکہ پچھلا مرثیہ حضرت امام حسین کی شہادت پر ختم ہوا تھا اس لئے موجودہ مقصد کے لئے " جب عابد مضطر کو داغ پدر ملا " والا مرثیہ چنا جاتا ہے۔

اس واقعہ کے بیان مین شاعر کے سامنے ایک واضح مقصد موجود ہے ۔وہ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام اور دوسرے افراد کنبہ کے مصائب بیان کرکے ناظرین کے دلون مین غم اور ہمدردی کے جذبات موجزن کرنا چاہتا ہے ۔شاعر ابتداہی سے ایک خاص فضا کی تخلیق کرتا ہے ۔

جب عابد مضطر کو داغ پدر ملا

موجود درد سر تھا کہ داغ جگر ملا

مطلع ہی ناظرین کے اذہان کو ہموار کرلیتا ہے ۔اس کے بعد سارا واقعہ تیزی سے حرکت کرتا ہوا نظر آتا ہے ۔بیمار ناتوان پیادہ پا بے بس مجبور قیدی عورتین اور بچے حسرت ویاس کی مجسم تصویر بنے دارالخلافہ مین لائے جاتے ہین ۔ان کے ورود کے لئے پہلے سے ایسے وقت کا انتخاب کرلیاجاتا ہے کہ ان کی بے بسی کی کماحقہ تشہیر ہوجائے ۔اس موقعہ پر تاثر کو شدید تر بنانے کے لئے شاعر کمال فنکاری اور چابکدستی سے ہند اور اس کی لونڈیون کو روشناس کراتا ہے ۔اور لٹے پٹے قافلہ کے مصائب کا بیان ان کے (ہند کی لونڈیون) منہ سے کرواتا ہے ۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا اور یہ کام افراد قافلہ سے لیتا تو وہ صبر وتحمل کی شان جو خاندان امامت کا شیوہ ہے نمایان نہ ہوتی ۔یونہی یہ بیان جاری رہتا ہے حتی کہ ہند اپنے خاوند یزید سے قیدیون سے ملاقات کی اجازت طلب کرتی ہے ۔اور اسے یہ اجازت مل جاتی ہے ۔اس موقعہ پر یزید ایک ذہنی کشمکش مین مبتلا ہے وہ اہل بیت نبوت سے ہند کی ہمدردیون سے

آشنا ہے وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اہل بیت اپنی بے کسی کو چھپانے کی کوشش کرین گے ـ اس لئیے اجازت دینے مین وہ کوئی حرج نہین سمجھتا ـ اور پھر اس کے دل مین احتمال پیدا ہوتا ہے کہ شاید وہ یہ راز افشا کردین اور ہند کا شور و غوغا اس کے آرام مین مخل ہو ـ دوسرے الفاظ مین حضرت امام حسین اور ان کے رفقا کا ماتم خود اس کے محل مین نہ شروع ہوجائے ـ لیکن وہ یہ کہ کر اپنے دل کی تسلی کرلیں گے کہ اگر ایسا کرین گے تو خود ذلیل ہون گے اور اجازت دینے مین کوئی حرج نہین سمجھتا ـ

ہند روانہ ہوجاتی ہے ـ اس کے بعد ایک نہایت نازک موقعہ پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت زینب خواہر حضرت امام حسین علیہ السلام و دختر حضرت علی کرم اللہ وجہ و حضرت فاطمہ فاطمۃ الزہرا اس حالت مین ہند کے سامنے آنے مین حیا محسوس کرتی ہین ـ یہ اضطراب اور ذہنی کشمکش خود انہین کی زبان سے ادا کیا گیا ہے اور جذبات نگاری کی اعلی مثال ہے ـ

ہند قید خانہ کے دروازہ پر پہنچ جاتی ہے ـ اس موقعہ پر فضہ کنیز حضرت زینب اور ہند کی گفتگو سننے اور پڑھنے کے قابل ہے ـ فضہ وفاداری کے جذبات سے معمور ہے اور اپنی مالکہ کی شناخت ظاہر نہین کرنا چاہتی اور ہر بات اشارون اور کنایون مین ادا کرتی ہے ـ اور ساتھ ہی دنیا کی بے ثباتی کی طرف اشارہ کرکے انقلابات زمانہ کا تذکرہ کرتی ہے ـ

ہند اندر داخل ہوجاتی ہے اور اشیائے خورد نی بچون کے سامنے رکھتی ہے مگر بچے کسی چیز کو ہاتھ نہین لگاتے ـ وہ سمجھتی ہے کہ شاید ہاتھ بند ہے ہوئے ہونے کی وجہ سے مجبور ہین اور انہین کھلوانے کے لئے کہتی ہے ـ بچے کمال معصومی سے اپنی رسیان کھلوانے سے اس ڈر کے مارے شامل ہین کہ پھر انہین دوبارہ پہلے سے بھی زیادہ کس کر بند ہوائے گا ـ یہ خیال کتنا قدرتی اور تاثر انگیز ہے ـ

اس کے بعد ہند اور حضرت زینب کا مکالمہ شروع ہوجاتا ہے جو خطابت آمیز اور پرجوش

ہونے کے باوجود حیرت انگیز طور پر اثر افروز ہے ـ اس کے بعد کے بند "بین" کے ہیں جو مجلس میں عزا اور آہ وبکا کی غرض سے شامل کئے جاتے ہیں ـ

حقیقت یہ ہے کہ واقعات کے بیان میں دبیر حیرت انگیز قوت مشاہدہ اور انسانی نفسیات سے واقفیت کا ثبوت دیتے ہیں ـ اس مرثیہ میں شروع سے لے کر آخر تک ایک ہی فضا پائی جاتی ہے ـ بیان میں تسلسل قابل داد ہے ـ ارتقائے خیال اس قدر قدرتی اور منطقی ہے کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے ـ

تباہ حال قافلے کو دیکھ کر کنیزوں کا اپنی مالکہ کو اطلاع دینا اور پھر خالص نسوانی زبان میں اپنے جذبات کا ابلاغ کرنا بالکل حقیقت کے مطابق ہے ـ اس طرح جو شاعر خود کہنا چاہتا تھا وہ ان غیر واضح کرداروں کے منہ سے کہلوادیا ـ یہی واقعہ نگاری کا کمال ہے ـ

یہ امر واقع ہے کہ واقعہ نگاری دبیر کا مخصوص فن ہے ـ اس کی انسانی نفسیات اور ذہنی کیفیات سے واقفیت اور اسلوب بیان کی خوبی اسے اس صنف ادب میں اپنے معصر شعراء سے ممتاز کردیتی ہے ـ

بعض مرثیوں میں دبیر ایک سے زیادہ واقعات بھی بیان کرتے ہیں ـ وہ دراصل یا تو ایک ہی واقعہ کی مختلف کڑیاں ہوتی ہیں یا دو متصل واقعات ـ لیکن ان میں وحدت تاثر نمایاں ہوتی ہے ـ دبیر کی واقعہ نگاری کو نمایاں کرنے کے لئے دو اور واقعات منتخب کئے گئے ہیں ـ پہلا واقعہ حضرت مسلم کے صاحبزادوں کی شہادت کا ہے ـ اور دوسرا حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کے حالات مابعد شہادت امام حسین میں ہے ـ دونوں مرثیوں کے متعلقہ بند بھی ضمیمہ میں لگادیئے گئے ہیں اور ملاحظہ کئے جاسکتے ہیں ـ دونوں واقعات کا نمایاں مقصد مصائب اہل بیت کو نمایاں کرکے جذبۂ رحم اور حزن و ملال کی تحریک ہے اور دونوں اس لحاظ سے کامیاب ہیں ـ اس قسم کے سینکڑوں نمونے دبیر کے کلام میں تلاش کئے جاسکتے ہیں ـ (زیر بحث مرثیے ضمیمہ میں ملاحظہ ہوں) ـ

باب ہشتم

دبیر اور مناظر فطرت کی تصوری

مناظر فطرت کی تصویر کشی کی مختلف صورتیں

اس میں دبیر کی بیچارگی

اور اسباب

دبیر اور مناظر فطرت کی تصویر کشی

مرثیہ گو شعراء کو بجا طور پر یہ فخر حاصل ہے کہ انھون نے اردو شاعری مین مناظر فطرت کی تصویر کشی کو رائج کیا اور اس طرح اردو کے سرمایہ مین اضافہ کا موجب ہوئے — یہ صوری تین حالتون سے خالی نہین ہوتی :

مناظر فطرت کی تصویرکشی کی مختلف صورتین

۱ — فرض کرین کہ ایک شہری آدمی اچانک کسی سرسبز پہاڑی علاقے مین جا نکلتا ہے اور اس کی نظر کوہ قامت اور لہلہاتے ہوئے اشجار سے لدی ہوئی سربفلک چوٹیون سبز مخملین فرش سے آراستہ وادیون بل کھاتی ہوئی ندیون ابلتے ہوئے چشمون چہچہاتے ہوئے پرندون لہراتی ہوئی بیلون کھیلتے اور کلیلین کرتے ہوئے ہرنون تیرتی ہوئی مرغابیون اور ناچتے ہوئے مورون پر پڑتی ہے تو اس کی آنکھین کھلی کی کھلی رہ جاتی ہین — اور وہ محو حیرت ہوجاتا ہے — اس حیرت کے عالم کو جب وہ بیان کرنے کی کوشش کرے گا تو ظاہر ہے کہ تصویر مکمل نہین ہوگی اس کے صرف چند پہلو نمایان ہون گے جو اس کی حیرت افزائی کا موجب ہوئے تھے — باقی مواد پس منظر مین رہ جائے گا — مگر جس قدر نقوش بھی واضح ہون گے وہ حقیقی اور قدرتی ہون گے — منظر کی عظمت بالخصوص نمایان ہوگی جو مصور کے تحیر کا باعث ہوئی تھی — کیا ایسے حیرت انگیز مناظر دبیر کے مرثیون مین موجود ہین ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ نہین — مذکورہ نہ ہین اور نہ ہی اس قدر توقع جائز ہے — کیونکہ دبیر کی شاعری کا تعلق جس عہد سے ہے — اس مین اس قسم کے تجربات کی گنجائش نہین — انتزاع سلطنت تک دبیر کبھی لکھنؤ سے باہر نہین گئے — انقلاب کے بعد وہ کلکتہ اور عظیم آباد تشریف لے گئے مگر ایک تو اس سانحہ کے بعد کے کہے ہوئے ان کے صرف پانچ مرثیے دستیاب ہوتے ہین — دوسرے یہ سفر جن حالات مین کئے گئے وہ شعر و شاعری کے لئے زیادہ مفید نہ تھے بلکہ سفر کلکتہ کے وقت تو وہ محروم بصارت ہوچکے تھے (۱)

(۱) تفصیلات کے لئے دیکھئے سوانح کا حصہ باب دبیر کے آخری عمر کے واقعات —

ایسے حالات مین کسی تصویر کشی کی توقع نامناسب ہے ۔

۲ ۔ مناظر فطرت کی تصویر کشی کی دوسری صورت یہ ہے کہ فطرت شاعر کی روح مین حلول کر گئی ہو اور وہ خود ان مناظر کا ایک حصہ ہوکر رہ گیا ہو ۔ اردو شاعری مین اس قسم کی شعری تخلیقات کا وجود دبیر کے زمانہ مین تو بڑی بات ہے اب تک بھی نظر نہین آتا ۔

۳ ۔ تیسری صورت یہ ہے کہ انسانی جذبات کی تصویر نیچر کے چوکھٹے مین پیش کی جائے مثلاً غم کے بیان کی صورت مین غمگین اور اداس رات کا تصور پیش کیا جائے اور خوشی کے جذبات کے ساتھ موسم بہار اور گل بلبل اور لالہ و نرگس کی منظر کشی کی جائے ۔ گویا حالات اور جذبات کے فریم مین نیچر کی تصویر پیش کی جائے ۔ مرثیہ گو شعراء بالخصوص میر انیس کے کلام مین اسی قسم کے مناظر پیش کیے گئے ہین جن سے کہ ایک خاص قسم کا تاثر مقصود ہوتا ہے ۔ جہان تک مرزا دبیر کا تعلق ہے ان کے کلام مین ایسے مناظر کی بھی کمی ہے ۔

جیساکہ پہلے بیان کیاجاچکا ہے مرزا دبیر اپنی وضعداری کے پیش نظر کبھی لکھنؤ سے باہر نہین گئے جو ایک آدھ سفر انھون نے کیا وہ بھی بالکل آخری عمر مین اور انتزاع سلطنت سلاطین اودھ کے بعد کیا گیا ۔ چنانچہ اس امر مین کوئی حیرت کا مقام نہین کہ باوجود کوشش کے وہ منظر کشی مین کامیاب نہین ہوئے ۔ وہ جو کچھ دیکھتے ہین محض تخیل کی آنکھ سے ہوتاہے اور جو کمی رہ جاتی ہے اسے شوکت الفاظ سے پورا کردیتے ہین ۔ ان کے پیش کردہ مناظر مین نہ تو کوئی جان ہوتی ہے اور نہ ہی تصویر کا کوئی پہلو ابھرا ہوا دکھائی دیتا ہے ۔ ہان ایک پر شکوہ بہاریہ تشبیب ضرور پیدا ہوجاتی ہے (ایسے مرثیہ کی اصطلاح مین چہرہ کیاجاتا ہے) جو بالعموم غم کے جذبات ابھارنے کا کام دیتی ہے جن جن مقامات پر کچھ نقوش نسبتاً زیادہ واضح معلوم ہوئے ان کا انتخاب ضمیمہ مین شامل کردیا گیا ہے جو ملاحظہ کیا جاسکتا ہے ۔ اپنی طرف سے کوشش کی گئی ہے کہ بہتر سے بہتر انتخاب پیش کیاجائے ۔

ہمارے اس خیال کی تائید چوہدری نظیرالحسن صاحب فوق مصنف المیزان نے بھی ان الفاظ مین کی ہے :۔

" ہم نے بیان کیا ہے کہ مرزا صاحب کے کلام میں ہر رنگ کا جلوہ موجود ہے ۔ چنانچہ ہر عنوان کے ماتحت ہم نے ان کا صاف اور شستہ کلام انتخاب کیا ہے جیساکہ میر انیس کا رنگ ہے لیکن صبح وغیرہ مناظر قدرت کے بیان میں انہوں نے اپنے طرز خاص کو چھوڑ کر سلاست اور روانی پر توجہ نہیں کی ۔ اسلئے ہم نے ان کے طرز خاص کا کلام ہی منتخب کرلیا ہے تاکہ کوئی عنوان خالی نہ رہے ۔

یہاں پر اس قدر بیان کردینا ضروری ہے کہ مناظر قدرت کا سماں دکھانے میں جیسے میر انیس کے کلام میں صاف شستہ اور بے ساختہ اشعار پائے جاتے ہیں مرزا دبیر کے ہاں نہیں ملتے اس لئے کہ سکتے ہیں کہ مناظر قدرت کی تصویر کھینچنے میں میر انیس لاجواب شاعر ہیں " (۱)

---

(۱) حاشیہ المیزان ص ۳۲۲ نظیرالحسن فوق مطبع فیض عام علی گڑھ ۔

باب ہشتم

دبیر بحیثیت کردار نگار

داستان مین کردار نگاری کی اہمیت ۔ کردار کی تعمیر مین توارث اور ماحول کا اثر ۔
معاشرتی خصوصیات ۔ کردار نگاری کے بعض اصول مدح اور کردار نگاری ۔ کردارون
کی تقسیم ۔ نمونے یعنی سپاٹ کردار ۔ تمثیلی اور متحرک ۔ حضرت امام حسین کا
کردار (فوق البشر) حضرت کے کردار مین شفقت ۔ حضرت کی بعض جسمانی کیفیات
حضرت کے کردار کا تشخص اور تعیین ۔ دیگر متحرک کردار ۔ بقیہ کردار

دبیر بحیثیت کردار نگار

کردارنگاری کی اہمیت | داستان مین کردار ہی مصنف کے زاویۂ نظر کے ابلاغ و اظہار اور ترسیل خیال کا واحد ذریعہ ہے ۔ داخلی شاعری مین شاعر کا خطاب بنیادی طور پر اپنی ذات سے ہوتا ہے ۔ اس لئے وہ اپنے تخیل کی بلند پروازون اور جذبات کے جوش کو بلاواسطہ نمایان کرلیتا ہے ۔ لیکن داستان اور تمثیل مین یہ کام کردارون سے لیاجاتا ہے ۔ کردار ہی احساسات کو الفاظ کے جامے مین ملبوس کرتے ہین اور ناظرین و شعراء کے درمیان واسطہ کا کام دیتے ہین ۔

مرثیہ مین کردار نگاری کی اہمیت اس لحاظ بھی بڑھ جاتی ہے کہ مرثیہ گو ایک طویل داستان کی مختلف کڑیان (اگرچہ غیر مربوط طور پر) مختلف اوقات مین بیان کرتا ہے ۔ اور اپنے کردارون کے مختلف پہلوؤن کو مختلف مرثیون مین اجاگر کرتا ہے مگر طبعی خصوصیات فطری رجحانات اور جبلی میلانات ہرجگہ یکسان رہتے ہین ۔

کردار نگاری کے بعض اصول | علمائے انتقاد نے کردار نگاری کے متعلق بعض ہدایات دی ہین ۔ اس سے پیشتر ہم جان بیوکن کے حوالہ سے یہ لکھ چکے ہین کہ داستان نگار کو حقیقی اور چلتے پھرتے انسانون کی طرح زندہ کردار متعارف کرانے چاہئین ۔ نیز ان کے اچھے یا برے اطوار کی وضاحت کردینی چاہئے ۔ لوک کہانیون کی صفات بیان کرتے ہوئے موصوف نے اپنی مذکورہ بالا رائے کی تفصیل یون پیش کی ہے ۔

"لوک کہانیون کی تخلیق کرنے والے کردارون کے متعلق فیصلہ دیتے ہوئے ہچکچاتے نہ تھے ۔ ایک آدمی بہادر تھا یا بزدل، رحم دل تھا یا ظالم، عاقل تھا یا احمق، وہ بلا خوف اس کا اظہار کردیا کرتے تھے ۔ زمانۂ حال مین داستان گوئی کے متعلق ایک ایسا مدرسۂ فکر ہے جو کسی کردار یا چیز کے متعلق اخلاقی فیصلہ دینے پر اعتراض کرتا ہے ... مجھے (اس) غیر جانبداری

کے خلاف کوئی اعتراض نہین ــ اگرچہ مین خیال کرتا ہون ــ کہ اس کی بنیاد اخلاقی تساہل اور ذہنی پھوہڑپن قرار دی جاسکتی ہے ــ فلسفیانہ لحاظ سے ممکن ہے کہ اس کی حمایت کی جاسکے لیکن میری رائے مین عاصی انسانون کی بھی کچھ اخلاقی اقدار ہوتی ہین اور وہ ان پر سختی سے قائم رہتے ہین ــ لہٰذا خالق کے سوا اور کوئی شخص اس قسم کی بے تعلقی کا اظہار نہین کرسکتا ــ اور ایک داستان نگار کے لئے تو یہ بے تعلقی کسی صورت مین بھی باعث خوبی نہین ــ کیونکہ وہ اپنی کہانی محض کردارون کے شدید تضاد و تقابل کی بنا پر ہی کامیاب بنا سکتا ہے ــ زمانہ حال کے چند اخلاقی بے اصولون نے (جو بقول ڈاکٹر ڈی ایچ لارنس(١) گنہ گاری سے تقدیس کے راستہ پر گامزن ہین) لوک کہانیون کے مصنفین کو ضرور پریشان کردیا ہوتا ــ جس طرح وہ آج عوام کو کر رہے ہین ــ ملکہ وکٹوریہ کے عہد کے عظیم ناول نگارون کا ذہن بھی اخلاقی اقدار کے متعلق اسی طرح صاف ہے ــ وہ جانتے ہین کہ ہم سب مین نیکی اور بدی کا امتزاج موجود ہے ــ نیز کچھ مرد اور عورتین نیکی کی طرف کرلیتے ہین اور کچھ بدی کی طرف اس لئے وہ اس کے اظہار مین پس و پیش نہین کرتے ــ

کردار نگاری کے متعلق ایک آخری بات یہ ہے کہ لوک کہانیان کردارون کی عظمت کے بیان سے خائف نہین کیونکہ ان کے مصنف جانتے ہین کہ بنی نوع انسان ایک سانچے مین ڈھلے ہوئے اوسط انسانون کا مجموعہ نہین ــ بلکہ ہر انسان مین کسی حد تک کچھ نہ کچھ شعریت موجود ہے ــ جو کسی وقت پھل پھول لاتی ہے اور زمین سے اڑ کر ستارون سے جا ہم آغوش ہوتی ہے ــ نیز انہین انسانی فطرت پر یقین ہے کہ جب معراج کمال کو پہنچتی ہے تو دیوتاؤن سے مشابہ ہوجاتی ہے ــ ان کے ہیرو عظیم طاقت کے مالک ہین اور ان کے راستہ مین کوئی دیو شیطان یا بدکن سوتیلی مان رکاوٹ پیدا نہین کرسکتی وہ ایک اخلاقی بے نیازی کے ساتھ جادۂ مستقیم پر روان رہتے ہین اور جب تک ان کا مقصد حاصل نہ ہوجائے انہین کوئی فنا نہین کرسکتا " (١)

---

(١)

جان بیوکن کے نظریات سے اختلاف کی گنجائش بہت کم ہے ۔فی الواقع بنی نوع انسان
کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ۔ایک طرف وہ لوگ جو فطری طور پر نیکی کی طرف
مائل ہیں اور دوسری طرف وہ جو بدی کی طرف ۔ لیکن کیا انسانی عادات و اطوار خصائل
و کردار بلکہ عقاید اور نظریات میں بھی تبدیلی ہمارے روزمرہ کے مشاہدے میں نہیں آتی ؟

بقیہ حاشیہ از صفحہ گذشتہ

" The makers of folk tales were not afraid to pass judgements upon their characters. A man was brave or he was not; he was kind or he was cruel; he was foolish or he was wise. There is a school of fiction today which objects to passing moral judgements on anything or anybody ...... I have nothing to say against this impartiality, though I think it may as easily have its roots in moral apathy and intellectual slovenliness as in devine wisdom. Philosophically, it may have its justification, but I suggest that, since fallible man must have their standards and stick to them, such detachment to them, is rather for their Maker than for themselves. In any case it is not virtue in a novelist, who can get only drama by strong contrasts. The moral molluscs of certain fiction of today, who spend their time, if I may borrow a phrase of the late Dr. D.H. Lawrence, in sinning their way to sanctity, would have puzzled the makers of folk tales, as they puzzle any ordinary man. The great Victorion novelists have the same clearness of moral out-line. They realise that all of us are a compost of good and bad but that the orientation of certain men and women is as clearly towards evil as that of others towards good, and they do not scruple to say so..

One last word on the question of character. The folk tale is not afraid of greatness. It believes that humanity is not a drab collection of mediocrities, but that nearly every body has some poetry in him, and that it can flower at times into some-thing which leaves the earth altogether and strikes the stars. Because it believed in human nature, it believed that human nature could transcend itself and become god-like. Its heroes are so full of

Contd..... Next Sheet.

کیا توارث اور ماحول دونون ہی انسان کی سیرت کی تشکیل مین برابر کے حصہ دار نہین ؟
کیا کیفیات جذبی Moods مزاج کا ایک جزو بن کر تمام عمر انسان پر مسلط نہین رہتین ؟
کیا انسانی زندگی مین بے شمار حادثات عواطف خیالات اور خواہشات وغیرہ کردار کی تشکیل
مین ممد نہین ہوتے ؟ یہ سب کچھ ہے بلکہ جذبات کے زیر اثر بعض دفعہ ایسے ناممکن
الوقوع امور ظہور مین آتے ہین جو عام حالات مین ناممکن تھے ۔

---

so full of .... vitality that no gaint or dragon or wicked stepmother manages to hamper them in the long run. They go their appointed course with a devine carelessness. They are immortal until they have fullfilled their purpose.

John Buchan, Novel and the
Fairy Tales, P 30,31
More Modern Essays,
Longman green & Co. London, 1949.

.-.

P-229.

We may devide characters into flat and round. Flat characters were called humours and are sometimes called types and some-times caricatures. In their purest form they are constructed round a single idea or quality; when there is more than one factor in them, we get the beginning of the curve towards the round. The really flat characters can be expressed in one sentence such as, " I never will desert ....

Next sheet,

لذت یا الم کا احساس ماحول اور خوصی حالات انسان مین داخلی تغیرات اور ظاہری علامات کی پیدائش کا باعث ہوتے ہین ـ اور جذبہ کی شدت غیر معمولی تو عیپدا کرکے بعض اوقات فعالیت کو تیز تر اور بعض اوقات بالکل مسدود کردیتی ہے ـ کیفیات جذبی (Moods) کی مستقل صورت کا نام عاطفہ Sentiment ہے جو جذبات کے پائدار نظام کا اصطلاحی نام ہے ـ اور پھر جذبات کے نظام سے بلند وبالا خود عواطف کا نظام ہے جو رعایت ذات کسے عاطفہ (Self regard sentiment) کے ماتحت کام کرتا ہے ـ

اس کا دوسرا نام کردار یا سیرت Character ہے ـ اور زندگی کے حادثات و واقعات اس کی تعمیر و تخریب مین حصہ لیتے رہتے ہین ـ اس لئے کرداروں کی یہ سیدھی سادی تقسیم جو جان بیوکن نے کی ہے نامکمل ہے ـ اس مین ان لوگون کے لئے رعایت نہین جو تہیہ کرکے بدی کو ترک کردیتے ہین یا جنہین باد مخالف کے تھپیڑے گناہ کی وادیون مین لے جاتے ہین ـ اور پھر گناہ کی لذت انہین واپس آنے سے باز رکھتی ہے ـ اس لئے فارسٹر کی تقسیم اس سے بہتر اور جامع ہے جو یہ ہے :

کردارون کی تقسیم

" ہم کردارون کو سپاٹ Flat اور محیط Round دو حصون مین تقسیم کر سکتے ہین ـ سترھوین صدی مین سپاٹ کردارون کو ضحک Humour کہا جاتا تھا ـ اب انہین نمونے Types اور خاکے Caricatures کہا جاتا ہے ـ انہین کسی ایک صفت یا نقطۂ نظر کو نمایان کرنے کے لئے تخلیق کیا جاتا ہے ـ جب ان مین ایک سے زیادہ صفات پیدا ہونے لگین تو ان مین محیط کردارون کے ابتدائی نقوش پیدا ہونے لگتے ہین ـ فی الحقیقت سپاٹ کردار ایک فقرہ مین واضح کئے جاسکتے ہین ـ مثلاً " بیگم میکابر نے کہا کہ مین مسٹر میکابر

Mr. Mecawber," she says, she won't desert Mr. Mecawber; she does not, and there she is."

(Forster, E.M., Aspects of Novel, Page 65, London 1949).

کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑوں گی اور فی الواقعہ وہ اس پر عمل کرتی ہے تو بس وہ فلیٹ کردار ہے "

لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ایک داستان میں صرف محیط کردار ہی ضروری ہوتے ہیں اور سپاٹ کردار غیر ضروری اور بے فائدہ ۔ ایسا ہرگز نہیں بلکہ سپاٹ کردار بھی داستان کا تانا بانا بنانے کے لئے اتنے ہی اہم ہیں جتنے کہ محیط ۔ اگرچہ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اگر داستان کے جملہ کردار نمونے ہی ہوں یا انہیں ضرورت سے زیادہ اہمیت دی جائے تو داستان کی دلکشی کے لئے مضر ثابت ہوتے ہیں ۔ فارسٹر نے اس حقیقت کو اس طرح بیان کیا ہے :-

جو صرف مزاحیہ کہانیوں میں ہی موزوں معلوم ہوتے ہیں

" سپاٹ کردار محیط کرداروں کے مقابلہ میں کوئی قابل فخر تخلیق نہیں ہے کیونکہ سنجیدہ یا الیہ ماحول میں ایک سپاٹ کردار اکثر طبیعت کو اکتا دیتا ہے ۔ کیونکہ وہ جب بھی ظاہر ہوتا ہے تو "بدلہ بدلہ" یا "میرا دل بنی نوع انسان کے لئے تڑپتا ہے" یا اسی قسم کے کسی اور اصول کا اعلان کرتا ہوا سنائی دیتا ہے اور اس طرح ہماری کوفت کا باعث ہوتا ہے " (1)

اس طویل بحث کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ کرداروں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ایک نمونے Types جنہیں سپاٹ Flat- اور ضحک Caricature بھی کہا جاتا ہے دوسرے محیط Round جنہیں تمثیلی Dramatic اور متحرک Dynamic

---

...... that flat people are not in themselves as big achievements as round ones and also that they are best when they are comic. A serious or tragic character is apt to be a bore. Each time he entres crying "Revenge", or "my heart is blowing for humanity" or whatever his formula is, our hearts sink.

Ibid page 70

بھی کہتے ہین ۔ سپاٹ Flat کردارون کو پھر دو حصون مین تقسیم کیا جاسکتا ہے ۔ ایک
وہ جو مجسم شر ہین اور دوسرے وہ جو مجسم خیر ۔ اوسط قسم کے کردارون کا اس کوچہ مین گذر
مشکل ہے ۔

سپاٹ کردار نہ صرف یہ کہ وہ ایک خاص معاشرت کے نمونے ہوتے ہین بلکہ سنگ بستہ ہونے
کی وجہ معاشرہ یا معاشرہ کے کسی طبقہ یا کسی قدر سے برسرپیکار بھی ہوتے ہین ۔

اب ان اصولون کی روشنی مین دبیر کی کردار نگاری کا جائزہ لیا جاتا ہے :۔

اصطلاحی مرثیہ اور دیگر اصناف سخن کا مقابلہ کرتے ہوئے ہم نے یہ دعوی کیا تھا کہ
مرثیہ مین کردار نگاری کی کوششون کا وجود بھی پایا جاتا ہے ۔ مدح / رجز واقعات و حقائق
اور مکالمات وغیرہ کی روشنی مین اکثر کردارون کو واضح اور نمایان طور پر دیکھا جاسکتا ہے ۔

مدح اور کردار نگاری } ہمارے ملک کی مداحی کا مزاج کچھ ایسا ہے کہ اس مین اصلیت اور
حقیقت کا تلاش کرنا بالعموم کوہ کندن اور کاہ برآوردن کے مصداق ہے ۔ بقول ڈاکٹر محمد احسن
فاروقی "مداحی کا عام طریقہ یہ ہے کہ مرثیون مین امام اور ان کے انصار کو اس طرح پیش کیا
جائے کہ ہر حضرت کی مدح دوسرے پر بآسانی چسپان ہوسکتی ہے ۔ عام انسانون مین انفرادی
فرق ہوتے ہین اور جو شاعر انسان کی حقیقت کو اپنا موضوع بنائے اسے ہر انسان کی جس کا وہ
ذکر کرے ۔ انفرادیت پر زور دینے کے معنی یہ ہوئے کہ دوسرے ممدوحون کو اس صفت مین کم
تر دکھایا جائے ۔ لہذا کسی شخص کی مدح سے اس کو سوائے تمام خوبیون کا حامل بنا دیا
دینے کے چارہ ہی نہ تھا ۔ اور ان ممدوحون کی مدح مین جو مذہبی پیشوا ہون مذہبی عقیدہ
اس کا مقتضی تھا کہ جتنی مبالغہ آمیز تعریف ہوسکے کی جائے (۱) "

اس مین کوئی شبہہ نہین کہ قصیدہ نگاری نے فارسی اور پھر اردو شاعری پر بڑے ناگوار
اثرات ڈالے ہین ۔ قصیدہ بہت عرصہ دربارون سے متعلق رہا ۔ جہان بادشاہون کی مدح و

---

(۱) مرثیہ نگاری اور انیس ۔ ڈاکٹر محمد احسن فاروقی ص ۲۲ ۔

توصیف مین زمین آسمان کے قلابے ملائے گئے اور دنیا کی ہر ممکن خوبی سے ان کی ذات کو متصف گردانا گیا لیکن مرثیہ گو شعراء ارباب اہل بیت اور شہدائے عظام کی مدح مین جو کچھ بیان کرتے ہین اسے بوجہ مذہبی عقیدت درست بھی تسلیم کرتے ہین ۔ اس لئے ان کی مدح سرائی مبالغہ آرائی اور غلو کی حدود مین داخل نہین ہوتی چونکہ وہ ان مین کوئی عیب ممکن نہین سمجھتے بلکہ انہین معصوم گردانتے ہین اس لئے تصویر کے دوسرے رخ کا سوال ہی پیدا نہین ہوتا ۔

کردار حضرت امام حسین (فوق البشر) | ہم سب سے پہلے اس المیہ کے سب سے بڑے کردار یعنی حضرت امام حسین علیہ السلام کی شخصیت سے بحث کرتے ہین ۔ فلسفۂ اخلاق کے ماہرین نے اخلاق کے چار بڑے فضائل (حکمت شجاعت عفت اور عدالت) قرار دیے ہین (۱) اور لکھا ہے کہ کوئی شخص اسوقت تک فخرو مباہات کا مستحق نہین جب تک کہ یہ چارون یا ان چارون مین سے ایک صفت اس مین موجود نہ ہو (۲) ۔ دبیر ان تمام صفات کو حضرت امام حسین علیہ السلام کی ذات مین مجتمع سمجھتے ہین ۔ چنانچہ کہا ہے ؎

صابر سخی حلیم امام ایسا چاہئے　　مسند نشین خیرانام ایسا چاہئے

نیز ؎

سرتاج عرش زیب دہ کرسی بلند　　سرکار حق کے کارگذار اور کارپسند

عاشق مطیع فدیہ مجاہد نیازمند　　راضی رضا پہ شہادت بلا پسند

بندے مین شان رب صمد جل شانہ　　ہر وقت عاجزون کی مدد جل شانہ

بے عیب حق کی ذات ہے یا ان کی ذات ہے　　حکم ان کا اور کلام مجید ایک بات ہے

---

(۱) محقق طوسی اخلاق ناصری ص ۸۸ مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۵۰ ع

(۲) ایضاً (هیچ کس مستحق و مستعد مباہات و مفاخرت نشود الا یکے ازین چہاریا بہر چہار)

یہ وہی صفات ہیں جو ڈاکٹر اقبال علیہ الرحمۃ مرد مومن میں بیان کرتے ہیں :

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن — گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت — یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

ہمسایہ جبریل امین بندۂ خاکی — ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشان

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن — قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے — دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم — دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

فطرت کا سرود ازلی اس کے شب و روز
آہنگ میں یکتا صفت سورہ رحمان

اقبال اور دبیر دونوں ان خوبیوں کا ایک شخصیت میں جمع ہونا نہ صرف ممکن سمجھتے ہیں بلکہ تکمیل شخصیت کے لئے ناگزیر جانتے ہیں ۔

اقبال مسلمان کی زندگی کو " نہایت اندیشہ و کمال جنون " کا نام دیتے ہیں ۔ نہایت اندیشہ اور کمال جنون کی ترکیب سے جو مرکب تیار ہوتا ہے وہ " عشق الہی " ہے ۔ چنانچہ اقبال علیہ الرحمۃ (۱) حضرت امام حسین علیہ السلام کے کردار کی بنیادی صفت عشق ہی قرار دیتے ہیں ۔

صدق خلیل بھی ہے عشق صبر حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدروحنین بھی ہے عشق

دبیر بھی اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ جن صفات کو وہ حضرت امام حسین علیہ السلام کی ذات بابرکات میں جمع کرنا چاہتے ہیں ان کا اجتماع عشق الہی کے بغیر ممکن نہیں ۔ کیونکہ عشق ہی ایک ایسا بنا/ جذبہ ہے جو ناممکن الوقوع کو ممکن بنا دیتا ہے ۔ چنانچہ کہا ہے :

---

(۱) طبع مسلم از محبت قاہر است — مسلم ازعاشق نباشد کافر است
در رضائش مرضی حق گم شود — این سخن کے باور مردم شود (اقبال)

یون تو سبھون کو عشق خدا ہے بقدر حال　　ہر امتحان عشق کی برداشت ہے محال
وہ کیا ہے یاس و حسرت و رنج و غم و ملال　　شمع مراد گل گل امید پائمال

یہ بار قابل شہ عالی تبار تھا
ہوگا نہ ہے نہ ایسا کوئی بردبار تھا

یہان یہ فراموش نہ ہو کہ دبیر کے ہیرو امام حسین ہین اور اقبال کا ہیرو " مرد مومن " ہے — لیکن پھر اقبال حضرت امام حسین علیہ السلام کو " مرد مومن " کا سب سے اعلی نمونہ قرار دیتے ہین — جیساکہ ان کے کلام (بالخصوص مثنوی رموز بیخودی) سے ظاہر ہے — اس لئے انسانی عظمت کے لئے جس قدر صفات کا ہونا ضروری ہے وہ (دبیر اور اقبال) ان مین مجتمع سمجھتے ہین —

اب تک حضرت امام حسین علیہ السلام کو بطور فوق البشر روشناس کرایا گیا ہے لیکن فوق البشر بھی انسانی جذبات و احسات سے متصف عاری نہین ہوتا اسلئے دبیر انہین عام انسانی سطح پر دنیاد ارانہ احساسات و جذبات سے بھی پیش کرتے ہین — مثلاً حضرت کی کبھی یہ خواہش نہ تھی کہ شوق شہادت مین اپنے متعلقین پر تباہی نازل کی جائے وہ آخر وقت تک جنگ سے پہلو تہی کرتے رہے دیکھئے :

پانی نہ ملا اس کا نہ شکوہ نہ گلا ہے　　تم ظلم و ستم کرتے ہو یہان لب پہ دعا ہے
هفتم سے ہر اک سانحہ پر صبر کیا ہے　　پر اب بھی برائی سے جو باز آؤ تو بھلا ہے

مظلوم کا بیکس کا ستانا نہین اچھا
سید کا مسافر کا رلانا نہین اچھا

خیر اس پہ بھی راضی ہون امام اپنا نہ سمجھو　　پر چاہتا ہون یہ کہ مزاحم نہ مرے ہو
لے کر حرم احمد مختار کو یارو　　مین یان سے چلا جاؤن کسی اور طرف کو

بستی مین کسی سے نہ ملاقات کرونٗ گا
جنگل مین بسر اپنی مین اوقات کرونٗ گا (۱)

---

(۱) ج ا ص ۱۱٦ نولکشور ۱۹۳۷ ع

ظاہر ہے کہ شرائط معقول تھین اور حضرت موصوف بہرحال اور بلا کسی وجہ اپنی شہادت اور اپنے خاندان کی تباہی پر مصر نہ تھے ۔ اگر حضور کی شرائط جو طاقت کی بجائے حقائق پر مبنی تھین تسلیم کرلی جاتین تو یہ المیہ ٹل سکتا تھا مگر فریق مخالف کا جواب سنئے ؎

اعدا نے کہا اب ہوئے کیا عاجز و ناچار | کیونکر نہ ہو عاجز کہ نہ لشکر نہ علمدار
اب بیعت حاکم کا بھی فرمائیے اقرار | لو اب بھی امان دیتے ہین اے سید ابرار

لڑنا سپہ شام سے دشوار ہے تم کو

اب بیعت حاکم بھی سزاوار ہے تم کو (۱)

بلکہ وقت آخر تک حضور کا عذر یہی تھا ۔ دیکھئے

اس طرح رقم کرتے ہین اب راوی اخبار | خنجر لئے ناگاہ بڑھا شمر ستمگار
وہ حلق جو تھا بوسہ گہ احمد مختار | وہ سینہ جسے چوستے تھے حیدر کرار

ان دونون کا یہ شمر نے آداب کیا تھا

تیغ ایک پہ اور ایک پہ زانو کو دھرا تھا

جلاد سے آہستہ یہ شبیر نے پوچھا | تو کون ہے سینہ پہ جو بیکس کے ہے بیٹھا
وہ کہنے لگا شمر مرا نام ہے شاہا | شہ بولے کہ مین کون ہون تب شمر یہ بولا

مین جانتا ہون کل کے مددگار ہو شبیر

پر آج تو تم بیکس و بیمار ہو شبیر

بابا وہ ترا جس نے اکھاڑا در خیبر | نانا وہ ترا جو کہ گیا عرش بریں پر
خاتون جنان مان ہے تری شافع محشر | شہ کہنے لگے خیر بتا اب یہ ستمگر

ہے جرم مرا یا گنہ فوج لعین ہے

وہ بولا خطا آپ کی تو کوئی نہین ہے

---

(۱) ج اص ۱۱۶ نولکشور ۱۹۳۷ء

شہ بولے کہ اے شمر یہ انصاف کی جا ہے　　تو جانتا ہے جد مرا محبوب خدا ہے

ماں فاطمہ ہے باپ علی عقدہ کشا ہے　　اور یہ بھی سمجھتا ہے کہ بے جرم و خطا ہے

پھر قتل مجھے کرتا ہے کیوں تیغ جفا سے

کیا حشر میں اے شمر کہے گا تو خدا سے

دبیر نے حضرت امام حسین علیہ السلام کے کردار کے اس پہلو کو بار بار نمایاں کیا ہے :

فرمایا شہ نے راہ پہ آؤ کہا نہیں　　فرمایا خیر پانی پلاؤ کہا نہیں

پوچھا میرا قصور بتاؤ کہا نہیں　　بولے تو پھر میں نہ ستاؤ کہا نہیں

فرمایا کیوں بلا کے اسیر تعب کیا ؟

بولے تم آپ آئے ہو کس نے طلب کیا ؟

فرمایا جانے دو کہ مدینہ کو جائیں ہم ؟　　وہ بولے نیزے کس کے جگر پر لگائیں ہم ؟

فرمایا اہلبیت کو پہنچا کے آئیں ہم؟　　چلائے وہ کہ بلوے میں کس کو پھرائیں ہم؟

فرمایا کچھ بھی تم کو مروت ہے یا نہیں

بولے کہ ہے یہ آل نبی پہ روا نہیں

(ص ۲۸۵ ج ۱ نولکشور ۱۹۳۷ ع)

حضرت امام حسین کے کردار میں شفقت احساسات کی شدت

حضرت امام حسین علیہ السلام کے کردار میں انسانی احساسات Human Touch کا اثر بہت غالب ہے ۔ حالات ہی کچھ ایسے رونما ہوگئے تھے کہ افراد خاندان کی تباہی بچوں کی یتیمی اہل حرم کی بے چارگی سب نقشے قبل از وقت آنکھوں کے سامنے آرہے تھے ۔ ایسے موقع پر پتھر سے زیادہ سخت دل بھی نرم ہوجاتا ہے اور حضور تو مرد مومن تھے اور بقول اقبال ؎

فطرت مسلم سراپا شفقت است　　درجہان دست و زبانش رحمت است

اگرچہ میدان جنگ میں وہ شیر ژیان کی طرح گرجتے ہوئے نظر آتے ہیں مگر اپنے خیموں میں

واپس ہوتے ہیں تو سراپا شفقت اور رحم و کرم دکھائی دیتے ہیں ۔ مثلاً بیٹی کو دیکھتے ہیں تو ؎

جب دیکھتے ہیں اس کی طرف تھرتھراتے ہیں　　کرتے ہیں گھنڈی دیتے ہیں شوق پہناتے ہیں

دکھلا کے اس کا حال بہن کو سناتے ہیں　　اس سن کے بچے اور بھی یہ دکھ اٹھاتے ہیں

دریا پہ خون ہی ہی کے سقے کا بہہ گیا

یہ خشک ہونٹ دیکھنے کو باپ رہ گیا

حضرت عباس کی شہادت کی خبر سنتے ہیں تو بے تاب ہوجاتے ہیں ۔ فوری ردّ عمل کے طور پر اپنے صاحبزادہ حضرت اکبر کو بلاتے ہیں ؎

پھر مڑ کے جوان بیٹے کو چلاتے کہ جلد آؤ　　اکبر مرے ٹوٹے ہوئے بازو سے لپٹ جاؤ

بیتاب ہوں میں جلد مرے بھائی کو دکھلاؤ　　کہ دم آنکھوں میں آپہونچا ہے میں نہ یہ بہو نچاؤ

آنکھوں سے میری خون دل اس وقت بہا ہے

چھریوں سے کلیجے کو کوئی کاٹ رہا ہے

اب دل میں ہے وہ درد جو پہلے تھا کمر میں　　شانوں کی تپش پھیل کے آئی ہے جگر میں

لٹا یوں کوئی مسافر نہ لٹا ہوگا سفر میں　　بیٹا مرے عباس کا ماتم ہے کہ گھر میں

سجاد و چچی کو کہ اسے پاس بلالیں

بہنوں سے یہ کہہ دو کہ سکینہ کو سنبھالیں

بیٹے کی موت پر شفیق باپ کا دل تڑپ اٹھتا ہے ؎

اے کردگار لم یزلی آہ الغیاث　　نانا چھری گلے پہ چلی آہ الغیاث

یا مرتضیٰ علی ولی آہ/ یا الغیاث　　زینب نے خاک مہ پہ ملی آہ الغیاث

اے موت اور ایک سہارے کو لے گئی

مقتل سے کس طرف میرے پیارے کو لے گئی

حضرت کے کردار کا تشخص | مرثیہ گو شعراء پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ تشخص کردار Individualization of character کا خیال نہین رکھتے اور ایک حضرت کی مدح دوسرے حضرت پر بعینہ منطبق کی جا سکتی ہے ۔ لیکن اگر بنظر غور دیکھا جائے تو یہ اعتراض بھی درست معلوم نہین ہوتا ۔

حضرت امام حسین اور حضرت عباس دونون بھائی بھائی ہین ۔ دونون نے ایک ہی منبع توارث سے فائدہ اٹھایا ہے اور ایک ہی ماحول مین پرورش پائی ہے ۔ اس لئے یہ ہرگز غیر قدرتی نہین کہ دونون کے عادات و خصائل مین نمایان فرق نہ ہو ۔ البتہ مائین علیحدہ علیحدہ ہین ۔ اس لئے توارث کے سرمایہ مین امتیازی خصوصیات ~~Tendencies~~ Traits اور رجحانات Tendencies کا فرق ضرور ہے ۔ اور اکثر مواقع پر نمایان ہوتا رہتا ہے پھر عمر تجربہ اور ذمہ داریون کا فرق ہے مثلا حضرت امام حسین نے دریائے فرات کے کنارے خیمے نصب فرمائے تو شمر کے دستہ کے افراد نے اعتراض کیا ؎ (ص ۸٦ ج ۱ نولکشور ۱۹۳۷ع)

نے شمر سے پوچھا نہ بن سعد سے پوچھا   پھر حکم سے کس کے یہان خیمے کئے برپا
کیا جانیے کیا دل مین ہین سمجھے شہ والا   حاکم سے عداوت کا بڑھانا نہین اچھا
اس نہر پہ تل رکھنے کی بھی جا نہ ملے گی
اتریں گی جو فوجین تو زمین یان کی ہلے گی

حضرت عباس نے جب یہ سنا تو برہم ہوئے اور ترکی بہ ترکی جواب دیا ؎

حاکم کا ترے اذن نہین شاہ کو درکار   کونین خالق نے کیا ہے انہین مختار
یہ نہر بھی ہے مہر بتول جگر افگار   کیا تھر ہوا یان اگر اترے شہ ابرار
دریا پہ جو خیمہ شۂ والا نے کیا ہے
اللہ نے فرزند کو حق مان کا دیا ہے

حاشیہ گذشتہ سے پیوستہ : دیا تو ان کے بین اور بکا سے ان کی بے صبری ظاہر نہین ہوتی بلکہ ان کا صبر اور نمایان ہو جاتا ہے اگر باپ بھائی شوہر اور بیٹے کی دائمی مفارقت پر ان کو غیر متاثر دکھایا دکھایا جاتا تو صبر اور سنگدلی مین امتیاز کیون کر ہو سکتا " (زمانا معانس سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب دیباچہ ص ۵)

اے آسمان زمین کا ستارہ کدھر گیا ۔۔۔ اے آفتاب چاند ہمارا کدھر گیا

اے نہر تشنہ لب مرا پیارا کدھر گیا ۔۔۔ اے عرش و فرش نور تمہارا کدھر گیا

اے خاک پاک درنجف کی تلاش ہے

اے کربلا بتا کدھر اکبر کی لاش ہے (۱)

حضرت امام حسین علیہ السلام کی بعض جسمانی کیفیات | حضرت امام حسین علیہ السلام اور دیگر شہدائے عظام کے سراپا سب مرثیہ گویوں نے لکھے ہیں اور دبیر بھی اس معاملے میں کسی سے پیچھے نہیں لیکن اس سراپاؤں سے کسی شہید کا حلیہ متعین نہیں کیا جاسکتا مگر دبیر کے کلام میں ایسی مثالیں سراپا کے ذیل میں تو نہیں اور مقامات پر ہیں جن کے مطالعہ سے حضرت امام حسین علیہ السلام کی تصویر آنکھوں کے سامنے چلتی دیکھتے ہیں

تھا اک تو ضعفی کے سبب ضعف سراپا ۔۔۔ کمزوری و ناطاقتی و سستی اعضا

اور اس پہ عزیزوں کا غم اور داغ احبا ۔۔۔ اور تین شب و روز کی وہ پیاس کا صدمہ

عاشور کو دیکھی یہ جفا فوج شقی کی

جو غم سے ہوئی ریش سفید ابن علی کی

آنکھوں کی بصارت غم اکبر سے ہوئی کم ۔۔۔ اور پشت دوتا کمر ماتم عباس نے کی خم

جنبش نہ زبان کو تھی یہ تھا پیاس کا عالم ۔۔۔ اور زرد زرد تھا صدموں سے رخ سید عالم

جو زور بدن آگے تھا فرق اس میں بڑا تھا

اک فرق مگر یاد خدا میں نہ پڑا تھا

---

(۱) "بعض لوگوں کو مرثیوں میں اہل حرم کی گریہ و زاری کا بیان ان کی شان صبر کے منافی معلوم ہوتا ہے لیکن قریب ترین عزیزوں کی موت پر رونا اور بین کرنا نسوانی بلکہ انسانی فطرت کا تقاضہ ہے اور اس ذریعہ سے اس کا سراغ ملتا ہے کہ امام حسین علیہ السلام کے اہل حرم کو اپنے عزیزوں سے کس حد تک محبت تھی ۔ اس کے ساتھ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان کی انتہائی محبت ادائے فرض پر کبھی غالب نہیں آسکی اور انہوں نے اپنے جگر کے ٹکڑوں اور آنکھوں کے تاروں کو تلواروں کے جنگل نیزوں کے نیستان اور تیروں کی بارش میں بے تامل بلکہ باصرار بھیج

(حاشیہ بقیہ برصفحہ آئندہ)

حضرت عباس راستی پر تھے ۔نہر سے خیمہ اٹھالینا اور ہٹ کر کسی ایسے مقام پر نصب کرنا کہ درمیان مین دشمن کی فوج آجائے خود کو تباہی کے منہ مین ڈالنا تھا اور یہ حقیقت نہ حضرت عباس سے پوشیدہ تھی نہ حضرت امام حسین سے ۔لیکن دونون کے مقام کا فرق دونون کی عادات واطوار اور رجحانات مین تفریق کا باعث ہے ۔حضرت اس شور و غوغا پر باہر نکل آئے اور کہا

خیمے سے بہت جلد برآمد ہوئے سرور   سیدانیان بھی در پہ چلی آئین کھلے سر

حضرت نے صدا دی یہ علمدار کو بڑھ کر   کہون ان سے الجھتے ہوا ے جان برادر

نے بحث کا ہے وقت نے حجت کا محل ہے

نادان ہے یہ قوم نصیحت کا محل ہے

شہ آئے کہ رحمت کی گھٹا نہر پہ آئی   عباس سے فرمایا کہ اے میرے فدائی

بے شک اسد اللہ کے تم شیر ہو بھائی   مرغوب بہت ہے تمہین دریا کی ترائی

کم ظرف ہین یہ اہل ستم ان سے نہ الجھو

لو آؤ میرے سر کی قسم ان سے نہ الجھو

گر یہ نہین دریا پہ اترنے کے روادار   تم خیمون کو اٹھوالو عبث کرتے ہو تکرار

قسمت مین تو لکھی پانی نہین اے مونس و غمخوار   گر نہر ہوئی پاس تو کیا ہم کو سروکار

جس بات مین ہو بحث نہ ہم منہ سے کہین گے

گر ان کی خوشی یہ ہے تو پیاسے ہی رہین گے (ص ۸۶ ج ۱ مذکور)

حضرت امام حسین کا کردار تخیلی ہے یا سپاٹ

حضرت امام حسین کے کردار مین اب بحث طلب امر صرف یہ رہ گیا ہے کہ ان کا کردار تخیلی ہے یا بلکہ سپاٹ ۔گذشتہ اوراق مین آپ نے ایسے اکثر واقعات ملاحظہ کئے ہون گے جہان حضرت امام حالات کے مطابق مجبور ہوکر آگے بڑھتے ہین مگر ان کے سامنے ایک موقف تھا اور وہ یہ تھا کہ بیعت یزید ان کے عقائد اور مناصب کے خلاف ہے ۔اس لحاظ سے وہ معاشرہ کے ایک طبقہ سے اور اس کی اقدار

سے بر سر پیکار تھے ۔ یہ سپاٹ کرداروں کی خصوصیات ہیں مگر اس کے ساتھ ہی وہ بہت سے متبادل نظریات فریق مخالف کے سامنے پیش کرتے ہیں اور آخری وقت تک جنگ اور تباہی سے گریزاں نظر آتے ہیں ۔ یہاں ان کے کردار میں تشکیلی اور متحرک کرداروں کی صفات نمایاں ہیں اور فارسٹر کے گذشتہ حوالے کے مطابق جب کرداروں میں متبادل افعال پیدا ہونے لگیں تو محیط کرداروں کا آغاز ہوجاتا ہے ۔ اس لئے ہمارے نقطۂ نظر کے مطابق آپ کا کردار متحرک Dynamic ہے ۔

دیگر متحرک کردار | اس داستان میں دیگر متحرک کردار حر علیہ الرحمۃ اس کے بھائی لڑکے اور غلام کے علاوہ حضرات سجاد عباس و عون و محمد کے ہیں ۔

حضرت حر پہلے افواج یزید کے ایک افسر تھے ۔ حضرت امام حسین کی شخصیت سے متاثر ہوکر عین میدان جنگ میں اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر حضرت امام کی افواج میں شامل ہوجاتے ہیں اور ان کی طرف سے لڑتے ہوئے شہادت کا رتبہ حاصل کرتے ہیں ۔ دبیر کے کلام سے مرثیہ کا وہ حصہ جہاں حر اپنے برادر و فرزند سے خطاب کرتے ہیں اور پھر بحث و تمحیص کے بعد اس کے ساتھ شمولیت کا ارادہ کرلیتے ہیں اس کے بعد کے واقعات حر کی شہادت تک کے واقعات ملاحظہ فرمائیں ؎

حر صبح سے علیحدہ گوشے میں تھا کھڑا   انگشت حیف لب کے تلے اور یہ تھی حیا
اللہ تو یہ آہ بڑی میں نے کی خطا   سید کو گھیر کر یہاں لایا غضب کیا
نرغہ ہے ظالموں کا شہ خوش خصال پر
پانی ہے بند ساقی کوثر کے لال پر

حر سے کہا برادر و فرزند نے یہ کیا ؟   اے رستم زمانہ ہزاروں سے تو لڑا
ستر دشمن سے تیرے لڑتے ہیں دست و پا   حر نے کہاں میں خوف سے کانپوں نہ کیوں بھلا
یاں تو مقابلہ پسر مصطفے کا ہے
اور بعد اس کے سامنا اللہ رب خدا کا ہے

دل مین میرے شمعی ہوئی ہے رات سے یہ بات　　حملہ یہی ہے قصد جو فضل خدا ہے سات
جاکر ملون امام سے خود باندھ کر مین ہات　　شاید اسی وسیلہ سے ہووے مری نجات
جی مین یہ ہے کہ صابر و شاکر کا ساتھ دون
ہون منحرف خدا سے جو کافر کا ساتھ دون

اب اپنی تم کہو کہ تمھارا ہے قصد کیا　　دونون نے کی یہ عرض کہ جو آپ کی رضا
حاضر غلام حر بھی ہوا اور یہ کہا　　یہ خانہ زاد بھی ہے فدائے شہ ہدی
عشق دلی ہے مجھ کو شہ خوش صفات سے
مجھ کو نہ چھوڑیے گا کہین اپنے سات سے

حر نے دیا یہ حکم سعدون کو سج کے لاؤ　　جلدی کا ہے یہ وقت بسرعت قدم بڑھاؤ
کثرت سے فوج شام کی ہرگز نہ خوف کھاؤ　　نام حسین لے کے عنان فرس اٹھاؤ
نکلو عذاب نار سے داخل جنان مین ہو
حاضر جناب سرور کون و مکان مین ہو

حر اور پسر برادر و عبد نکو شعار　　گھوڑون پہ اپنے اپنے دلاور ہوئے سوار
آئے دلیر پیش بن سعد نا بکار　　فرمایا حر نے ستم اطوار ہوشیار
اب لمحہ بھر بھی یان مجھے رہنا حرام ہے
کیون کفر سے جدا نہ ہون حر میرا نام ہے

اس حال جانگزا کی نہ تھی کچھ خبر مجھے　　مین کیا کہون ہوئی ہے یہ کیون کر سحر مجھے
تیری طرح نہین ہے ہوس مال و زر مجھے　　بارگران ہے دوش پہ اپنے یہ سر مجھے
دنیا کے جال مین کبھی دیندار آتے ہین
دیکھ اس طرح سے حق کے طلبگار آتے ہین

تھا شام سے یہ قصد کہین جلد ہو سحر　　ہون داخل سپاہ شہنشاہ بحر و بر
کہنے کو یہ نہ ہو کہ یہ غالب تھا دلپہ ڈر　　چھپ کر چلا شب مین گیا حر بصد خطر

اب جس مین دم ہو بڑھ کے غضنفر کو ٹوک لے

تو حکم ساری فوج کو دے مجھ کو روک لے

بولا بن سعد کہ اے آزمودہ کار | چہرہ سے نمود تیرے خوف و اضطرار
باتین بنا رہا ہے بگڑ کر با انتشار | ہونیکو اب ہے جنگ رسالہ سے ہوشیار

ہے خون خشک برق دم ذوالفقار سے

تو ڈر گیا حسینیون کی کارزار سے

یہ جان لے کہ نوکری پر آئیگا زوال | یہ یاد رکھ نہ چھوٹ کے ہوگا کبھی بحال
ہون گے اسیر ظلم و ستم سے ترے عیال | افسوس کچھ نہین تجھے ناموس کا خیال

ذلت کا سامنا ہو تو افسر کی موت ہے

منہ موڑنا وفا سے دلاور کی موت ہے

کیا خوب واہ رشتۂ نو جوڑتا ہے تو | برسون کا سلسلہ جو ہے وہ توڑتا ہے تو
بنڑے کا اپنے ساتھ عبث چھوڑتا ہے تو | حاکم سے ایسے وقت مین منہ موڑتا ہے تو

کیون کر سنون مین آج تیرے اس کلام کو

کل کی ہے بات گھیر کے لایا امام کو

کیون ہاتھ شہ کی باگ پہ ڈالا تھا یا نہین | جو حوصلہ تھا دل کا نکالا تھا یا نہین
غصہ علی کے شیر نے ٹالا تھا یا نہین | تو تیغ حیدری کا نوالہ تھا یا نہین

رہتا اگر وہ طور اسی دم تھا خاتمہ

بڑھتا اگر کچھ اور اسی دم تھا خاتمہ

حر نے کہا اسی کی ندامت ہے یہ مجھے | مجھ سے یہ کیا خطا ہوئی حیرت ہے یہ مجھے
ہون ان سے منحرف کہین طاقت ہے یہ مجھے | صدقے ہون شہ کے قدمون پہ حسرت ہے یہ مجھے

سر کاٹ لین تو جرم کی میرے سزا یہ ہے

اور بخش دین خطا تو سراسر عطا یہ ہے

بے حد ہے میرے دل پہ ہجوم غم و ملال — تاعمر یہ رہے گی ندامت مجھے کمال

لشکر سمیت پیاس سے تھا غیر مرا حال — محفوظ شور و شر سے ہوا مرتضی کا لال

رکھا نہ اپنے واسطے پانی پلا دیا

مرتے ہوؤں کو ابر کرم نے جلا دیا

حر کے سخن کو کاٹ کے بولا وہ پرفتن — اے صف شکن یہ صف شکنوں کا نہیں چلن

بیٹا بھی تیرے ساتھ ہے اے مرد محن — اس چاند کو لگاتا ہے خود ہاتھ سے گہن

تیرا خیال کس طرف اے باتمیز ہے

اولاد سے سوا کوئی دنیا میں چیز ہے

حر نے کہا کہ اس کا نہیں کچھ مجھے خطر — سوجان سے ہوں فدائے شہنشاہ بحر و بر

ہمراہ اس لئے لئے جاتا ہوں میں پسر — صدقے کروں گا اس کو شبیہ رسول پر

لے کر رضا امام سے لڑنے کو آؤں گا

میں سب سے پہلے گلشن جنت میں جاؤں گا

یہ کہ کے حر نے باگ کو موڑا بصد نشان — نکلا چھٹ کے فوج سے رہوار جوش عنان

ہمراہ تھے برادر رہو و فرزند نوجوان — سایہ کی طرح عبد پس پشت تھا رواں

لے کر علی کا نام اس انبوہ عام سے

وہ پیر و حسین چلے فوج شام سے

پہنچا قریب فوج خدا جب وہ باصفا — حر جری نے سبط پیمبر کو دی صدا

اے شیر کبریا کے پسر تجھ میں میں فدا — وقت مدد ہے اے جگر و جان مرتضے

محجوب ہے کمال بہت شرمسار ہے

مولا غلام عفو کا امیدوار ہے

کردار میں یہ تبدیلی اس حد تک ہوجاتی ہے کہ کہاں وہ حضرت امام حسین علیہ السلام کو گھیر

کر لیا تھا اور کہاں اب ان کی فوج میں شامل ہوکر شامل پیکار ہوجاتا ہے —

لے کر رضا امام سے با صد شکوہ و شان پیاسا چلا جہاد کو پیاسوں کا مہمان

ڈیوڑھی سے غشہ بولی کہ حیدر نگاہبان اے حو دعائیں دیتی ہیں زہرا کی بیٹیاں

خوش خوش چڑھا دلیر سمند دلیر پـــــر

گویا سوار شیر ہوا پشت شیـــــر پـــــر

لڑتا تھا یوں یزیدیوں سے حیدری جوان بے خوف رن میں حملہ کناں تھا یہاں وہاں

ناگاہ اک شقی کی لگی سینے پر سنان گھوڑے سے گر پڑا وہ جری ہوکے نیم جان

آقا کو دی ندا کہ یہ خادم فـــدا ہوا

مولا غلام حق نمک سے ادا ھـــوا

بقیہ کردار | باقی کردار سپاٹ ہیں — کچھ نیکی کے ساتھی ہیں اور کچھ بدی کے اور خاموشی سے اپنے اپنے فرائض کو ادا کرتے ہیں — حضرات امام حسین علیہ السلام کے تمام ساتھی مخصوص معاشرتی توارث کی پیداوار ہونے کی وجہ سے یکساں اکتسابی خصائص کا اظہار کرتے ہیں — جرأت بہادری صبر اور تسلیم و رضا کی صفات سے متصف ہیں — انتہائی مصائب میں گرفتار ہونے کی وجہ سے نیز اپنی جماعت کے افراد کو یکے بعد دیگرے اپنی آنکھوں کے سامنے شہید ہوتے دیکھ کر گریہ و زاری اور آہ و بکا پر مجبور ہیں — اس کے ساتھ ساتھ مذہبی تقدس اور اپنے رہنما کی صفات میں سے بیشتر ان میں پائی جاتی ہیں —

ان کے مقابلہ میں اشقیاء کی ایک کثیر فوج ہے — جن میں اقدار مشترک بزدلی قساوت قلبی بے رحمی اور ناحق شناسی ہیں — سب کے افعال کی علت غائی محض دنیاوی لالچ ہے —

واقعات کی شکل و صورت اور نہج ہی کچھ اس انداز کی ہے کہ شاعر فریقین کے بیشتر افراد کے شخصی کردار کی صفات نمایاں نہیں کر سکتا — ادھر ادھر اشارات کی کمی نہیں — مگر محض ان اشارات پر ان کے کردار کا تشخص تعمیر ناممکن ہے — جس قدر ممکن تھا وہ گذشتہ صفحات میں بیان کردیا گیا ہے —

باب نہم

محسنات شعر

۱ ۔ محسنات شعر کی مقبولیت کے اسباب

۲ ۔ تشبیہات و استعارات کی غرض و غایت و اہمیت ۔ ابلاغ و شدت تاثر
دبیر کے کلام سے مثالیں ۔

۳ ۔ علم بدیع

تعریف ۔ مقاصد

صنائع لفظی ۔ غرض و غایت ۔ تجنیس ~~ملمتا~~ اشتقاق ردالعجز علی الصدر

لزوم مالا یلزم ۔ صنعت مہملہ

۴ ۔ صنائع معنوی ۔ غرض و غائت

صنعت ایہام طباق ۔ مراعات النظیر عکس و تبدیل ۔

رجوع لف و نشر جمع تفریق تقسیم مبالغہ تجرید

حسن تعلیل تاکید المدح بمایشبہ الذم

محسنات شعـــر

محسنات شعر کی مقبولیت کے اسباب | اودھ کی عام معاشرت کے بیان مین ہم نے لکھنئو کـــی ادبی میراث کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ جب اردو کی شعری روایت لکھنئو پہنچی تو وہان کی وضع زیست اور پر تکلف وپر تصنع معاشرت نے شعری اور نثری تخلیقات کو بھی متاثر کیا ۔ اور محسنات شعر کا استعمال بے اعتدالی کی حد تک ہونے لگا ۔ ناسخ نے اعلی طبقہ کی زبان کو اپنایا اور اسے اس قدر اہمیت دی کہ "شاعر کو مرصع ساز" اور "شاعری کو نگون کا جڑنا" (۱) قرار دیا ۔ مصحفی نے اس رو کو تھامنے کی کوشش کی (۲) لیکن اپنے چھٹے دیوان مین خود بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے ۔ (۳)

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے مضمون آل احمد سرور لکھنئو اور اردو ادب مطبوعہ بہترین ادب ۱۹۵۰ع مکتبہ اردو لاہور

(۲) تھا جو شعر راست سرو بوستان ریختہ اب وہی ہے لالۂ زرد خـــزان ریختہ

پیچ دے دے لفظ و معنی کو بتاتے ہین صنعت اور وہ پھر اس پر رکھتے ہین گمان ریختہ

فہم مین اتنا نہین آتا بحکم رائے پست اس بلندی سے گھٹی جاتی ہے شان ریختہ

جب سے معنی بند کا چرچا ہوا اے مصحفی خلط مین جاتا رہا حسن بیان ریختـــہ

(۳) دیوان ششم مطبوعہ ۱۲۲۲ھ مین خود اعتراف کیا ہے ۔ ملاحظہ ہو دیباچہ دیوان مذکور عبارت "پس از اقتضائے ایام چون سلسلـــۂ موزونیـــت در ازکشـــید حصہ الوان این خوان بہ شیخ ناسخ ..... "

علمائے فرنگی محل کی بدولت لکھنؤ علم و ادب کا گہوارہ بن گیا تھا ۔یہان تک کہ ساری اسلامی دنیا مین ان کا مقرر کردہ نصاب (سلسلہ نظامیہ) رائج تھا ۔حکمت فلسفہ منطق کلام فقہ و اصول فقہ اور دیگر علوم و فنون کا یہ شہر مصدن و مرجع بن چکا تھا ۔شعر و شاعری کا چرچا اس قدر تھا کہ شعر گوئی وضعداری کا دوسرا نام ہوگیا اور عورتین بھی شعر کہنے لگین تھ جہلا کے کلام مین بھی شاعرانہ خیال آفرینیون تشبیہون اور استعارون کی جھلک نظر آنے لگی (۱)

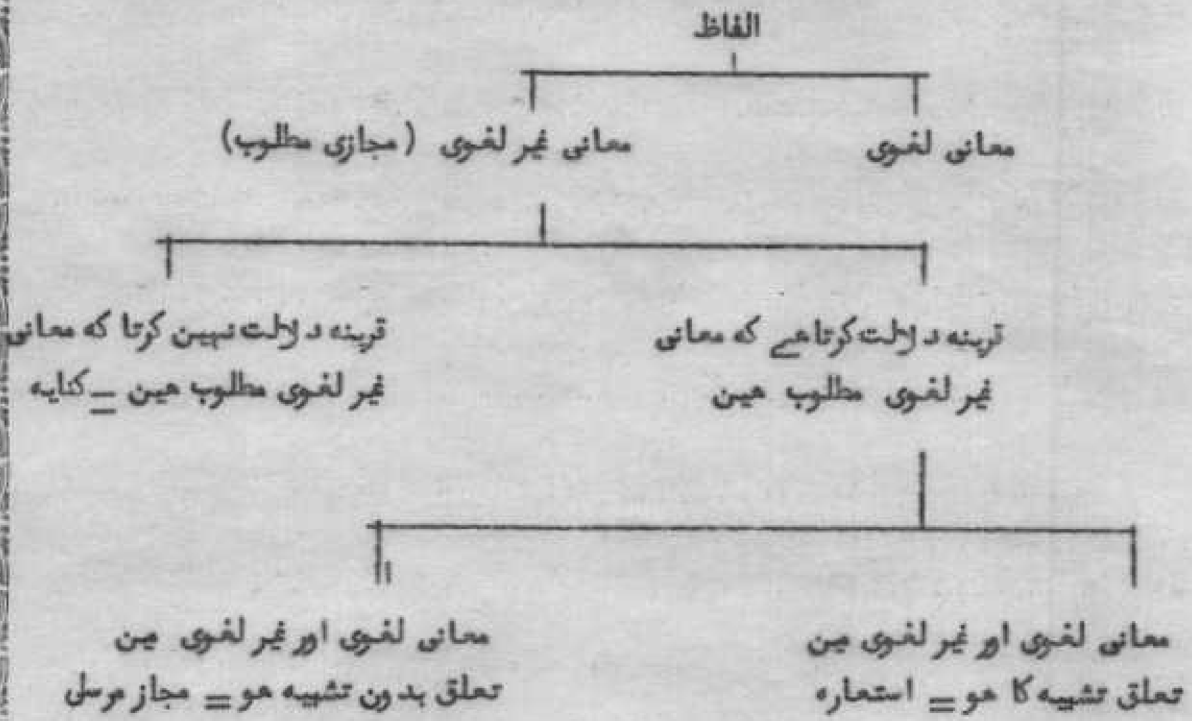
کہنا یہ ہے کہ جب مرزا دبیر کی شاعری کا آغاز ہوا تو یہی رنگ مقبول تھا ۔ہر چھوٹا بڑا شاعر اسی راہ پر گامزن تھا ۔دبیر جو بحیثیت علم و فضل منتہی اور کثیرالمطالعہ انسان تھے روش عام سے دامن نہ بچا سکے ۔چنانچہ ان کے کلام مین محسنات شعر کا اہتمام و التزام پورے عروج پر ملتاہے ۔لیکن کمال یہ ہے کہ ان تکلفات کا استعمال اس حسن و خوبی سے کیا گیا ہے کہ ان کی کثرت کے باوجود کلام کی دلاویزی مین فرق نہین آیا ۔حالانکہ شاید ہی کوئی لفظی اور معنوی صنعت ہو جو ان کی دستبرد سے بچی ہو ۔بلکہ یون کہنا چاہئے کہ مرزا کو اپنے تخیل کے تنوعات کے بیان مجاز سے کام لینے مین بڑی قدرت حاصل تھی ۔

تشبیہات و استعارات | زبان مافی الضمیر کے اظہار و ابلاغ کے ذریعے کا نام ہے ۔جذبات اور روئداد قلبیہ کا ابلاغ الفاظ ہی کے ذریعے کیاجاتا ہے ۔چونکہ جذبہ ایک پیچیدہ عمل ہے اس لئے اس کے اظہار و ابلاغ کے طریق بھی پیچیدہ ہین جو عمر اور تجربے کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہین ۔بچے صرف رونا اور ہنسنا جانتے ہین ۔خوف سے رو دیتے ہین اور مسرت کا اظہار مسکرا کر یا قہقہہ لگا کر کردیتے ہین لیکن بالغ اور سنجیدہ اشخاص ڈر کر روتے نہین بلکہ اپنی اس قلبی کیفیت کو کسی پر ظاہر کرنا عار سمجھتے ہین ۔اس کے علاوہ بچون کے جذبات نسبتاً سادہ اور ناپختہ ہوتے ہین مگر جون جون عمر علم اور تجربہ مین اضافہ ہوتاہے تو جذبات مین بھی پختگی اور پیچیدگی پیدا ہوتی جاتی ہے ظاہر ہے کہ پیچیدہ جذبات کے

(۱) شرر گذشتہ لکھنؤ ص ۹۹ ۔ ۱۰۰ نسیم بکڈپو ۔لکھنؤ

بیان مین سیدھی سادی زبان آلۂ کار نہین ہوسکتی بلکہ افکار کی ندرت بداعت اور پیچیدگی کے تناسب سے اظہار و ابلاغ مین دقت محسوس ہوگی ۔ اسی دقت سے نجات حاصل کرنے کے لئے تشبیہات و استعارات کا سہارا لیاجاتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ صف اول کے شعراء کے ہان بدیع معنی خیز اور خوبصورت تشبیہات و استعارات کا ذخیرہ دوسرون کے مقابلے مین بہت زیادہ ہوتا ہے ۔ کیونکہ گذشتہ تجربات کو لاشعور سے شعور مین لانے کے لئے استعارات وتشبیہات ربط و تلازم کا کام دیتے ہین ۔ گویا یہ توضیح مطالب اور تشریح معانی کا وسیلہ ہین اور الجھی ہوئی کیفیات اور دقیق مطالب کی ادائیگی کے بیان کا ذریعہ ہین جہان کیفیات سادہ ہوتی ہین وہان ان کے بغیر کام نکل سکتا ہے مگر جہان حالت برعکس ہوتی ہے وہان مجاز کا سہارا لیا جاتا ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ تشبیہات و استعارات محض آرائش کلام اور سنگار کے لئے استعمال نہین ہوتے بلکہ ان کا اصل مقصد مافی الضمیر کی وضاحت ہے ۔

" علم بیان کی رو سے اس کی صورت یہ ہے کہ الفاظ جب اپنے غیر لغوی معانی مین استعمال ہوتے ہین (یعنی جب الفاظ و کلمات کے مجموعے کے مفہوم کا مدار لغت پر نہین ہوتا) تو دو صورتین پیدا ہوتی ہین ۔ یا تو قرینہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ الفاظ اپنے معانی غیر لغوی مین استعمال کئے گئے ہین ۔ یا اس قسم کا کوئی قرینہ موجود نہین ہوتا اور معانی مجازی یا معانی مطلوب معانی لغوی ہی پر غور کرنے سے ان کے نتیجے کے طور پر برآمد ہوتے ہین جس صورت مین معانی مجازی کی دلیل کوئی خارجی قرینہ ہوتا ہے وہان پھر دو صورتین پیدا ہوتی ہین یا تو معانی لغوی اور معانی غیر لغوی (مطلوب مجازی) مین تعلق تشبیہ ہوتا ہے یا کوئی اور تعلق بدون تشبیہ ہوتا ہے ۔ پہلی صورت مین استعارہ ظہور مین آتا ہے دوسری صورت مین مجاز مرسل باقی جو رہ گیا ہے وہ کنایہ جو کچھ مین نے کہا ہے اس کی تشریح شاید مندرجہ ذیل نقشے سے ہوسکے :-



یہان صرف ایک بات گفتنی ہے اور وہ یہ کہ جو ہمارے ارباب انتقاد (مشرقی) لکھتے ہین کہ تشبیہ مجاز ہے یہ بہ صراحت غلط ہے ــ تشبیہ مین کوئی لفظ کوئی کلمہ اپنی حیثیت لغوی سے ہٹ کر مجازی پہلو اختیار نہین کرتا ــ مثلاً

یہ آب وتاب حسن یہ عالم شباب کا   تم ہو کہ ایک پھول کھلا ہے گلاب کا

اس شعر مین محبوب کے عالم شباب کو گلاب کے کھلے ہوئے پھول سے تشبیہ دی گی ہے غور فرمائیے کہ کون سا لفظ اپنے لغوی معانی سے ہٹ گیا ہے ــ ہر کلمے کے مفہوم کا مدار لغت پر ہے ــ مشرق کے بالغ نظر نقاد مغرب کے نکتہ طراز نقادون کی طرح بہ فصاحت یہ تو نہین کہتے کہ تشبیہ کا مقصد توضیح مطالب اور تشریح معانی ہے لیکن جہان انھون نے اغراض تشبیہ کا ذکر کیا ہے وہان یہ بھی کہا ہے کہ تشبیہ سے ایک غرض یہ بھی ہوتی ہے کہ مشبہ بہ کا حال بیان کیاجائے ــ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ یہ بالفاظ بعینہ وہی بات ہے جو مغرب کے نقاد کہ رہے ہین ــ اس کے علاوہ تمام مشرقی نقاد اس بات پر متفق ہین کہ تشبیہ جتنی بعید ہوگی اتنی ہی بلیغ یا بدیع ہوگی ــ یہ بھی بالفاظ دیگر اسی حقیقت کا اظہار ہے کہ تشبیہ کے ذریعے اچھوتی مشکل اور دقیق واردات کا اظہار کیاجاتاہے اور اگر تشبیہ سے یہ کام نہ لیا

جائے تو وہ محض نگار سخن کے پاؤں کا بوجھل زیور ہوکر رہ جاتی ہے " (۱)

تشبیہ ایک اور بڑی غرض تاثرات کی شدت کو نمایاں اور شدید تر بناکر پیش کرنا ہے ۔ شان و شوکت حسن و جمال رعب و ہیبت بلکہ تحقیر و ذلت بھی تشبیہ و استعارہ کی زبان مین جلوہ گر ہوکر نمایاں ہوجاتے ہین ۔یہی وجہ ہے کہ موتمن " وصف " کے بیان مین تشبیہات کو ایک ضروری عنصر قرار دیتا ہے (۲)

مرزا دبیر نے تشبیہات و استعارات سے بڑا کام لیا ہے کیونکہ ان کی شاعری کے اہم ترین مقاصد جذبات کی مصوری اور مدح اہل بیت تھا ۔اس لئے انہین اس کے بغیر چارہ بھی نہ تھا ۔ مثالین ملاحظہ ہون :۔

رخسار و زلف

لاریب جرم ہے جو کہین چاند رخ کو ہم ہے چاند مین تو جرم یہ بے جرم لاجرم
رخ ہے وہ صبح شمس ہین جسکے شۂ امم گیسو وہ شب کہ قدر شب قدر جس سے کم
رخسار و زلف قدرت داور دکھاتے ہین
ہر وقت صبح و شام برابر دکھاتے ہیـن

روئے ضیا بار

شمع و چراغ و آئینہ و صبح و آفتاب باغ و بہار و یاسمن و لالہ و گلاب
ناہید و بدر و مشتریؑ و قطب و ماہتاب آب حیات لعل بدخشان درخوش آب
یوسف اور ان کے سارے خریدار اک طرف
سب اک طرف یہ روئے ضیا بار اک طرف

(۱) ماخوذ از مضمون " شعر مین تشبیہ " سید عابد علی عابد مطبوعہ سالنامہ ادب لطیف مارچ ۱۹۵۵ع

(۲) (حق یہ ہے کہ تشبیہ دراصل تمام خیالی ادب کی جان ہے اس کے بغیر وہ چیز جسے ایڈیسن نے تجربے مین شے کے اضافے کے نام سے تعبیر کیا ہے ممکن ہی نہین ہوسکی۔ ڈاکٹر سید عبداللہ ولی سے اقبال تک ص ۲۲ مکتبہ جدید ۱۹۵۸ع

(۲) " در اشعار وصفی بیش از ہر چیز از فن تشبیہ استفادہ بعمل می آید " موتمن شعر و ادب فارسی ص ۶۸ مطبوعہ کتاب خانہ ابن سینا ۔ طہران

حضرت امام حسین علیہ السلام کے مرکب کی مدح مین تشبیہات کی بہار ملاحظہ ہو ؎

مرکب حسین کا ہے نہ کیون کر ہو یہ حسین — جوزا عنان ہلال رکاب آفتاب زین

افشان چنی ہے یہ عرق افشان نہین جبین — ستا نہین یہان مین کسی کی چنان وچین

چارون سمون کے نقش نہ پوچھو وہ کیا ہوئے

اڑ کر عقاب و ہدہد وکبک و ہما ہوئے

حبیب ابن مظاہر رح کی پیری ارتعاش اعضا اور ثابت قدمی کی تصویر :۔

سر ہلتا ہے پر ہر کف پارن مین جمی ہے — جنبش مین ہے لو شمع کو ثابت قدمی ہے

حضرت سجاد علیہ السلام کی حالت اسیری کو ظاہر کیا ہے ؎

بڑھ گئے ہین جو اسیری کے سبب سر کے بال — ہے یہان آیۂ رحمت کا نـــزول اجلال

سنبل گلشن قدرت ہے نقط ان کی مثال — بال ان زلفون کے ہین بال ہمائے اقبال

طول کاکل کا اسیری مین جو یہ طور ہوا

سلسلہ بخشش امت کا دراز اور ہـــوا

تن پہ ملبوس نہ ہے دوش مبارک پہ عبا — قطع اس قد پہ ہے پیرہن تسلیم و رضا

بے لباس اس تن پر نور کی ہے اور ضیا — طور کی شمع کو فانوس کی حاجت ہے کیا

پیرہن مین بھی تن پاک نہین چھپتا ہـــے

نور خالق کا چھپائے سے کہین چھپتا ہـــے

بسکہ کھینچی ہے مہار شتر آل عـــبا — سوکف دست مین کس حسن سے گٹا ہے پڑا

فی المثل مہر مین ہے داغ قمر جلوہ نما — مہرۂ مہر کجا داغ دل ماہ کـــجا

پشت احمد پہ تو تھی مہـــر نبوت پیدا

یان کف دست مین تھی مہـــر شفاعت پـــیدا

حضرت امام حسین کا سر مبارک کنوئین سے نکلتا ہے اس کی تشبیہات ؎

یون فرق شاہ چاہ سے نکلا بحسن وجاہ جیسے دہن سے کلمہ حق آنکھ سے نگاہ
مخزن سے گنج شب سے سپیدہ گہن سے ماہ ظلمت سے خضر غار سے پیغمبر الہ
ظلمت کی سیر کرکے سکندر عیان ہوئے
بئرالعلم سے ساقی کوثر عیان ہوئے

حضرت حر لشکر اعدا سے جدا ہوتے ہین ـ اعدا کی تذلیل اور حضرت حر کی فضیلت مطلوب ہے

نل تھا وہ مشرکون سے مسلمان جدا ہوا ظلمت سے نور کفر سے ایمان جدا ہوا
نصرانیون سے عیسی دوران جدا ہوا بادل سے آفتاب درخشان جدا ہوا
جنت کو کس طریقہ سے حر بسو محل گیا
عقرب سے چاند چاہ سے یوسف نکل گیا

مرحب بن عبدالقمر کا ذکر حقارت سے کیا جارہا ہے ـــ

تیار ہو کرکس کے ہوا جنگ پہ خونخوار اور پیک اجل آیا کہ ہے اجل بھی تیار
خنجر لیا منہ دیکھنے کو اور کبھی تلوار شل ورم مرگ چڑھا گھوڑے پہ اکبار
وہ رخش پہ یا دیو دنی تخت زری پر
نل رن مین اٹھا کوہ چڑھا کبک دری پر

دشمنون کی بھگدڑ اور اضطراب کو ظاہر کیا ہے ـــ

یون جسم رعشہ دار سے جانین ہوئی روان جس طرح بھاگین زلزلے سے چھوڑ کر مکان

حضرات اکبر و عباس کی مدح مین تشبیہات کا زور دکھایا گیا ہے ـــ

لشکر مین ہے یہ اکبر و عباس کا وقار وہ انجمن مین شمع تو یہ باغ مین بہار
آنکھون مین وہ نگاہ تو سینون مین یہ قرار وہ بازون مین زور یہ قبضے مین ذوالفقار
ان دونون کی یہ فوج خدا مین مثال ہے
در نجف وہ ہے تو یہ حیدر کا لال ہے

وہ چشم ہے پلک مین تو یہ دل ہے سینے مین　　حیدر وہ کعبہ مین یہ پیمبر مدینے مین
یوسف کنوئین مین نوح ہے کہیا سفینے مین　　آب بقا وہ چشمے مین یہ زرخزینے مین
وہ آب موتیون مین یہ اک گل ہــــزارون مین
خوشبو وہ پہولون مین یہ تجلی ستارون مین

ہر صبح مہر و ماہ کی یہ کم ہے روشنی　　پر دیکھو ان کے عارضون کی جلوہ افگنی
خورشید وہ جبری ہے تو ہے چاند یہ غنی　　اک سمت کو ہے دہوپ اور اک سمت چاندنی
پائی نہ اس طرح کی ضیا مہتاب مین
دیکہی نہ آفتاب نے یہ دہوپ خواب مین

علم بـــدیـــع

(تعریف (۱) " ایسے امور کا علم جو فصیح وبلیغ کلام کے لئے زینت وتحسین کا موجب
ہوتے ہیں جس طرح خوب صورت و خوب سیرت دلہن کے لئے زیورات
اچھا لباس " (۱)

(۲) " بدیع ایک علم ہے جس سے طریقے تحسین و تزئین کلام کے معلوم ہوتے ہین "(۲)

علم بدیع کی مندرجہ بالا دونوں تعریفین یہ ظاہر کرتی ہین کہ علم بدیع کا تعلق حسن و جمال سے ہے ۔ چونکہ حسن کی نمایاں ترین صفت مسرت کا بہم پہنچانا ہے ۔ اس لئے ظاہر ہے کہ کلام کو حسین و جمیل بنا کر پیش کرنا بے حد ضروری اور باعث مسرت و انبساط ہے اور یہی تخلیقی ادب کا انتہائی کمال ہے ۔

حسن کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ فن کار کے لئے باعث کشش ہوتا ہے اور اس کے اندر ایک وجدانی اور اضطرابی کیفیت پیدا کردیتا ہے جس سے نجات حاصل کرنے کے لئے وہ واردات قلبی کے من و عن اظہار کے لئے بے تاب ہوجاتا ہے ۔ گویہ مسئلہ اختلافی ہے کہ حسن آرٹ کی تخلیق کی علّت ہے یا مقصد تخلیق ۔ لیکن ہمین اس بحث مین الجھنے سے کچھ حاصل نہین ۔ ہمین اگر کسی شاہکار مین حسن کی جھلک نظر آجاتی ہے تو ہم اس کے نظارہ سے لطف اندوز ہوکر قانع ہوجاتے ہین ۔

علم بدیع کی تعریف نمبر ایک کے ساتھ جو مثال دی گئی ہے اس سے ظاہر ہے کہ حسن پیکر اور مطالب دونوں کے لئے لازم ہے اس لئے صنائع کو دو حصوں مین تقسیم کردیا جاتا ہے ۔

---

(۱) حدائق البلاغت ص ۸۹ ترجمہ محمد ادریس ۔ مطبوعہ مکتبہ شرقیہ ۔ جیکب لائنز کراچی

(۲) تذکرۃ البلاغت ص ۱۳۳ ذوالفقار علی مطبع مجتبائی دہلی ۱۹۲۳ ع

صنائع لفظی و معنوی ۔ چونکہ ذوق کے اجزائے ترکیبی ہین ۔ تخیل ۔ انفعال ۔ ادراک اس لئے الفاظ کے حسن کو معانی کے حسن سے جدا نہین کیاجاسکتا ۔ شاعر موجودات عالم سے جو اثرات قبول کرتاھے انہین بہتر سے بہتر قالب مین ڈھال کر دنیا کے سامنے پیش کردیتا ھے ۔ لہٰذا صنائع معنوی اور لفظی کی اھمیت یکسان ھے ۔ اگر صنائع لفظی سے ترنم اور نغمہ کا کام لیاجاسکتا ھے توصنائع معنوی سے عظمت کلام کی خدمت حاصل کی جاتی ھے ۔ کیونکہ الفاظ اور معانی کو نظریاتی طورپر تو ممکن ھے کہ جدا کیاجاسکے ورنہ نہ تو الفاظ کے بغیر معانی کا کوئی وجود ھے اور نہ ھی معانی کے بغیر الفاظ کا دراصل یہ دونون نام ایک ھی حقیقت سے متعلق ھین ۔

صنعت تجنیس | صنعت تجنیس کو لیجئے جو مشکل مگر متضاد المعانی الفاظ کو ایک کلمہ مین جمع کرنے کا علمی نام ھے ۔ ترنم کے علاوہ شوکت معانی سے بھی بھرپور ھے ۔ مثال دبیر ھی کے کلام سے پیش کی جاتی ھے (حضرت عباس کی مدح مین ھے) ۔

ھوتا ھے جو حاضر یہ بہادر سر دربار ۔۔۔ دربار مین دربار علی ھوتے ھین ھربار

نیر از حسنین ان پہ تصدق مرا گھر بار ۔۔۔ عارض ھین قمر بار لب لعل گھــــر بار

یہ والیٔ اقلیم ولایت کا ولــــی ھــــے

تصویر تو لائے حسین ابن علــی ھــــے

صفت اشتقاق وشبۂ اشتقاق | یہی حال صنعت اشتقاق وشبۂ اشتقاق کا ھے جو صنعت تجنیس کی منہ بولتی بہنین ھین ۔ دبیر اس صنعت سے بھی کام لیتے ھین ۔

(۱) بسرائے دبیر طاقت نظم وبیان ھے طاق ۔۔۔ ھوش الوداع کہتا ھے اور عقل الفراق

(۲) یان سب کو تھا یقین وھان تھی وھین نہ تھی ۔۔۔ وان اتفاق تھا کہ یہان تھی یہین نہ تھی

(تلوار کی مدح)

ھرجا تھی اور پوچھو کہان تھی کہین نہ تھی ۔۔۔ لاکھون کے قتل کرنے کو ھان تھی نہین نہ تھی

اس برق ذوالفقار کے جلوے کہان نہ تھــــے

وان تھے جہان زمین نہ تھی آسمان نہ تھــــے

حضرت حر کے چلے آنے سے افواج بن سعد کی حالت ؎

کھولا کسی نے جھنے سے ہوکر یہ تنگ تنگ ۔۔۔ گوشے مین کوئی رکھ کے کمان و خدنگ دنگ

بے وقفہ ہوش اڑگیا اور بے درنگ رنگ ۔۔۔ یہ کیا تھا منزلون ہوئے پائے پلنگ لنگ

گو مکر و حیلہ ظالمون کی آب و گل مین تھا

اس وقت بھاگنے کے سوا کچھ نہ دل مین تھا

ردالعجز علی الصدر | جو لفظ عجز (شعر کا آخری رکن) ہو اسی کو صدر (شعر کا پہلا رکن) بنادینا اسے صنعت معاد بھی کہتے ہین ۔ شعر مین موسیقیت اور حسن پیدا کرنے کے لئے یہ صنعت نہایت عمدہ آلہ کار ہے اور دبیر نے اسے بکثرت استعمال کیا ہے ملاحظہ ہو ؎

طلوار کی تعریف مین

خنجر کو جو کاٹا تو وہ ٹھری نہ سپر پر ۔۔۔ ٹھری نہ سپر پر تو سیدھی گئی سر پر

سیدھی گئی سر پر تو وہ تھی صدر و کمر پر ۔۔۔ تھی صدر و کمر پر تو وہ تھی قلب و جگر پر

تھی قلب و جگر پر تو وہ تھی دامن و زین پر

تھی دامن و زین پر تو نہ مرکب تھا زمین پر

مندرجہ ذیل تین بند حضرت امام حسین علیہ السلام کی رجز مین ہین ؎

کوثر کی آبرو ہون مین رضوان کی آبرو ۔۔۔ رضوان کی آبرو ہون مین سلمان کی آبرو

سلمان کی آبرو ہون مین ایمان کی آبرو ۔۔۔ ایمان کی آبرو ہون مین قرآن کی آبرو

قرآن کی آبرو ہون تو آدم کا فخر ہون

آدم کا فخر ہون تو دو عالم کا فخر ہون

عالم کا فخر ہون کہ مین عالی وقار ہون ۔۔۔ عالی وقار ہون کہ مین حق پر نثار ہون

حق پر نثار ہون کہ مین طاعت گذار ہون ۔۔۔ طاعت گذار ہون کہ مین الفت شعار ہون

الفت شعار ہون کہ مین عاشق خدا کا ہون

عاشق خدا کا ہون کہ مین دل مصطفے کا ہون

دل مصطفے کا ہون کہ مین نوالہ ہــون　　نوالہ ہون مین کہ زہرا کا ماہ ہــون

زہرا کا ماہ ہون شہ انجم سپاہ ہــون　　انجم سپاہ ہون مہین شاہون کا شاہ ہون

شاہون کا شاہ ہون مہین کل کا امیر ہون

کل کا امیرہون مین علی کا وزیر ہــون

حضرت علی اکبر کی مدح مین ـــ

معراج سخن کو ہے مرے ذہن رسا سے　　ہے ذہن رسا اوج پہ اکبر کی ثنا ســے

اکبر کی ثنا کرتا ہون افضال خــدا سے　　افضال خدا ہے مدد خیر وری ســے

جب ہو مدد خیروری ذہن رسا پـــر

پھر ذہن رسا کا ہو گذر عرش علا پـــر

لزوم مالایلزم | شاعر اپنے کمال کے اظہار کے لئے اپنے اوپر چند پابندیان عائد کرلیتا ہے اور پھر انہین اپنے کلام مین نبھاکر اپنی مشاقی اور چابکدستی کا اظہار کرتا ہے ـ یہ فی الحقیقت کسی شاعر کے ذخیرۂ الفاظ کا بہترین امتحان ہے :ـ

دبیر نے صنعت مہملہ مین دو مرثیے لکھے ہین جن مین سے ایک " ہم طالع ہما مرا وہم رسا ہوا " چھپ چکا ہے دوسرا " مہر علم سرور اکرم ہوا طالع " ابھی تک غیر مطبوعہ ہے ـ راقم الحروف کے پاس بھی اس کی نقل محفوظ ہے ـ غیر مطبوعہ مرثیے کے تین بند پیش ہین :ـ

مردم کو سواد دل لالہ کرو مســطور　　اور سرمہ وہ مردمک ہر ملک و حور

اس مردم اطہر کو ملا لمعۂ صد طور　　وہ لمعۂ صد طور وہ روسورۂ الطور

مدح گہر و لعل سر سطــر اگر ہــو

گہ سطر رگ لعل ہو گہ سلک گہـــر ہو

سلک گہر و لعل علمدار مکرم — لمعہ وہ الماس و در و لعل دو عالم

ہر لعل علمدار ملا روح کا ہمدم — دم مردۂ صد سالہ کو حاصل ہوا ہر دم

والا ہوا ہر لعل علمدار کا لالا

گوہر کا ہر اک لولوئے لالا ہوا لالہ

راس الرؤسا راس علمدار دلاور — سردار مہ و مہر کلاہ سر اطہر

درد اگر گرا آہ سر معہ کہ وہ سر — حامل ہوا کس کوہ الم کا سر سرور

وہ صدمہ ہوا دل کو علمدار و علم کا

عمامہ گرا سرور و سردار امم کا

صنائع معنوی

صنائع معنوی پر گہری سوچ و بچار کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر اپنے مافی الضمیر کا اظہار غور و فکر اور سوچ سمجھ سے کرے ۔ یعنی جب فن کا اپنے تجربات کے بیان میں چابکدستی اور فنکاری سے کام لے گا تو وہ بیان کے مختلف پیرایوں پر غور کرے گا یہاں تک وہ اس خاص ترتیب کو پالے گا جو اس کے نقطۂ نظر کے مطابق موزوں ترین ہوگی ۔ اور جس سے اس کے افکار و خیالات کی وضاحت کماحقہ ہوسکے گی ۔ اگر یہ صنعتیں محض لفظی بازیگری تک محدود ہوں اور ان سے اظہار و ابلاغ سے مدد نہ ملے تو ان کا وجود محض بیکار ہے ۔ دبیر کے ہاں یہ صنعتیں ابلاغ کی مدد کرتی ہیں اور یہ شاعر کے سلیقہ پر دلالت کرتا ہے کہ صنائع لفظی و معنوی کی اس کثرت کے باوجود کلام میں گنجلک پیدا نہیں ہوتی بلکہ حسن بڑھتا ہے اور بے تکلفی میں اضافہ ہوتا ہے ۔ مطالب و معانی کی توضیح ہوتی ہے اور پڑھنے والا صنعتوں کے انبار میں اس طرح گم نہیں ہوتا کہ مطالب کی طرف سے توجہ ہٹ جائے اور صرف صنعتوں کی بھول بھلیوں میں کھو کر رہ جائے ۔

صنعت ایہام | صورت اس صنعت کی یہ ہے کہ فنکار ایسا لفظ استعمال کرے کہ وہ مختلف المعانی ہو یعنی ایک مشہور اور کثیر الاستعمال اور دوسرے بعید اور خیال افروز Suggested یعنی اشاراتی ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شعر پر جس قدر غور کیا جائے اس میں نئے معنی پیدا ہوتے ہیں اور کلام کی تازگی میں فرق نہیں آتا ۔ بلکہ قارئین کی اپنی شخصیت تعمیر کیفیت اور تجربات کی بنا پر مختلف معانی پیدا ہوتے رہتے ہیں ۔ لیکن تہ تک وہی پہنچ پاتا ہے جو شاعر کے برابر کلچرڈ Cultured ہوتا ہے یا جدت بیان کو سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہے ۔

یہ صنعت معانی کی عظمت میں اضافہ کا باعث ہوتی ہے ۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس سے انسان کا جذبۂ حیرت ہیجان پذیر ہوکر باعث لذت ہوتا ہے ۔ غور وفکر کو دعوت ملتی ہے اور قاری کا تجسس بڑھتا ہے جس سے دلکشی پیدا ہوتی ہے اور احساس حیرت شعر کی عظمت میں مزید اضافہ کا موجب ہوتا ہے (۱) مثلاً دبیر نے کہا ہے ؎

احمد مدینہ علم کا در بوتراب ہے اس باب میں حدیث رسالت مآب ہے

اس شعر میں اشارہ ہے حدیث " انا مدینة العلم و علی بابہا " کی طرف اور باب کے لفظ کو جس کے معانی " دروازے " اور بلکہ " بابت " کے بھی ہیں اور پھر خود لفظ باب حدیث میں بھی موجود ہے اور پھر اس کا ترجمہ در مصرعہ اول میں بھی مستعمل ہے مگر شاعر کی مراد معنی بعید یعنی بابت سے ہیں ۔ اس سے شعر کی عظمت اور لذت میں اضافہ ہوگیا ہے ۔ اب دوسری مثال ملاحظہ ہو ؎

---

(۱) ایہام سے کلام میں لطف کا ایک خاص پہلو یہ پیدا ہوجاتا ہے کہ بیک وقت قاری کے خیال کے سامنے معانی اور صورات کے دو رنگ نمودار ہوجاتے ہیں بعض اوقات ان میں سے ایک حسی ہوتا ہے دوسرا عقلی بعض اوقات دونوں حسی ہوتے ہیں مگر دونوں قرینے شعر کے اصلی خیال میں پیوست ہوکر لطف کا باعث ہوتے ہیں (ص ۲۵) ولی سے اقبال تک ۔ ڈاکٹر سید عبد الله مکتبہ جدید لاہور ۱۹۵۸ ع

حیرت ہے سعد کا پسر اور نحس اسقدر　　　پر تیرا باپ کون تھا دل میں خیال کر

اس شعر میں خطاب ابن سعد کی طرف ہے جو فریق مخالف کی افواج کا کمانڈر تھا ۔ اور شقی القلب ہونے کی وجہ سے حضرت امام مظلوم اور ان کے ہمراہیوں کے تباہی کے لئے بیتاب تھا ۔ ابن سعد کی کنیت سے نیز اس کے والد کے نام سے سعادت کا تلازمہ اور اس کا نحوست سے مقابلہ بلاشبہ خیال افروز اور فن کارانہ شاعری کی عمدہ مثال ہے ۔ اسی طرح حضرت امام حسین کی آمد کی آمد کے موقع پر آمد و آورد کا تلازمہ ملاحظہ ہو :۔

آمد کے مضامین ہیں آورد نہیں ہے　　　سرمہ ہے نجف کا یہ سخن گرد نہیں ہے

صنعت طباق | اس صنعت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک شعر میں دو ایسے الفاظ جمع کریں کہ جن کے معانی باہم متقابل مطابق یا متضاد ہوں (۱) ۔ دبیر نے اس صنعت کو بھی کثرت سے استعمال کیا ہے اور حیرت انگیز فن کاری کا ثبوت دے کر معانی و مطالب کو روشن کیا ہے ۔ مثلاً" دنیا مقام عبرت ہے ہر شخص زود یا بدیر مرے گا ۔ اس حقیقت کو بیان کرنے میں صنعت طباق کو کیا خوب استعمال کیا ہے ؎

تجھ کو بھی نہیں بعد ترے یاد کریں گے　　　جو مر گئے تھے ہیں جو زندہ ہیں مریں گے

اسی قبر کے مضامین کے ادائیگی میں دبیر نے اس صنعت سے بار بار فائدہ اٹھایا ہے ؎

کھویا بھی جو نقد جان تو کیا خاک ملا　　　اے خانہ خراب قبر تری خاطر

اور پھر ؎

ہم خاک میں مل جائیں گے پانی نہ ملے گا　　　آتے ہیں وہ دن لطف جوانی نہ ملے گا

اور ایک اور جگہ ؎

جو اوڑھنا ہوگا وہ بچھونا ہوگا　　　اس قبر کے پردے کا کھلا حال دبیر

---

(۱) تذکرۃ البلاغت ص ۱۳۲ مولوی ذوالفقار علی مطبع مجتبائی دہلی ۱۹۲۳ ع

جب حضرت امام حسین علیه السلام میدان جنگ مین تشریف لے جاتے هین تو مخالف فوج کے سپاهی کہ رهے هین ؎

حق یہ هے رگ و ریشہ مین ڈر بیٹھ گیا هے　　　کیا پاؤن اٹھین ؟ رن کو کہ جی بیٹھ گیا هے

حضرت امام حسین علیه السلام کے رجز کا ایک شعر هے ۔عبرت کے مضمون کو ادا کرنے کے لئے اس صنعت کو استعمال کیا گیا هے ؎

جب روز حساب آئے گا فریاد کروگے　　　بھولے هوئے هو خیر کبھی یاد کروگے

صنعت مراعات النظیر | اسے تناسب ایتلاف اور تلفیق بھی کہتے هین ۔صورت اس کی یہ هے کہ کئی متناسب اور غیر متضاد اشیاء کو کلام مین جمع کردیا جاتا هے مثلاً چمن کے ساتھ لوازمات چمن کا ذکر اور فلک کے ساتھ لوازمات فلک کا ذکر علی هذ القیاس :-

دبیر

۱ ۔ هر مورچہ لرزان هے سلیمان کی هے آمد　　　فرعونیون پہ موسی عمران کی هے آمد

۲ ۔ دریا مین نهنگون کے جگر کانپ رهے هین　　　پوشیدہ هین پانی مین مگر کانپ رهے هین

۳ ۔ واللہ هاتھ دون گا نہ فاسق کے هاتھ مین　　　سرجائے گا پہ فرق نہ آئے گا بات مین

۴ ۔ نظارہ غنیمت رخ پر نور کا جانا　　　موسی کو پہاڑ آج هوا طور کا جانا

صنعت عکس و تبدیل | اس صنعت کی غرض بیان مین زور پیدا کرنا هے ۔شعر کے پہلے مصرعہ یا حصہ مین جو چیز مقدم هے دوسرے مین اسے مؤخر کردین اور جو مؤخر هے اسے مقدم اس طرح تکرار سے الفاظ مین موسیقیت اور معانی مین زور پیدا هوتا هے ۔دبیر نے کہا هے ؎

انصاف کہان سے هو کہ دل صاف نہین هے　　　دل صاف کہان سے هو کہ انصاف نہین هے

مذهب کلامی | مطالب کی وضاحت کے لئے یہ صنعت بہت اهم هے ۔غرض اس سے یہ هے کہ شاعر جو دعوی کرتا هے اس کی تائید منطقی دلیل سے کرے اور اس طرح اپنے نتائج کی صحت کا ثبوت مہیا کرے ۔دبیر :-

۱ ـ فساد حکم و عمل جدا جدا ہوتے   خلل خدائی میں پڑتا جو دو خدا ہوتے

۲ ـ ہوتی تھیں صفیں آپ دم بے تیغ سے بے دم   پانی جو کھڑے ہو کے پیو ہوتا ہے کم سن

حل کرتی تھی ہر مسئلہ تیغ شہ عالم   ہے خون نجس اس میں یہ آلودہ تھی ہر دم

پر اس پہ نجاست کا گمان ہو نہیں سکتا

یعنی کہ نجس آب روان ہو نہیں سکتا

صنعت رجوع | اس کی تعریف یوں کی جاتی ہے :ـ

" اول ایک کلام بولیں اور بعد ازاں لوٹ کر اسے باطل کردیں بخیال کسی نکتہ کے (۱) "

یا " اول ایک بات کہنا پھر اس کو باطل کردینا بشرطیکہ اس میں کوئی لطیف نکتہ ہو " (۲)

اس صنعت کی مثالوں میں جو نمونۂ کلام ماہرین علم بدیع پیش کرتے ہیں وہ بالعموم مضامین مدح سے متعلق ہوتا ہے ـ دبیر نے بھی اس صنعت کو مدح اور وصف میں ہی استعمال کیا ہے اور خوب کیا ہے :ـ

رودار ہے خورشید پہ ابرو نہیں رکھتا   ابرو مہ نو رکھتا ہے پہ رو نہیں رکھتا

قد رکھتا ہے شمشاد پہ گیسو نہیں رکھتا   سنبل کے ہیں گیسو قد دلجو نہیں رکھتا

گل گوش ہے پر گوش سماعت نہیں رکھتا

غنچہ ہے دہن طرز فصاحت نہیں رکھتا

بوٹے گل جنت میں پہ رخسار نہیں ہے   ایمن میں تجلی ہے پہ دیدار نہیں ہے

قد رکھتا ہے طوبیٰ پہ یہ رفتار نہیں ہے   شیریں لب کوثر ہے پہ گفتار نہیں ہے

آئینہ میں رو ہے پہ خط سبز کہاں ہے

غنچے کے دہن ہے نہ زبان ہے نہ بیان ہے

---

(۱) تذکرۃ البلاغت مذکور ص ۱۲۰

(۲) حدائق البلاغت مذکور ص ۹۵

ایک اور بند درج کیا جاتا ہے جو مدح حضرت اکبر مین ہے :-

تارون کا ہے دعوی کہ یہ رخ بدر دجی ہے | پر بدر ہے منکر یہ کہان مجھ مین ضیا ہے
ذرون کا اشارہ ہے کہ یہ شمس ضحی ہے | خورشید لرزتا ہے کہ یہ نور خدا ہے

پروانۂ و بلبل مین جدا بحث کا ٹی ہے
وہ کہتا ہے یہ شمع ہے یہ کہتی ہے گل ہے

لف و نشر | "لف لغت مین بمعنی لپیٹنے کے ہے اور نشر بمعنی پراگندہ کرنے کے اور لف و نشر کی تعریف اصطلاح مین یہ ہے کہ پہلے کئی چیزین مذکور کرین اس کو لف کہتے ہین اور بعد اس کے ہر ایک کے منسوبات و متعلقات کو بغیر تعین بیان کرین اس کو نشر کہتے ہین اور تعین کا نہ کرنا اس اعتبار پر ہے کہ سننے والا ہر ایک منسوب کو اس کے منسوب الیہ سے متعلق کریگا۔ یہ صنعت دو قسم پر ہے ایک مرتب اور دوسری غیر مرتب ۔ مرتب یہ ہے کہ جس ترتیب سے لف ہے اسی ترتیب سے نشر بھی ہو .... اور غیر مرتب وہ ہے کہ نشر کی ترتیب لف کی ترتیب کے موافق نہ ہو " (۱) ۔ دبیر

مدح ذوالفقار

ایمان و کفر و تیغ و عصیان دم جہاد | یہ زندہ اور وہ مردہ یہ خوشدل وہ نامراد
کیا کیا کمال رکھتی تھی شمشیر خوش نہاد | جوہر کمند نوک سنان خود وہ برق و باد

دشمن کو قید آب و خورش سے چھڑادیا
کھینچا گرایا مارا جلایا اڑا دیا

نے چرخ ہے نے دشت نہ کہسار نہ قلزم | وہ سکتہ ہے وہ گرد وہ رعشہ وہ طلاطم
اس رخش سے برق و شرر و شعلہ و سیماب | لرزندہ و شرمندہ و درماندہ و بے تاب
خورشید و سحاب فلک و انجم و مہتاب | سوزان و خروشان و سراسیمہ و بے خواب

بازار گل و موج و صبا سرد ہے اس سے
وہ داغ ہے وہ آب ہے وہ گرد ہے اس سے

---

(۱) تذکرۃ البلاغت ص ۱۲۳ ۔ ۱۲۲

صنعت جمع | وہ یہ ہے کہ دو یا زیادہ چیزون کو ایک حکم مین جمع کرین (۱)

نقاش و نقش و کاتب و خطبانی وبنا — بود ونبود وذات وصفت هستی وفنا

آدم ملک زمین فلک گرد کیمیا — دنیا ودین حدوث وقدم بندہ وخدا

شاهد هین سب کہ صاحب اعجاز هین حسین

جان آفرین کے عاشق جانباز هین حسین

صنعت تفریق | اور یہ ہے کہ ایک طرح کی دو چیزون مین فرق ظاہر کیا جائے (۲)

حضرت عباس کے سراپا مین دبیر کا یہ بند پہلے بھی نقل ہوا ہے ؎

آئینہ کہا رخ کو تو کچھ بھی نہ ثنا کی — صنعت و سکندر کی یہ صنعت ہے خدا کی

وان خاک نے صیقل یہان قدرت نے جلا کی — طالع نے کس آئینہ کو خوبی یہ عطا کی

ہر آئینہ مین چہرۂ انسان نظـــر آیا

اس رخ مین جمال شہ مردان نظر آیا

صنعت تقسیم | وہ یہ ہے کہ اول چند چیزون کا ذکر کین اور بعد ازان ہر ایک کے منسوب کو

علی التعیین لائین " (۳) دبیر ؎

تابوت اٹھانے کا صلہ قبر کی راحت — دلدل کے بنانے کی جزا ناقۂ جنت

سقائی کے انعام مین کوثر کی حکومت — دولت ہے یہ سب تعزیہ داری کی بدولت

عابد کے لئے طوق پہنتے هین سو کیا ہے

وہ طوق نہین دائرۂ حفـــظ خدا ہے

---

(۱) تذکرہ البلاغت مذکور ص ۱۲۲

(۲) ایضا" ص ۱۲۵

(۳) ایضا"

صنعت مبالغہ مقبولہ | " مبالغہ کے یہ معنی ہیں کہ کسی وصف کی شدت یا ضعف کا اس حد تک دعوی کریں کہ وہاں تک اس کا پہنچنا بعید ہویا محال تاکہ سامع کو یہ گمان نہ رہے کہ اس وصف کی شدت یا ضعف کا کوئی مرتبہ باقی ہے " (۱) جب مبالغہ مقبول نہ ہو تو غلو ہوجاتا ہے جسے بالعموم ناپسند کیا جاتا ہے) ۔دبیر

اس ابروئے شمشیر کی جنبش ہوئی بھونچال　　　مگر اس کا چلا کوئی نہ کو پھرتی کی کوئی چال

مانند مگس چہرے سے ظالم کے اڑے خال　　　خود پلکوں میں چھپنے لگی پتلی کی طرح ڈھال

تار نظر اس تیغ کے بڑھنے سے گھٹے تھے

آنکھوں میں جو تھے نشہ کے ڈورے وہ کٹے تھے

وجۂ خم شمشیر مرے قبضے میں آئی　　　دنیا میں جگہ سر کے اٹھانے کی نہ پائی

مغروروں کو تصویر تواضع کی دکھائی　　　یا بوجہ نے جوہر کے کمر اس کی جھکائی

رک رک کے قدم رکھتی تھی ہر سر یہ ادب سے

جھک جھک کے خال شرفا ملتی تھی سب سے

بدحواسی کا مبالغہ　　(ایک کیمر یکیچر)

خودرفتہ ہوئے بھاگنے کے قصد میں بے پیر　　　ترکش میں رکھیں تیغیں نیاموں میں رکھے تیر

جی کر کے جو ٹھیرے بھی دم دارود م گیر　　　قبضے میں بدل ہاتھ میں پکڑا سر شمشیر

صنعت تجرید | "صنعت تجرید یہ ہے کہ ایک شے صاحب صفت ہے دوسری شے اسی کے مانند یعنی اس صفت کے ساتھ موصوف حاصل کریں بقصد مبالغہ واسطے اظہار اس امر کے کہ وہ شے صاحب صفت اس صفت میں ایسی کامل ہے کہ اس سے اسی صفت کی دوسری شے نکل سکتی ہے " (۲) دبیر :-

---

(۱) تذکرۃ البلاغت مذکور ص ۱۲۹ ـ

(۲) تذکرۃ البلاغت مذکور ص ۱۲۷ ـ

آغاز ترا خاک تھا ہے خاک ہی انجام | دیکھو اپنی بدی خوب بد و نیک سے کیا کام
گر مہر نہین دل پہ تو نخوت کا نہ لے نام | نازان نہ ہو دنیا پہ نہ کر شکوۂ ایام

ارشاد کیا طور پہ موسی سے خدا نے
اچھا وہ ہے جو سب سے برا آپ کو جانے

بالون کی سفیدی سے سرمو رنجور | دھوپ آگئی سایہ پہ تو سوتا ہے بدستور
ہشیار کہ نزدیک رہا اب سفر دور | ہان ڈھونڈ کفن مشک جوانی ہوا کافور

اے ملک عدم کے سفری زاد سفر
مرگ و لحد و برزخ و محشر کی خبر لے

صنعت حسن تعلیل | " اس کو کہتے ہین کہ کسی وصف کے واسطے کسی اعتبار سے کوئی شے علت ٹھرائین کہ وہ شے حقیقت مین اس کی علت نہ ہو ۔یہ چار قسم پر ہے کیونکہ وہ وصف جس کے واسطے کسی شے کو علت ٹھیرایا ہے فی نفسہ ثابت ہے یا نہین ۔اگر وہ وصف فی نفسہ ثابت ہے تو وہان اس وصف کے واسطے فقط علت کا ثابت کرنا مقصود ہوتا ہے اور اگر وصف ثابت نہین ہے تو وہان بیان علت سے اس وصف کا ثابت کرنا منظور ہوتا ہے " (۱)

شب عقد جناب امیر علیہ السلام کی مدح مین دبیر نے اس صنعت کا التزام کیا ہے ؎

ناگاہ وہ شام آئی جو صبح سے لے باج | غازۂ رخ نوروز کا بعدین کی سرتاج
حسن شب قدر و شب بدر و شب معراج | تھی رات بھی نازان کہ علی کی ہے برات آج

کثرت وہ ستارون کی شب جلوہ فگن پر
شا طون کا جھرمٹ تھا شب عقد دلھن پر

(۱) تذکرۃ البلاغت مذکور ص ۱۵۱

سج دھج تھی عروس شب شادی کی نرالی | پھولی شفق شام کے لاٹے کی جوالی
حلقی سی لب بام فلک اس نے جمالی | پازیب بھی اور کان کے بندے بھی ہلالی

مہاف زری نظم کیا کاھکشان کو
ضمون بھی چوٹی کا ملا اھل زبان کو

تاکید المدح بمایشبه الذم | یہ صنعت بنیادی طور پر محض مدح و وصف کے لئے مخصوص ہے صورت اس کی یہ ہے کہ مدوح کو تمام برائیون سے مبرا ثابت کیاجائے اور پھر ایک خوبی اسطرح بیان کی جائے کہ بظاہر وہ برائی معلوم ہو مگر حقیقت مین سراسر خوبی ہو۔ دبیر مدح معصوم مین ؏ :

قدرت ہے سب طرح کے سفید و سیاہ کی | لیکن نہ ہے نہ ہونگی قدرت گناہ کی

حضرت علی اکبر کے رجز مین ؎

جز دست گدا اور کہین زر نہین رکھتے | تکیہ کرم حق پہ ہے بستر نہین رکھتے

شاعرانہ تعلیان ؎

ہے مہرئ افلاک سے کیون خاک بسر ہون | ہان عیب بڑا یہ ہے کہ مین اہل ہنر ہون
مین کون ہون ہون صاحب علم و کلک جہانگیر | نوبت زن نہ بام عروج فلک پیر
تاج سر لفظ و سخن و معنی و تحریر | خاک قدم محتشم و مقبل و شبیر

منکر نہ کرے ہان تو شکایت بھی نہین ہے
انصاف تو کہتا ہے خداوند یونہین ہے

دبیر نے اپنے کلام مین صنائع بدائع کا التزام اس کثرت سے کیا ہے کہ بمشکل ہی کوئی صنعت لفظی یا معنوی ان کی زد سے بچی ہوگی ۔ طوالت کے خوف سے اس بحث کو یہین ختم کیاجاتا ہے ۔

باب دہم

سلام اور رباعی

الف ـ سلام

ب ـ رباعی

(الف) سـلام

عروضی ترکیب کے لحاظ سے سلام اور غزل ہمزاد ہین ـ وہی بحرین مطلع اور مقطع ـ اسی طرح ہر شعر ایک دوسرے سے آزاد اور مکتفی المعانی ـ سید امداد امام اثر سلام کی بحث مین لکھتے ہین :ـ

" سلام مین غزل کی طرح اعلی درجے کے مضامین ازقسم واردات قلبیہ و معاملات ذہنیہ باندھتے ہین مگر ان مین غزلیت کا رنگ پیدا نہین دیتے ـ سلام کی ترکیب کو رنگینی کے ساتھ بھی غزل سے علیحدہ ہونا چاہئے ـ سلام گوئی کا لطف یہی ہے کہ شوخی و رنگینی اور طبیعت داری کے ساتھ بھی غزل سرائی سے جدا نظر آئے ـ عموما" سلام مین واقعہ کربلا و شہادت امیرالمومنین و شہادت امام حسن و مصائب حضرت خاتون جنت و رحلت حضرت رسالت مآب صلواۃ اللہ و سلامہ علیہم فی یوم القیام کے مضامین داخل رہتے ہین اور بھی دیگر امور الم انگیز و حسرت خیز جو خاندان پیغمبر خدا صلعم سے متعلق ہین اندراج پاتے ہین ـ علاوہ ان کے اخلاقی اور تمدنی و مذہبی و دیگر امور جلیلہ جن سے شاعری کی زینت مقصود ہے منظوم کئے جاتے ہین ـ ایسے مضامین کبھی کبھی غزلون مین بھی باندھے جاتے ہین ـ یہی وجہ ہے کہ سلام کے بعض اشعار ایسے دیکھے جاتے ہین کہ اگر غزلون مین داخل کردیے جائین تو بے موقع یا بے محل معلوم نہ ہون " (۱)

مرزا دبیر کے سلامون کی مجموعی تعداد تین سو بتیس ہے جو ردیف وار الف تا ی دفتر ماتم کی سولھوین سترھوین اور اٹھارہوین جلدون مین درج ہین انیسوین جلد مین مخمس سلام درج ہین ـ

---

(۱) کاشف الحقائق ج ۲ (سید امداد امام اثر) ص ۱۹۱ (معین الادب لاہور ۱۹۵٦ ع)

مرزا دبیر کے سلاموں سے ان کی سلامت طبع کا پتہ چلتا ہے چونکہ ایک وقت میں غزل گوئی کی مشق کی تھی اور تین دیوان مشتمل بر غزل مرتب کرلئے تھے ۔ اس لئے طبیعت " سلام گوئی " کی طرف مائل تھی ۔ اکثر سلام بڑے معرکے کے ہیں ۔ یہاں حسب گنجائش مشتے نمونہ از خروارے چند سلام درج کئے جاتے ہیں ۔ ان کی اہمیت اس لئے بھی بڑھ جاتی ہے کہ آپ کی غزلیات ناپید ہیں :

سلام

غم آل عبا ہے اور میں ہوں — سلامی یہ غذا ہے اور میں ہوں

خیال کربلا ہے اور میں ہوں — بہشت جانفزا ہے اور میں ہوں

عجب کیا گر فرشتہ ہو سگ نفس — در شیر خدا ہے اور میں ہوں

جنوں موسی بیابان نجف کے — یہ درّ مدعا ہے اور میں ہوں

مثال دانہ پستا ہوں شب و روز — فلک کی آسیا ہے اور میں ہوں

نہ پہنچا ہائے کربلا میں تو دم حشر — یہ بخت نارسا ہے اور میں ہوں

جو گھوڑا ہا تاج کرسی بول اٹھا فرش — علی کا نقش پا ہے اور میں ہوں

نبی کہتے تھے اے حیدر تمہارا — شناسا اک خدا ہے اور میں ہوں

یہی ہے ناحسن قدرت کی آواز — علی مشکل کشا ہے اور میں ہوں

صف دشمن سے حر نکلا یہ کہ کر — بس اب راہ وفا ہے اور میں ہوں

قطعہ

خبر دیتا ہے رن میں حسن اکبر — سدا نور خدا ہے اور میں ہوں

جمال پاک نازاں ہیں کہ بے شل — شبیہ مصطفی ہے اور میں ہوں

لب شیریں مخاطب ہے خضر سے — لطیف آب بقا ہے اور میں ہوں

شب معراج کہتی ہے کہ یکتا — یہ گیسوئے دوتا ہے اور مین ہون

ندا ہے دوش پر ناد علی کی — سپر اک لافتی ہے اور مین ہون

مگر صد حیف سن کا ہے یہ اظہار — جوانی کی قضا ہے اور مین ہون

وطن مین حال صغری جس نے پوچھا — کہا آہ و بکا ہے اور مین ہون

نشان شاہ سے کہتا تھا اقبال — ترا پھیرو ہما ہے اور مین ہون

دولہن کہتی تھی دل ہے خون جس کا — جہان مین وہ حنا ہے اور مین ہون

بہن چلائی تنہا ہے دم ذبح — کہا شہ نے قضا ہے اور مین ہون

گلا بھی خشک ہے خنجر بھی بے آب — شہادت کا مزا ہے اور مین ہون

غبار راہ مہدی ہے نظر مین — تلاش کیمیا ہے اور مین ہون

دعا بھی مال و دولت کی نہ مانگون — ہمیشہ یہ دعا ہے اور مین ہون

تمناو دولت وحشمت کی بے جا
دبیر آخر فنا ہے اور مین ہون

سلام

بیت جنت مین ملے نظم سلام ایسا ہو — روئین سب مجرئی پردرد کلام ایسا ہو

سر شہ نیزہ پہ تھا سارے سرون کے آگے — بعد مردن بھی امامت تھی امام ایسا ہو

لاشہ ہائے شہدا دیکھ کے شہ کہتے تھے — لشکر اک دن مین کسی کا نہ تمام ایسا ہو

ہوگیا نقش نگین مہر نبوت کا حسین — مہر ایسی ہو نگین ایسا ہو نام ایسا ہو

بے ردا آل نبی پردے مین ناموس یزید — خاص کی قدر وہ ہو رتبۂ عام ایسا ہو

زینب خستہ جگر تھامنے کو آئی رکاب — کیون فلک بے کس و مظلوم امام ایسا ہو

نام پر شہ کے جو پانی پلا دیتے ہین — میر کوثر انہین مجرائی دعا دیتے ہین

فاطمہ کہتی ہین دنیا مین یہ آباد رہین — شہ کا پرسا مجھے سب اہل عزا دیتے ہین

کربلا مین اگر مدفون کوئی ہو تو حسین
خاک کو مرتبۂ خاک شفا دیتے ہین

چشم سجاد اگر ضعف سے بھی ہوتی بند
اشقیا پاؤن کی زنجیر ہلا دیتے ہین

بوسہ لے کر لب سوفار کا کہتے تھے حسین
بھوک اور پیاس مین کیا تیر مزا دیتے ہین

دیکھکر شعلہ ہون کو شہ کہتے تھے اے ہیر فلک
یون کہین خاک مین گلزار ملا دیتے ہین

روکے کہتی تھی سکینہ کہ ہمی قید کیا
لوگ زندان سے یتیمون کو چھڑوا دیتے ہین

کیا سخی ہین شہ دین بخشش امت کیلئے
جان بھی دیتے ہین اور گھر بھی لٹا دیتے ہین

یہ سلام شۂ مظلوم کہا خوب دبیـــــر
دیکھین انعام مین مولا مجھے کیا دیتے ہین

ایک سلام کے غزل نما اشعـــــار

رخ ہے وہ گلشن قدرت کہ بوقت گل گشت
دل عنادل کا نہ اک گل کی صفا یاد کرے

گرنگہ خضر کی ہو آب ذقن سے سیراب
پھر نہ وہ ذائقہ آب بقیلہ کوہ بقا یاد کرے

چشم وہ چشم کہ نظارہ کرے اس کا اگر
نرگس باغ جنان کو نہ صبا یاد کـــرے

واہ کیا نور ہے کیا حسن ہے اللہ اللہ
ایسے بندون کو نہ کیون جلد خدا یاد کرے

دیگـــــر

کیا نگہت رخسار ہے کیا شوکت گفتار
وہ گل مین نہین ہے یہ صنوبر مین نہین ہے

سیب ذقن و موج ولب خشک کا ثانی
طوبیٰ مین نہین چشمۂ کوثر مین نہین ہے

سلام صنعت مہملـــــہ مین

مسطور گر کمال ہو سرو امام کا
مصرع ہمارا سرو ہو گا دارالسلام کا

حاصل سر عمر کو مرصع کلاہ واہ　　دردا سر علم سر اطہر امام کا

اس طرح محو حمد رہا سرور امم　　اعدا کو حوصلہ ہوا مدح امام کا

دردا لہو امام امم کا حلال ہو　　سہل اس طرح ہو مسئلہ امر حرام کا

قطعہ

ہر سو وہ آمد آمد سردار دوسرا　　اور ہمہمہ وہ ادہم صرصر لگام کا

کہرام ملک ملک ہوا دھوم کوہ کوہ　　سوکھا لہو دل اسد وگرگ دوام کا

گہر کر ادہر کو گم ہوا عمر عدو کا ماہ　　طالع ہوا ہلال ادہر کو حسام کا

محروم گھر احمد مرسل کا لاڈلا　　سردار دہر آہ ولد ہو حرام کا

آرام گھر کا ہو اگر دل کا مدعا　　ہر سال و ماہ سوگ رکھا کر امام کا

ہر دم ملا حرم کو وہ درد الم کہ آہ　　روح رسول کو ہوا صدمہ مدام کا

(ب) رباعی

رباعیات مرثیہ کے ساتھ بطور افتتاحیہ (Prologue) استعمال کی جاتی ہین ۔ مرثیہ خوان مرثیہ پڑھنے سے قبل چند رباعیات پڑھ کر مخصوص تاثر پیدا کرتا ہے ۔ اودھ کے بالتفصیل ثقافتی پس منظر کے بیان مین انیس و دبیر کی رباعیات کی اخلاقی اور ادبی اہمیت کے متعلق لکھا جاچکا ہے ۔

رباعی نظم کی بہت اہم صنف ہے ۔ چار مصرعون مین مافی الضمیر کو کامیابی سے ادا کرنا مشاقی اور سلامت طبع کے بغیر ممکن نہین ۔ اس مین زبان اور خیال دونون کی پختگی کے بغیر برجستگی اور شستگی کا پیدا ہونا ممکن نہین ۔

مرزا دبیر کی رباعیات نہ صرف ان کے کمال شاعری پر وال ہین بلکہ اردو کے شعری ادب کا بیش بہا سرمایہ ہین ۔ انتخاب پیش کر کے فیصلہ ذوق سلیم پر چھوڑ دیا جاتا ہے :۔

حمد

پروانے کو دھن شمع کو لو تیری ہے
عالم مین ہر ایک کو تگ و دو تیری ہے
مصباح و نجوم و آفتاب و مہتاب
جس نور کو دیکھتا ہون ضو تیری ہے

حضرت امام حسین کی سخاوت

محتاجون کو اغنیا نے زر بخشا ہے
درماندون کے آرام کو گھر بخشا ہے
احمد کے نواسے کی سخاوت دیکھو
دشمن کو رہ دوست مین سر بخشا ہے

رمز

سمجھے گا اس رمز کو جو عاقل ہے
آسان نہین یہ مسئلہ مشکل ہے
مین قابل دوزخ ہون گناہون سے مگر
دوزخ نے کیا کیا جو مرے قابل ہے

بادل اور سخی

رہ جاتا ہون انگشت بدندان ہوکر　　حیدر کو کہا ابر سخندان ہوکر
مانا کہ گہر بخش ہے نیسان بھی مگر　　وہ دیتا ہے رو رو کے یہ خندان ہوکر

درگذر

جو چاہین بزرگوار ارشاد کرین　　ہم کاہے کو گھر حیا کا برباد کرین
اس واسطے بھولا ہون بدی سب کی دبیر　　مرجاؤن تو نیکی سے مجھے یاد کرین

اہل دنیا کے رد و قبول کی اہمیت

بلبل یہ زمانہ ایک گل کا نہ ہوا　　محکوم آئمہ و رسل نہ ہوا
بندون کو عبث خیال یکتائی ہے　　اللہ پر اتفاق کل کا نہ ہوا

فلک کی شکایت

زردار نہین ہون اور طلب زر بھی نہین　　مین بے سروپا کسی کا ہمسر بھی نہین
پھر خاک مین مجھ کو کیون ملاتا ہے فلک　　مین کون ہون خاک کے برابر بھی نہین

بے ثباتئ عالم

آج آئے ہین کل کوچ کی طیاری ہے　　غفلت مین کئی عمر یہ ہشیاری ہے
دنیا ہے عجب مقام حیرت نہ کھلا　　یہ عالم خواب ہے کہ بیداری ہے

سفر کے فائدے

پہنچا جو کمال کو وطن سے نکلا　　قطرہ جو گہر بنا عدن سے نکلا
تکمیل کمال کی غریبی ہے دلیل　　پختہ جو ثمر ہوا چمن سے نکلا

رسم دنیا

اچھون کو برا کہنے مین کچھ باک نہین　　جس کو دیکھو حسد سے دل پاک نہین
کچھ قید نہین اس مین اپنے ہون کہ غیر　　سینون مین کدورت کے سوا خاک نہین

تحسین سخن شناس

میزان سخن سنج مین تلتا هون مین
فکر سخن و نظم مین گهلتا هون مین

دل رهتا هے بند قفل ابجد کی طرح
جب حرف شناس هو تو کهلتا هون مین

شاعرانه تعلّی

اے ابر تری گہر فشانی کیا هے
آ دیکھ کہ یہ درّ معانی کیا هے

یان گل هے چراغ انوری کا گل
اے شمع تری چرب زبانی کیا هے

دیگر

اندهیر هے جو مجھ سے مقابل هوا نوری
شاهون کی اس نے کی هے فقط مدح گستری

حیدر کی منقبت نہ هے نعت پیغمبری
کس بات پر حسین کے ذاکر سے همسری

سفر آخرت

رحمت کا تری امیدوار آیا هون
منہ ڈهانپے کفن سے شرمسار هون

چلنے نہ دیا بار گنہ نے پیدل
تابوت بن کاندهون پہ اسوار آیا هون

مال دنیا

سر کو سرگشتہ بهر سامان نہ کیا
دل کو پئے جمع زر پریشان نہ کیا

هم تو هین ترے شکر گذار اے گردون
احسان کیا جو هم پر احسان نہ کیا

زوال هوش

عابد کہتے تهے آسرے ٹوٹ گئے
باغ چمن فاطمہ سب لوٹ گئے

خواب و خورش و تاب و توان صبر و قرار
سب هم سے چهٹے جب سے پدر چهوٹ گئے

عذاب برزخ

برزخ کی صعوبات کٹے گی کیونکر
تنهائی مین اوقات کٹے گی کیون کر

غفلت مین دبیر صبح پیری هوئی شام
دن رات هوا رات کٹے گی کیون کر

دنیا کی حقیقت

کھانے کا مزہ فقط زبانی نکلا ۔۔۔ باقی سامان عیش فانی نکلا

چاہا تھا کہ ہاتھ دھوئین دنیا سے دبیر ۔۔۔ اتنا بھی نہ اس کنوئین مین پانی نکلا

دیگر

دنیا کا عجیب کارخانہ دیکھا ۔۔۔ کس کس کا نہ یان ہم نے زمانہ دیکھا

برسون رہا جن کے سر پہ چتر زرین ۔۔۔ تربت پہ ان کی نہ شامیانہ دیکھا

دیگر

دنیا زندان ہے جائے آرام نہین ۔۔۔ گہوارہ بجز گردش ایام نہین

آنکھون مین سفیدی و سیاہی کی طرح ۔۔۔ جھپکی جو پلک صبح نہین شام نہین

قبر

گھر اپنا اجاڑ کے بسایا تجھ کو ۔۔۔ ڈھانپا جو کفن سے منہ دکھایا تجھ کو

اے قبر کہان کہان نہ کی تیری تلاش ۔۔۔ جب خاک مین مل گئے تو پایا تجھ کو

مر کر بھی نہ چین زیر افلاک ملا ۔۔۔ اک تار کفن نہ گرد سے پاک ملا

اے خانہ خراب قبر تیری خاطر ۔۔۔ کھویا بھی جو نقد خاک کو کیا خاک ملا

اک دن پیوند خاک ہونا ہوگا ۔۔۔ تنہا تنہا لحد مین سونا ہوگا

اس قبر کے پردے کا کھلا حال دبیر ۔۔۔ جو اوڑھنا ہوگا وہ بچھونا ہوگا

غدر ۱۸۵۷ع

کس عہد مین تبدیل نہین دور ہوا ۔۔۔ کہ عدل کبھی ظلم کبھی جور ہوا

اللہ وہی ہے تو نہ مضطر ہو دبیر ۔۔۔ کیا غم جو زمین اور فلک اور ہوا

صنعت مہملہ مین

اعدا کو ادھر حرام کا مال ملا ۔۔۔ حر کو ادھر اسد اللہ کا لال ملا

واللہ کلاہ سر عالم ہوا حر ۔۔۔ حلہ ملا معصومہ کا رومال ملا

حصہ چہارم

انتخابِ کلام

حصہ چہارم

انتخاب کلام

مرثیہ
(ص ٥٥٦ جلد ١ نولکشور ۱۹۳۷ع)

دست خدا کا قوت بازو حسین ہے بے شک حسن کا زینت پہلو حسین ہے
خیر الوری کا یوسف خوش رو حسین ہے باغ جنان کے پھولون کی خوشبو حسین ہے
ایمان اسکی جان ہے یہ ایمان کی جان ہے
قرآن دین ہے اور یہ گویا زبان ہے

لکھا ہے بے وطن جو امام امم ہوئے کچھ دن حرم کولے کے مقیم حرم ہوئے
کعبہ مین آکے اور حرم محترم ہوئے گویا کہ اہل بیت خدا سب حرم ہوئے
ہر خانۂ خدا مین بھی کوئی ستاتے تھے
پیک اجل خطوط اجل روز لاتے تھے

عباس کے پسر کی زبانی ہے یہ رقم مہمان تھے حرم مین ابھی شاہ محترم
اک روز اپنی آنکھ سے کیا دیکھتے ہین ہم در پر کھڑا ہے کعبہ کے وہ قبلۂ حرم
پابوس آستان حرم شاہ دین کا ہے
اور ہاتھ شاہ کے ہاتھ مین روح الامین کا ہے

چشم ادب سے ملی کے کف شاہ مشرقین جبریل دے رہے ہین ندا یون بشور و شین
اے امت نبی یہ نبی کا ہے نور عین بیعت خدا کی ہے بخدا بیعت حسین
جو آرزوئے بیعت دست خدا کرے
آکے وہ بیعت خلف مرتضی کرے

یہ ہاتھ وہ ہے جس سے ملک فیض پاتے ہین   بیعت سے ان کی کیون یہ بشر ہاتھ اٹھاتے ہین
پہلے دعا سے عرش پہ یہ ہاتھ جاتے ہین   مثل عصا کلیم کے یہ کام آتے ہین

حیرت ہے کیون طبق نہ زمین کے الٹ گئے
ہیہات کربلا مین یہی ہاتھ کٹ گئے

ہر گز سنی نہ ایک نے جبریل کی صدا   بیعت طلب امام سے کی وا مصیبتا
کعبے سے مین عرفے کو مولا ہوئے جدا   تعجیل کی قضا نے نہ حج کر سکے ادا

آواز سنگ کعبہ نے دی شور وشین سے
اے اہل کعبہ اب نہ ملوگے حسین سے

لکھتے ہین صاحبان تواریخ بیشتر   جس سال نام شہ پہ پڑا ترعہ سفر
تھی اس برس یہ شدت گرما کہ الحذر   مثل چنار آگ سے جلتا تھا ہر شجر

جاتے غبار ریگ سے شعلے بلند تھے
مجمر زمین گرم تھی ذرّے سپند تھے

مثل تنور گرم تھا پانی مین ہر حباب   ہوتی تھین سیخ موج پہ مرغابیان کباب
گلخن صدف تھے دانۂ بریان درخوش آب   آتش سے اپنی لعل بدخشان تھا آب آب

یہ دھوپ تھی کہ دانہ کا بچنا محال تھا
دانہ بچا بھی جلنے سے تو خال خال تھا

اس فصل مین تباہ نبی کا سفینہ تھا   آوارہ کوہ و دشت مین شاہ مدینہ تھا
ذی الحج کا چاند شہ کو غضب کا مہینہ تھا   اصغر کی زندگی کا نہ کوئی قرینہ تھا

منہ گل سا مثل غنچۂ تصویر خشک تھا
گرمی سے شیر بانوئے شہر خشک تھا

دو دو قدم پہ ہوتے تھے اطفال بے حواس — اک پانی پانی کہتا تھا اور ایک پیاس پیاس
یوں قافلہ تھا گرد علمدار حق شناس — جس طرح پیاسے حشر میں کوثر کے آس پاس

عباس شان ساقیؑ کوثر دکھاتے تھے
رستہ میں ساری فوج کو پانی پلاتے تھے

فرماتے تھے حسین غضب کی تپش ہے ہائے — کیا ہے جو ایسی دھوپ میں پانی نہ ہاتھ آئے
کہتے تھے خیرخواہ نہ وہ ظلم دن خدا دکھائے — مولا جواب دیتے تھے اللہ ہی بچائے

پانی ابھی تو منزلوں میں پیتے جاؤ گے
آتا ہے اک مقام کہ قطرہ نہ پاؤ گے

راستے میں فریق مخالف نے تنگ کرنے اور غالباً اپنی جاہ و حشم کے اظہار اور سیاسی مصالح کی بنا پر کچھ انتظامات کر رکھے تھے ۔ ان کا بیان ملاحظہ ہو ۔

بیٹھے تھے رہزنی کو جو گمراہ جا بجا — چلتا تھا راہ چھوڑ کے وہ کل کا رہنما
تھا قریہ قریہ حکم یہ ابن زیاد کا — لوٹوں گا گھر حسین کو مہمان اگر کیا

ایمان کیا تھا بیسع یزید لعین کے ہاتھ
غلہ نہ بیچتا تھا کوئی شاہ دین کے ہاتھ

اب یوں کتب میں منزل آخر کا ہے بیان — زہرا کا چاند اول شب کو ہوا رواں
منزل دراز رات سیہ راہ بے نشان — جنگل مہیب خار مغیلاں یہاں وہاں

تن نازنیوں کے کانٹوں سے افگار ہوگئے
مجروح خار سے گل بے خار ہوگئے

منزل آخر کی جغرافیائی کیفیت ملاحظہ ہو ۔

سنبل صفت تھا ہوئی ہر گل کی تار تار — پلکوں کی طرح بھر گئے چشم زدہ میں خار
زینب حسین کے لئے ہو ہو کے بے قرار — کہتی تھی ڈھال روک لو چہرے پہ میں نثار

کاشے غضب ہین ہاگ اٹھائے ہوئے چلو
اکبر کو بھی سپر مین چھپائے ہوئے چلو

فرماتے تھے حسین نہ ہو اتنی بے قرار | کافی ہے اے بہن سپر حفظ کردگار
ہے آج تو فقط خلش خار رہگذار | اک روز تیر و نیزہ کلیجے سے ہون گے پار
دل اس بہن کے لئے اضطرار مین
کانٹون پہ ننگے پا جو پھرے گا بخار مین

اے مومنو حسین سے مقتل قریب ہے | شہر مدینہ دور ہے جنگل قریب ہے
آخر ہے عمر منزل اول قریب ہے | زہرا کا چاند چھپتا ہے بادل قریب ہے
ہر ہر قدم پہ موت کے پیغام آتے ہین
شبیر اپنے پاؤن سے مرنے کو جاتے ہین

ناگاہ صبح منزل آخر عیان ہوئی | لیکن یہ صبح سبط نبی کو کہان ہوئی
جس جا سواری رک کے نہ آگے روان ہوئی | حیران سپاہ خسرو کون و مکان ہوئی
بدلے چند گھوڑے دوش نبی کے سوار نے
لیکن قدم اٹھایا نہ اک راہوار نے

نقارہ نوبتی نے بجایا مقام کا | یعنی یہان سے کوچ ہے دارالسلام کا
خیمہ بپا ہوا جو شہ خاص و عام کا | بھیجا فلک نے دور سے تحفہ سلام کا
کھولا یہ پردہ خیمۂ شہ نے جہان پر
اک عرش ہے زمین پہ اک آسمان پر

اس کے بعد پانچ بند خیمہ کی تعریف مین ہین جو حذف کردیے گئے ہین سحر کہانی آگے چلتی ہے اور شاعر ہمین خیمہ گاہ کی فضا کی سیر کراتا ہے ۔

وہ وقت صبح اور وہ بیابان کی ہوا | وہ چھاؤنی حسین کے لشکر کی جابجا

وہ مرکبوں کے بولنے کی چار سو صدا　　وہ خیمہ وہ سرا چا وہ بے چوبا خوش نما

اڑنا پھریروں کا وہ چمکنا نشان کا

وہ ابر ڈھال کا وہ مہ نو کمان کا

بستر پہ کوئی آیا کوئی سپر کو گیا　　کوئی سپر کو زیر بغل رکھ کے سو گیا

مصروف اک تلاوت قران میں ہو گیا　　آکر فرات پر کوئی منہ ہاتھ دھو گیا

عباس سبزپوش کھڑے تھے فرات پر

جس طرح خضر چشمۂ آب حیات پر

کہتے تھے دل شگفتہ ہے گوشہ وار ہے　　آب روان ادھر تو ادھر سبزہ زار ہے

گر بیچ میں ہو قبر مری تو بہار ہے　　دریا میں شور تھا یہیں تیرا مزار ہے

صحرا میں قبر فوج شۂ نیک ذات ہے

عباس آبرو مری اب تیرے ہاتھ ہے

مداح کربلا تھے رفیقان شاہ دین　　کہتے تھے کیا لطیف ہے واللہ یہ زمین

مطلق ملال قطع منازل کا اب نہیں　　آب و ہوا ہے کوثر و فردوس کی نہیں

صحرا ہے یا کہ قدرت ربّ غفور ہے

ہر خار باغ خلد ہے ہر ذرہ حور ہے

کب اس زمین نے پائے تھے یہ لعل یہ گہر　　یہ پھول یہ ستارے یہ خورشید یہ قمر

آئے سب اہل تربہ زیارت کو یک دگر　　نکلیں گھروں سے بیبیاں برقعے سنبھال کر

بولی کوئی کہ نام خدا کیا سپاہ ہے

اک نے کہا واہ عجب بادشاہ ہے

یہ خسرو عرب ہے کہ ایران کا شہریار　　یہ ہے عزیز مصر کہ کنعان کا تاجدار

کیوں نکلا ایسے وقت میں گھر سے یہ بیدیار　　ہر سو فساد و فتنہ ہے اور قحط کی پکار

ہے ہے یہ ننھے بچون سے کس جا مکین ہوا

آباد اس زمین مین کوئی نہین ہـــــوا

مولا کے ایک رفیق نے بڑھ کر یہ دی صدا   تم کلمہ کس کا پڑھتے ہو ؟ بولے رسول کا

اسنے کہا یہ ان کا نواسہ ہے لاڈلا   ہے رحم یزیـــد سے ترک وطـــن کیا

جاری تمہـــاری بستیون مین یہ جو نہر ہے

یہ نہر اس غریب کی مادر کا مہـــــر ہے

آواز دورباش کا ناگاہ غـــل اٹھـــا   اور خیمہ مین اترنے لگی آل مصطفــے

ڈیوڑھی سے پر کجاوۂ زینب جونہی لگا   خود اہتمام کرنے لگے شاہ کربـــلا

روکی قنات اکـــبر و قاسم نے آن کـــــر

عباس گرد پھرنے لگے نیزہ تان کـــــر

دربان عصا اٹھا کے بڑھے جانب یمین و یسار   دھنی طرف نقیب گیے باندھ کر قطار

آآ کے در پہ لونڈیان چلاتین بار بار   آتے ادھر سے اب نہ کوئی جائے ہوشیار

آواز غیر سن کے وہ اندیشـــہ کرتی ہـــین

آہستہ بولو دخـــتر زہرا اتـــرتی ہین

عفت کے جتنے موتبے خیرالنسا نے پائے   وہ مان کے بعد دختر مشکل کشا نے پائے

ہان ہان مسافرو نہ کوئی غـــل مچانے پائے   ناقہ پہ بیٹھ کر نہ ادھر کوئی آنے پائے

حسن ادب یہی ہے کہ حـــق کو پسند ہو

وہ بیٹھ جائے جس کا کہ قامت بلنـــد ہو

اتری جو اپنے ناقہ سے بنت شـــہ عرب   اور ہاتھون ہاتھ لے گیے آل رسول سب

اس قاعدہ کو بھول گیا چرخ ہے غضب   غرلے تلک یہ پردے تھا زینب کا یہ ادب

دسوین کو بال کھولے ہوئے ننگے سر پھرین

چادر چھنی رسن مین بندھین دربدر پھــرین

مسند پہ یان بٹھا کے بھن کو شۂ ھدا　　کرسی پہ آکے بیٹھے قریب حرم سرا
دے دست بستہ گرد جوانان مہ لقا　　لے لے کے نذرین آئے زمیندار کربلا
استادہ فرط خلق سے شبیر ہوگئے
نذرون کو پر ہاتھ رکھ کے بغل گیر ہوگئے

بٹھلا کے پہلوؤں مین انہین یون کیا بیان　　اے کربلا نیو مین تمہارا ہون میہمان
ظالم مجھے ستاتے ہین جاتا ہون مین جہان　　بیچو جو یہ زمین تو چند ے رہون یہان
اب خاک تم عزیز کرو اس غریب کی
سید کی ہے وطن کی ھیبت نصیب کی

سودا رضا کے ساتھ ہے جور وجفا نہین　　جبرا" درست شرع مین بیع و شرا نہین
پر اب سوا یہان کے ٹھکانا مرا نہین　　بیچو تو خیر ورنہ مجھے کچھ گلا نہین
رہنے سے یان ہمارے سب آرام پائین گے
خاک شفا تمہاری زمین کو بنائین گے

دینار دے کے ساٹھ ہزار ان کو یہ کہا　　مین نے تمہین یہ بخشی زمین تم کرو ہبا
شہ کے معاملے پر سب نے رو دیا　　لکھنے لگے قبالہ زمیندار کربلا
غل پڑ گیا حسین وطن کو نہ جائین گے
لو مول لی زمین یہین بستی بسائین گے

وان تو کلید مہر سے قفل سحر کھلا　　یان روئے اہل بیت پہ ماتم کا در کھلا
اشک روان کا تار بندھا اور سر کھلا　　ترنا ہو کی نشان سپاہ عمر کھلا
دربار حق مین خیمہ سے شاہ زمن چلے
سر لے کے نذر ہاتھ پہ ستر دو تن چلے

روشن ہوا حسینیون کے نور سے جو دن　　چشم جہان مین خار ہوئی مہر کی کرن

انجم کی انجمن تھی وہ یا فوج پنجتن   پر دوپہر تلک تھی یہ صحبت یہ انجمن

گلدستے کی طرح تو بہم یہ جوان ہوئے

اور لوٹنے کے واسطے باغی روان ہوئے

فوج ستم بڑھی کہ خزاں کی ہوا چلی   گلزار اہل بیت کی تھوڑی کلی کلی

چلاتی بال کھول کے زہرا کی لاڈلی   فریاد کو یا رسول خدا داد یا علی

باغ رسول و باغ علی باغ فاطمہ

ایسا لٹا کہ ہوگیا تا حشر خاتمہ

تنہا تھا سرو فاطمہ کوئی ثمر نہ تھا   بازو تھے دونوں توت بازو مگر نہ تھا

باقی تھی آنکھ رونے کو نور نظر نہ تھا   درد جگر تھا ہر کوئی لخت جگر نہ تھا

سب فوج الوداع شہ دین سے کہ گئی

مظلومی و غریبی و تنہائی رہ گئی

ناگاہ اک غبار رہ کوفہ سے اٹھا   اور برچھیوں کی بجلیاں چمکیں جدا جدا

پیدا ہوا سوار زرہ پوش سر ملا   بھالے لئے جلو میں ملازم پیادہ پا

لبروپہ   ابرو پہ بل پڑے ہوئے تیغ جفا لئے

دیکھا اسے لعینوں نے اور سر جھکا لئے

ناری تھا وہ سوار تو شعلہ تھا راہوار   وہ زین پر تھا سر پہ شقی کے اجل سوار

پہونچا جو وہ قریب تو بولے جفا شعار   بھاگو عزیز وہ مرگ مفاجات آشکار

چہرہ ہے یا بلا ہے نگہ ہے کہ زہر ہے

گریہ محب حسین کا نکلا تو قہر ہے

اس وقت در پہ خیمہ کے زینب تھی بیقرار   بھائی سے نا امید بلا کی امیدوار

پایا جو یک بیک صف دشمن میں اضطرار   آواز دی کہ سید بے کس ترے نثار

اعدا نے دفعتاً جو سر اپنا جھکایا ہے
کیا اس گھڑی یمن سے کوئی شیعہ آیا ہے

تنہا ہے یا کہ ساتھ ہیں کچھ اور ہم سفر	اللہ فوج شاہ پہ بخشے اسے ظفر

چوتھے برس نہ بالی سکینہ ہو بے پدر	بھابی مری بھرے نہ ضعیفی میں ننگے سر

ہر آہ خیریت نہیں معلوم ہوتی ہے
آنے سے اس کے فاطمہ کی روح روتی ہے

فرمایا بادشاہ نے کرو صبر اے بہن	یہ کربلا کہاں کجا شیعۂ یمن

کوئی حسین کا نہیں جز رب ذوالمنن	لڑنے کو ہم سے آیا ہے اک گبر لیل تن

کیونکر نہ روئیں خیر نسا شور و شین سے
ناطاقتی میں دیکھئے کیا ہو حسین سے

زینب سر اپنا پیٹ کے چلائیں ہے ستم	بیداد کرنے کے لئے فوج کیا ہے کم

رن میں وہ پہلوان سیہ دل زبون شیم	آیا عمر کے سامنے باشوکت و حشم

مجرا کیا غرور سے نیزہ سنبھال کے
اک خط دیا کمر سے عمر کو نکال کے

بولا شقی میں بصرہ سے کوفہ میں پہونچا کل	حاکم نے بھیجا یاں کہ یہ عقدہ کروں میں حل

لائی ہے واں سے یاں مجھے شبیر کی اجل	ابن زیاد کے تو نوشتہ پہ کر عمل

ہاں سب سے کہہ دیں کھولیں کمر بیٹھیں چین سے
اب پہلوان بصرہ لڑے گا حسین سے

بولا یہ ابن سعد نہ کر دیر اے جوان	ہمراہیوں کو لے کے وہ کافر ہوا روان

نیزہ ہلاتا آیا حضور شہ زمان	پڑھنے لگا رجز کہ ہوں بصرہ کا پہلوان

القاب بولہب ہے تو آتش مزاج ہوں
میں فخر زال و رستم و سہراب آج ہوں

سابق مین سرٹھایا تھا سہراب و سام نے آئے نہ خواب مین بھی مگر میرے سامنے

رونق یہ پہلوانی کو دی میرے نام نے بصرہ مین مجھ کو باج دیا خاص و عام نے

چاھون جو مین جنون کو نکالون زمین سے

شل سپر پہاڑ اٹھالون زمین سے

وہ چہرۂ جلال جدا مرتضیٰ کا لال قہر و جلال سے ھوا سورج کی طرح لال

فرمایا لعل لب سے کہ بس بس زبان سنبھال یہ کبر یہ غرور یہ نخوت کی بول چال

ھان زخم باندھ لون مین ردائے بتول سے

پھر کچھ کہون زبان خدا و رسول سے

پھر جلد جلد باندھ لئے زخم دست و پا پر دل مین زخم مرگ پسر کا نہ بند ھ سکا

اور جھکے چکے خالق عالم سے کی دعا لکنت زبان کو پیاس سے ھے جوتری رضا

آئی ندائے غیب کدھر تیرا دھیان ھے

اے افصح العرب توخدا کی زبان ھے

یون صحف رجز شہ دین نے کیا شروع ھان پہلوان بصرہ سماعت مین ھو رجوع

جب سے نجوم و شمس و قمر کا ھوا طلوع جب سے بشر پہ فرض ھوا سجدہ و رکوع

کیا کیا ھوا ہے اور ابھی کیا کیا نہ ھوئے گا

لیکن حسین اب کوئی پیدا نہ ھوئے گا

روشن ھے رتبہ نانا کا ماھی سے تابہ ماہ قدرت پہ ان کی چاند کے ٹکڑے ھین دو گواہ

جرم قمر کے بیچ مین جو ھے خط سیاہ کلمہ لکھا ھے حق نے کہ قدسی کرین نگاہ

کلمہ مین نام احمد و اسم علی لکھا

ان کو رسول اپنا اور ان کو ولی لکھا

دوش نبی کی مین سپر استوار ہون　　تیغ نیام قدرت پروردگار ہون

مین شیر بیشہ ہون شہ دلدل سوار ہون　　قبضہ مین کائنات ہے پر بے دیا ہون

تو شک ہے مین یقین تو گنہ مین ثواب ہون

تو بولہب ہے مین خلف بوتراب ہون

ایمان کا کلمہ کفر کو ہم نے پڑھایا ہے　　قرآن ہمارے واسطے دنیا مین آیا ہے

فطرس کو ہم نے دے کے دعا بخشوایا ہے　　جھولا ملائک فلک نے ہمارا جھلایا ہے

نام و نشان ہے تا بہ قیامت حسین کا

گھر ہے نبوت اور امامت حسین کا

بولا وہ بد دماغ یہ معلوم ہے مگر　　شمشیر و تیر و نیزہ کا جوہر ہے معتبر

شہ نے کہا کہ سب مین مرا امتحان کر　　ہٹ کر شقی نے نیزہ کو گردش دی گرد سر

بھالا سنبھالا شہ نے تو تل ہر محل اٹھا

اب خیر جان کی نہین دست اجل اٹھا

اٹھتے ہی نیزہ لینے لگا باج راہوار　　صرصر سے جست رعد سے تل برق سے شرار

جلنے لگے زمین پہ ذرّے سپند وار　　دود سیہ اٹھا عوش گرد بے شمار

پر ذوالجناح صاف دھوئین سے نکل گیا

ہاروت تھا کہ اڑ کے کنوئین سے نکل گیا

نیزہ کو اس کے لے گیا یون نیزۂ جناب　　چنگل مین جیسے داب لے کنجشک کو عقاب

زہ اس نے کی کمان کیانی بصد شتاب　　لیکن کمال سہی کہ مجھ پر نہ ہو عتاب

جان اس کی ساتھ تیر کے سن سے نکل گی

کہ آہ سرد تھی کہ دہن سے نکل گئی

حمزہ صفت بڑھا پسر ضیغم صمد　　کھینچا الف خدنگ کا دیکر کمان کا مد

قربان ہوکے بولی کمان یا علی مدد　　اور تیر نے نشانہ کیا دیدہ حسد

نیزہ نگاہ کسی طرح چلا غیظ و خشم مین

پتلی کی ڈھال توڑ کے جا پہونچا چشم مین

چشم عدو کی تیر سے نام آوری ہوئی　　انگشت تیر شاہ کے وہ انگشتری ہوئی

ہر تیر کے پرون سے پلک تھی بھری ہوئی　　مرد مہکار ے بند قفس مین پری ہوئی

باقی رکھا نہ ابروئے کج کے نشان کو

چلائے سب وہ تیر نے توڑا کمان کو

پھینکی زمین پہ اس نے کمان ہوکے شرمسار　　کوانہ تیغ کھینچ لی بڑھ کر لگایا وار

نکلی شب نیام سے یان صبح ذوالفقار　　بھری تو بھاگا کوئی و شامی ہوئے فرار

آئی ندا فلک سے اٹھا غل زمین سے

دیکھو وہ نکلا دست قضا آستین سے

اللہ رے حلم اوس سے مخاطب ہوئے امام　　آخر تھا ایک طعن سنان ہی مین تیرا کام

پر وقفہ اس لئے دیا اوگبر تیرہ فام　　تاحرب گاہ مین ترے حربے چلین تمام

ہے سر پہ تیری موت کہ یہ ذوالفقار ہے

اک وار مین تو نار سے اب ہمکنار ہے

ہاتھون مین بولہب نے لیا گرز گاؤ سر　　خیرالبشر کا لال ادھر وہ شقی ادھر

اور بیچ مین وہ گرز گران بار الحذر　　جس طرح واؤ عطف کا مابین خیر و شر

ظالم ارادۂ سر مولا کئے ہوئے

ہاتھون مین اپنے گرز گران سر لئے ہوئے

سو سو طرح سے گرز وہ لایا قریب تر　　لیکن حسین کو نہ ذرا بھی ہوا ضرر

شہ نے دو انگلیون سے سرگرز تھام کر　　جھٹکا دیا کہ بولہب آیا زمین پر

ہاتھ اس کے دونون ٹوٹ گئے رنگ فق ہوا

تبت یدا ابی لہب کا سبق ہوا

دنیا کی حب ہوئی اسے حمالۃ الحطب　　اور نار قہر گری تیغ شہ عرب

جلکر یہ بولہب بھی گیا پیش بولہب　　ہوا ہیون یہ اس کے برچھے شاہ تشنہ لب

پھر فرد فرد کا سر امید پست تھا

تقویم سر نوشت مین خط شکست تھا

جنگل سپر کے پھولون سے گلزار ہوگیا　　سرکٹ کے یہ گرے کہ اک انبار ہوگیا

چار آئینون سے شیشہ کا بازار ہوگیا　　رن برق تیغ سے کوہ نار ہوگیا

سب خوف تیغ شہ سے پریشان پھرتے تھے

پاؤن تو پیچھے ہٹتے تھے سر آگے گرتے تھے

حکم خدا سے ایک فرشتے نے دی ندا　　ان فاقون مین زور سے سید ترے فدا

پر یہ بشر ہین اور تو ہے قدرت خدا　　بس لڑ چکے نماز شہادت کرو ادا

یہ سن کے خوف حق سے در اشک گر گئے

قبلہ کو مثل قبلہ نما شاہ پھر گئے

اس دم عمر نے جمع کیا سب کو ایک جا　　روح معاویہ کی قسم دے کے یہ کہا

ہاگین اٹھاؤ اب نہ تامل کرو ذرا　　ہین سوئے قبلہ صرف دعا شاہ کربلا

حملہ کرو حسین پہ نیزے سنبھال لو

نوکون سے برچھیون کے کلیجہ نکال لو

تیغیں پکڑو پکڑو کے جو بے رحم آتے تھے　　حضرت یہاں جوان پسر کو بلاتے تھے

اکبر وہاں گئے تھے کہ آنے نہ پاتے تھے　　عباس کو پکارنے دریا پہ جاتے تھے

امت کے واسطے نہ تن و سر دریغ تھا

سینہ حضور نیزہ تھا سر پیش تیغ تھا

کوفہ سے ایک ناقہ سوار آیا ناگہاں　　اک خط عمر کو دے کے یہ اس نے کیا بیان

ابن زیاد نے یہ کہا ہے کہ اے جوان　　سید کے سر کا کب سے ہوں میں منتظر یہاں

سر کاٹنے میں آج نہ تاخیر کیجئو

دم لینے کی حسین کو مہلت نہ دیجیو

تیری بہادری سے تعجب کا ہے مقام　　غرہ سے اب تلک نہ شا فاطمہ کا نام

آراستہ ہیں کوچہ و بازاریاں تمام　　کیا عید ہو جو آئے تو لے کر سر امام

جب تیرے ہاتھ سے سر شبیر لوں گا میں

سیدانیوں کی لوٹ تجھے بخش دوں گا میں

سنتے ہی یہ سپاہ کو ظالم نے دی ندا　　تم نے سنا کہ جو شترا سوار نے کہا

باگیں اٹھاؤ اب نہ تامل کرو ذرا　　تاخیر میں عتاب ہے تعجیل کی ہے جا

کوفے سے حکم آیا ہے ابن زیاد کا

وقفہ نہ دو امام امم کو جہاد کا

یہ سن کے چار لاکھ نے مل کر یورش کیا　　چاروں طرف سے برچھیوں میں آہ لے لیا

قرآن کو رحل زین زمیں پر گرا دیا　　نوحہ کیا زمیں نے کہ فریاد کبریا

مٹتا ہے آج نام علی و بتول کا

ہوتا ہے قتل آہ نواسا رسول کا

جلاد آستین چڑھاتا ہوا چلا   خنجر پہ انگلیوں کو پھراتا ہوا چلا

مجمع کو راس و چپ سے ہٹاتا ہوا چلا   ارکان عرش حق کو ہلاتا ہوا چلا

اب کیا کہوں کہ پاؤں رکھا کس مقام پر

پھٹتا ہے سینہ حال شۂ تشنہ کام پر

روح رسول کہتی تھی جلاد رحم کر   یہ سینہ میرا سینہ ہے یہ سر ہے میرا سر

یہ دل ہے میرا دل یہ جگر ہے مرا جگر   یہ میرا نورعین ہے یہ ہے مرا پسر

بیٹھا ہے تو حسین دلاور کے سینہ پر

یہ لوٹتا تھا تیرے پیغمبر کے سینہ پر

زہرا پکاری عرش الہی ہلاؤں گی   اے شمر تجھ پہ آہ کی بجلی گراؤں گی

اس کو نہ مارے گا تو دعا دیتی جاؤں گی   محشر میں حر سے پہلے تجھے بخشواؤں گی

اس نوحہ پر بھی عرش کو اس نے ہلا دیا

خنجر کو بوسہ گاہ نبی سے ملا دیا

غل پڑ گیا حسین نے سر کو فدا کیا   اعدا نے جشن فتح کا سامان بپا کیا

رخ شمر نے سوئے حرم مصطفے کیا   اک نیزہ پر علم سر شاہ ھدا کیا

پردہ اٹھائے دیکھتی تھی خواہر حسین

نیزے پہ اس کے آگے چڑھایا سر حسین

اس کے بعد آٹھ بند بین کے ہیں ۔ انہیں حذف کر کے آخری بند درج کیا جاتا ہے ۔

اب وقت ہے دعا کا کہ ہے شدت بکا   آمین کہیں دبیر محبان مصطفے

یا رب ہیں جتنے شیعۂ سلطان لافتا   مقصد بر آئیں سب کے مع بانئ عزا

یا رب نہ کوئی غم ہو انہیں جز غم حسین

ان دوستوں کے ہاتھ ہوں اور ماتم حسین

مرثیہ دربیان واقعات شام (۱)

جب عابد مریض کو داغ پدر ملا　　موجود درد سر تھا کہ درد جگر ملا

ظل پہنچ گیا کہ خاک مین زہرا کا گھر ملا　　تا گاہ ظالمون کو یہ حکم عمر ملا

لوٹو تبرکات علی و بتول کو

قیدی بنا کے لے چلو آل رسول کو

حاکم کا حکم سن کے لعینون نے کیا کیا　　تاراج خیمۂ حرم مصطفے کیا

پوتے کو شیر حق کے اسیر جفا کیا　　جبریل کی خوزادیون کو بے ردا کیا

دولت علی کی گنج شہیدان کو دے چلے

قیدی بنا کے آل محمد کو لے چلے

طے کر کے منزلون کو بصد شوق آرزو　　سرحد پہ شام کی ہوئے شب باش کینہ جو

عرضی یہ بھیجی پیش یزید سیہ رو　　ساعت ورود فوج کی لکھ بھیج ہم کو تو

کل ایسے وقت داخلہ ہو فوج شام کا

سب دیکھ لین کے ہے یہی کنبہ امام کا

عرضی پڑھی وہ رات ہی کو اس نے کھول کر　　فرمان لکھا کہ شام مین آنا دم سحر

پیچھے سے باہر آکے پکارا وہ بد گہر　　کہ دو محل مین جشن کا سامان ہو سر بسر

پوچھا کسی نے صبح کو کیا اے یزید ہے

بولا حسین قتل ہوئے اس کی عید ہے

ہر کوچہ مین منادیون نے جاکے دی ندا　　نوبت طلی الصباح رکھی جائے جابجا

جاروب کش بھی آکے کرین راہ کو صفا　　سقے ہون آب پاش زمین پر جدا جدا

لاتا ہے شہ کا سر مرے دینے کے واسطے

دی رتبہ جائین شہر کے لینے کے واسطے

جب

(۱) ص ٦٧ ج ۱ نولکشور ۱۹۳۷ء

سن کر یہ حکم دوڑ پڑے خادم پلید　　اٹھ آیا کارخانون سے اسباب سب جدید
تیار بارگاہ ہوئی مثل روز عید　　مسند اٹھی نبی کی بچھی مسند یزید
اہل ستم کے خلعت پر زر چنے گئے
اور کشتیون مین شیشہ و ساغر چنے گئے

اس جشن سے محل کا محل مین بھی تھا ظہور　　ایوان و قصر و بام سے تھے بعد سرور
مسند کہین طلائی کہین کرسیے بلور　　مصروف کاروبار خواص قرب و دور
ویران مدینہ کعبہ پریشان امام کا
آباد گھر یزید کا اور ملک شام کا

تبدیل رخت کرنے لگی ہند ناگہان　　لائین خواصین زیور و خلعت کی کشتیان
پر دیکھتے ہی ہند کے آنسو ہوئے روان　　ناگاہ غیب سے ہوئی آوازیہ عیان
کچھ سمجھی تو یہ جشن ہے کیون خاص و عام مین
سر ننگے زینب آئی ہے بازار شام مین

یہ سن کے اٹھی ہاتھ سے پکڑے ہوئے جگر　　بچھوا کے فرش بام پہ بیٹھی جھکا کے سر
اور چلمنون کو ڈال دیا غرنے کمول کر　　بازار شہر بھی ہوا آراستہ ادھر
کوچہ ہر اک صفائی مین آئینہ دار تھا
اور صاف تو یہ ہے کہ دلون مین غبار تھا

میوے طبق طبق گل ریحان دکان دکان　　تنور گرم خوانچون مین گروہ ہائے نان
پہنے لباس سرخ زن و مرد شادمان　　دروازون پر امیرون کے نقارہ و نشان
قتل تھا حسین تو گئے دارالسلام مین
آباد گھر یزید کا ملک شام مین

یان شام مین تو شوکت و حشمت تھی یہ عیان وان صبحدم روان ہوا بیسوون کا کاروان
کل کی خوزادیون کا تجمل کرون بیان بن جائے سرزمین سخن رشک آسمان
یہ ذکر رفعت شہدا حق پسند ہو
منبر بھی کیا زمین سے فلک بھی بلند ہو

هان کل کے بادشہ کا دربار دیکھنا نیزون پہ سر ہین فوج کے اسوار دیکھنا
سر ننگے بیبیان ہین جلودار دیکھنا لوٹی ہوئی حسین کی سرکار دیکھنا
جن و ملک ہین راہ مین مجرائی شاہ کے
صدقے مین ابن فاطمہ کی بارگاہ کے

کیونکر کہون کہ آل پیمبر ہین بے ردا سر کھلنے سے چھپا ہوا رتبہ مگر کھلا
احسان چادر ان کے سرون سے نہ اٹھ سکا سر پر ردا نہین تو ہے سایہ خدا
کچھ رب سے دور یہ نہین اور ان سے رب نہین
چادر کا پردہ بیچ مین تھا وہ بھی اب نہین

القصہ پہنچے شام مین جب اہل بیت شاہ نقارے داخلے کے بجانے لگے سپاہ
پھر تو گھرون سے خلق چلی یون سمٹ کے آہ جاتے ہین جیسے عید کے دن سوئے عیدگاہ
جور فلک سے ایسے اسیر جفا ہوئے
قابل تماشے کے حرم مصطفے ہوئے

بالائے بام ہند جو بیٹھی تھی بے قرار بولین کنیزون اس کے حضور آکے ایک بار
وہ قیدی آئے ہی ہی کو تھا جن کا انتظار پر ہین کمال درد رسیدہ و سوگوار
بچون کو اپنے جھکے وہ ناشاد روتے ہسین
اس شہر کے بھی صاحب اولاد روتے ہین (بہت خوب)

یہ ذکر تھا کہ شور اٹھا وامصیبتا زیر محل گذر ہوا اہل حرم کا آہ
اوشون کے گرد خلق پس و پیش سب سپاہ بے اختیار ہند نے چلمن سے کی نگاہ

دیکھی جو بیکسی آل رسالت پناہ کی
دے پٹکا سر دریچہ پہ اور منہ سے آہ کی

یہ دیکھ کر کنیزین بھی سر پیٹین اپنا سب شب کو جو بال گوندھے تھے کھولے بصد تعب
اک نے کہا کہ بی بی چلین آپ نیچے اب پتھر ہو جس کا دل وہ انھین دیکھے بے غضب

کل سے انھین کے آنے کی ہوتی ہین شادیان
سیدانیان ہین یہ تو ویا شاہزادیان

رکھ کر جبین پہ ہاتھ یہ کی ایک نے فغان ہے ہے لہو اسیرون کے ماتھے سے ہے روان
کوئی پچھاڑین کھا کے یہ کرنے لگی بیان ہے ہے سبھون کی پشت پہ درون کے ہین نشان

پہلے پہل جو پردے سے بلوے مین آئے ہین
شرم و حیا سے بالون سے منہ کو چھپائے ہین

بولی کوئی کہ بچون پہ تو کیجئے نگاہ کیا سہمے سہمے لپٹے ہین مان سے یہ رشک ماہ
یہ مکھڑے پیارے پیارے بدن گورے گورے آہ سونلا گئے ہین دھوپ سے اللہ کی پناہ

کپڑا نہین نصیب نہ آب و غذا نصیب
ہے ہے یہ حادثہ یہ سن و سال یا نصیب

کی عرض اک نے غش مین سکینہ کو دیکھ کے بی بی کہو تو پانی پلاؤن مین اسے
حاکم بلا سے مجھ کو شکنجے مین کھینچ دے یہ خشک ہونٹ دیکھ کے رحم آتا ہے مجھے

کہتی تھی ہاتھ مل کے کوئی میرا بس نہین
معصوم جان بلب ہین کسی کو ترس نہین

روتی رہین کنیزین بھی اور ہند با وفا ‌ ‌ ‌ اور قافلہ اسیرون کا وان سے گذر گیا

ناگاہ اونٹ رک گئے اور غلغلہ ہوا ‌ ‌ ‌ چلائی ہند بڑھ کے کوئی دیکھو کیا ہوا

کیون چلتے چلتے لشکر کفار پھر پھرا

بچہ تڑپ کے اونٹ سے کیا کوئی گر پڑا

اک لونڈی بام بام گئی تب بصد الم ‌ ‌ ‌ لا کر خبر یہ ہند سے بولی بہ چشم نم

دیکھا نہین کسی نے زمانے مین یہ ستم ‌ ‌ ‌ اے بی بی جس کے پاؤن مین بیڑی ہے اور ورم

رکھے یہ پہلو مارا شمر نے اس ناتوان کو

غش آگیا ہے قیدیون کے سارباں کو

بے ہوش ہند ہوگئی سن کر یہ ماجرا ‌ ‌ ‌ دربار عام مین گئے ناموس مصطفے

حاکم نے لے کے جائزہ زندان انہین دیا ‌ ‌ ‌ اپنے محل مین جب گئی تو ہند نے کہا

ان قیدیون کو دیکھ کے مین ہول کھاتی ہون

حاکم سے کہہ دو جاکے مین زندان مین آتی ہون

دے کر رضا یہ دل مین لگا کہنے وہ شریر ‌ ‌ ‌ غیرت سے اس کو نام نہ بتلائین گے اسیر

اور خیر اگر بتائین گے تو ہون گے خود حقیر ‌ ‌ ‌ ساتھ اپنے ہند نے لیا سامان دلپذیر

بچون کے فاقہ توڑنے کو خوان میوون کے

اور زیور و لباس پہنانے کو بیوون کے

ہر کشتی و طبق مین یہ ہدیہ جدا جدا ‌ ‌ ‌ ہاتھون پہ اور سر پہ خواصون کے رکھدیا

خود مشک و جام اٹھاکے سوئے قبلہ یہ کہا ‌ ‌ ‌ نذر حسین کرتی ہون سقائی اے خدا

ہمراہیون سے بولی کہ حق پر نظر کرو

چلتی ہون سوگوارون مین عریان سر کرو

القصہ یون محل سے چلی ہند خوش سیر　　پہنچی قریب جب در زندان کے نوحہ گر
دربان نے بڑھ کے کھول دیا جلد قفل در　　زینب نے پوچھا بی بیو کیا ہوگئی سحر

فضہ قریب آکے پکاری دہائی ہے
بی بی کے دیکھنے کے لئے ہند آئی ہے

بھائی کو یاد کر کے یہ زینب نے کی فغان　　فریاد یا حسین کہان جا کے مین چھپون کہان
رہ جائے پردہ پاس بلا لو بھائی جان　　دیکھے نہ ہند آکے کھلے سر مجھے یہان

ہے ہے مین کیا کرون مجھے پہچان لے گی ہند
شرماون گی ردا جو ترس کھا کے دے گی ہند

یہ تو نہین سوال کہ زندان سے تم چھڑاؤ　　ذلت کے وقت مین تو مگر وارثی کو آؤ
چادر بتول کی نہ عبا مرتضی کی لاؤ　　اپنا لہو بھرا ہوا دامن مجھے اڑھاؤ

پھر بولی آہ بھول گئی بے کفن ہو تم
دامن کہان سے لاؤ گے عریان بدن ہو تم

تھی سخت اضطراب مین زینب کی جان پاک　　گاہے تو بیٹھان وہ چھپاتی تھی زیر خاک
گاہ طوق اتارتی تھی گلے سے وہ سینہ چاک　　گاہ توڑتی تھی ہاتھون کی رسی وہ دردناک

جب کچھ نہ بنتا تھا تو یہ کہتی تھی کیا کرون
آئے قضا تو شکر کا سجدہ ادا کرون

ناگاہ ہند بھی ہوئی دروازے سے عیان　　در کے قریب بند تھے سجاد ناتوان
بولی کنیزین بی بی وہی ہے یہ ساربان　　آیا تھا غش اسی کو کہا ہند نے کہان

پر صاف اس کے چہرے سے یہ آشکار ہے
شہزادہ ہے وہ یا کوئی عالی وقار ہے

وان سے بڑھی اسیرون کی جانب وہ نیک نام	پہنچتی ہوئی درود تو کرتی ہوئی سلام
تھا خلق فاطمہ کا جو زینب پہ اختتام	چپکے سے بولی فضہ سے یہ خواہر امام

رکھتی ہے دوست یہ مرے مظلوم بھائی کو
جا میرے بدلے ہند کی پیشوائی کو

پر واسطے خدا کے نہ لینا تو میرا نام	یہ خلق کا مقام ہے وہ شرم کا مقام
کہیو اللہ میرے گھر مین اسیرون کو کیا ہے کام	افضل جو تجھ سے ہون انہین چاہئے ہون سلام

یہ ہین ذلیل ان کا بھلا احترام کیا
ہم ایسے بیکسون کا ادب کیا سلام کیا

جاکے کہا جو فضہ نے تو بولی وہ حزین	فضہ کنیز فاطمہ زہرا تو تو نہین
اس نے کہا یہ شک نہ کرا ے صاحب یقین	اللہ اس جناب کی لونڈی کرے کہین

ہونا کنیز فاطمہ قسمت کے ساتھ ہے
میرا تو ان لٹی ہوئی رانڈون کا ساتھ ہے

وہ بولی کون ہین یہ بتا نام اور نشان	اسنے کہا کہ ہی یہان اشراف زادیان
اب کیا ضرور ان کی جو حشمت کرون بیان	تھا ان کے بھی جلو مین کبھی نوبتی نشان

بھوکا نہ کوئی رہتا تھا ان کے زمانے مین
اور اب تو خود یہ فاقے سے ہین قید خانے مین

یہ بھی تھے اپنے وارثون کے وقت مین امیر	اب خاک پر ہین بیٹھے ہوئے نام ہے اسیر
ان کے بھی گھر مین تھی کبھی آبادی کثیر	اب تو یہ در بدر ہین نہ ہوہون کوئی حقیر

یکسان کسی کا اوج ہمیشہ رہا نہین
آگے امیر ان سا نہ تھا اب گدا نہین

یہ سن کے بے حواس چلی ہند با وفا بیوون کے آگے کشتیان رکھوائین جا بجا
بچون کے سامنے طبق میوہ خود رکھا بیٹھی تھی سرجھکائے ہوئے آل مصطفے
زینب وفور شرم سے یون تھرتھرا گئی
آواز استخوان سے لرزنے کی آگئی

گو منزلون کے بھوکے تھے اطفال نیک ذات لیکن بڑھائے اپنے نہ میوونکے سمت ہات
تجویز اپنے ذہن سے کی ہند نے یہ بات کیونکر یہ میوے کھائین ہند ہے مین یہ خوش صفات
بولی یتیمو شرم سے سر کے نہ جاؤ تم
مین ہاتھ کھولے دیتی ہون لو میوے کھاؤ تم

معصوم بولے ہاتھون کو کھولے گی تو اگر باندھے گا کس اور بھی پھر شمر بد گہر
وہ بولی میرے ہاتھون سے کھاؤ جو ہے یہ ڈر سب چپ رہے یہ بولی سکینہ ہلا کے سر
تم بھی کھلاؤ گی ہم کو تو کھانا روا نہین
بابا کا میرے فاتحہ اب تک ہوا نہین

ہے دوسرا مہینہ کہ بابا نے کی قضا ہم رن مین چھوڑ آئے تھے لاشہ غریب کا
وہ بولی بی بی نام تو لو اپنے باپ کا بانو کی سمت دیکھ کے شہزادی نے کہا
پہلا جو نام تھا وہ ہے معلوم آپ کو
اب تو شہید کہتے ہین سب میرے باپ کو

فضہ نے آگے بڑھ کے کہا اس سے کیا حصول کیونکر ہو بار منت میوہ انہین قبول
کیا جانے تو یہ بچے ہین کس کس کنول کے پھول وہ بولی ان کے فاقہ سے ہے دل مرا ملول
بچے تو خیر بولے بھی مجھ ناتوان سے
پر ان اسیرون نے نہ کہا کچھ بھی زبان سے

ھے کشتیون مین زیور و ملبوس سب دھرا　　کیا جانیے قبول ہوا یا نہین ھوا
عابد پکارے بہنون کو زینت سے کام کیا　　پہنین لباس زر جو پہنتے ھین اشقیا
زیور تو چاھئے ھے امیرون کے واسطے
زنجیر و طوق بس ھے اسیرون کے واسطے

پھر قیدیون سے روکے یہ بولی وہ بے قرار　　کیون صاحبو نہ بولوگے جاون مین دلفگار
ڈرتے ہو مجھ کو جان کے حاکم کا دوستدار　　مرا عقیدہ ھے مرے خالق پہ آشکار
نیت مین بھی نہین کہ کسی پر جفا کرون
مجھ کو خدا نہ بخشے جو تم سے دغا کرون

میرے تمہارے بیچ مین پیغمبر خدا　　مشکل کشا کو دیتی ہون ضامن مین باوفا
دامان فاطمہ کی قسم لو پھر اور کہا　　حاشا جو مین بدی کرون تم سے یا دغا
مشکیزے بھر کے ساتھ جو اپنے مین لائی ھون
نذر حسین پانی پلانے کو لائی ھون

کچھ سمجھے تم مین آئی ہون اب کیون برہنہ پا　　دیکھا تھا تم کو راہ مین تو دل میرا کڑھا
اک مطلب عظیم بھی تم سے ھے اب مرا　　مطلب تو پھر مین پوچھون گی اب یہ کہو ذرا
میری طرح سے آل نبی پر نثار ھو
کیون قید ہو حسین کے تم دوستدار ھو

معنام ھے حسین سے کیا وارث آپ کا　　زہرا کو تم بھی جانتے ہو اپنا پیشوا
شبیر کو سمجھتے ہو تم حجت خدا　　جس دن سے فوج شام گئی سوئے کربلا
اوس روز سے سوا مجھے فکر حسین ھے
راتون کو نیند آتی ھے کاھے دن کو چین ھے

حاکم سے میں نے پوچھا تھا اس نے تو یہ کہا ہے یہ حسین اور نہیں سبط مصطفے
اب تم مجھے بتاؤ مفصل یہ ماجرا ہے تو م اس حسین کی کیا خاندان کیا

مادر تو اس کی حضرت خیرالنساء نہیں
بابا تو اس حسین کا مشکل کشاء نہیں

کس شہر میں تھی آپ کے وارث کی تخت گاہ لوگو مدینہ کا تو نہیں ہے یہ بادشاہ
کڑھتی ہوں اس کے حال پہ میں بھی خداگواہ ہے لاولد کہ صاحب اولاد ہے یہ آہ

بیٹا تو ہم شبیہ پیمبر نہیں کوئی
زینب تو اس حسین کی خواہر نہیں کوئی

زینب کو دیکھا بیبیوں نے منہ پھرا پھرا کچھ رونا آگیا اسے کچھ غصہ کچھ حیا
تھرا کے بولی طیش سے وہ بنت مرتضی بی بی کہا یزید نے جو تم سے سچ کہا

بیت سید تھا یہ نہ فاطمہ کا نور عین تھا
مذہب میں اس کے ذبح کے قابل حسین تھا

ہوتا جو یہ حسین رسول خدا کا لال کیوں خون اس حسین کا وہ جانتا حلال
ظالم سمجھتے ہم کو جو اپنے نبی کی آل کاہے کو کھلتے بلوے میں ہم بیکسوں کے بال

اب تو اسیر ہیں قرشی ہاشمی نہیں
ہم کون ہیں رسول خدا کے کوئی نہیں

بی بی لے اب تو جاکہ یہ افسانے ہیں بڑے ناحق ہمارے وارثوں سے مدعی لڑے
آواز سن کے کان ہوئے ہند کے کھڑے نزدیک تھا کہ دوڑ کے قدموں پہ گر پڑے

بولی نشان آل عبا مل گیا مجھے
زینب کی گفتگو کا مزا مل گیا مجھے

جی چاہتا ہے چوم لوں بی بی کے دست و پا — وہ بولی بس فقیروں پہ اتنا ترس نہ کھا
زینب اگر میں ہوتی تو یوں بھی سہی بھلا — تو میرے پاؤں پڑتی نہ تھا کچھ مضائقا
کلثوم ہوں نہ زینب عالی وقار ہوں
میں تو امیر شام کی تقصیروار ہوں

اے ھند کیا سمجھ کے مجھے تو نے یہ کہا — زینب کی لونڈیاں نہ کبھی دیکھیں یہ بلا
ہوتی اگر نبی کی نواسی تو ہی ہستا — نانا کے کلمہ گو نہ اڑھاتے مجھے ردا
دل سے نہیں تو خلق خدا کے دکھانے کو
کوئی تو آتا قید سے ہم کو چھڑانے کو

کیوں ھند کلمہ گوں سے ہوسکتی ہے یہ بات — دیکھیں ہند ہے رسن میں بنی زادیوں کے ہات
ممکن ہے یہ کہ سبط پیمبر کی ہو وفات — چھپ کر بھی مومن آئیں نہ پرسے کو ایک رات
ہوتا یہ حادثہ جو نبی کے گھرانے میں — مولا
بی بی وہیں تو ہوتی قیامت زمانے میں

آخر قدم پہ گر گرمی پڑی ھند خوش بیان — گیسو ہٹا کے دیکھا جو منھ پر ہوا گمان
زینب ہے یا کہ اور کوئی بی بی خستہ جان — اس فکر میں کھڑی تھی وہ ششدر کہ ناگہان
دیوار پر یہ آکے پکارا سر حسین
اے ھند میں حسین ہوں یہ خواہر حسین

میری بہن کے خاک بھرے منہ پہ تو نہ جا — کنبہ کے سوگواروں کو زینت سے کام کیا
زینب بھی بولی سن کے یہ ماں جائے کی صدا — لے ھند مجھ کو شوق سے کہ بنت مرتضیٰ
عزت تھی میری جن سے وہ تشریف لائے ہیں
بھیا ہماری قدر بڑھانے کو آئے ہیں

سیدانیاں کھڑی ہوئیں تعظیم کو تمام — اك هاتھ میں تھیں سیپیاں اك ھاتھ سے سلام

غل تھا کہ السلام علیك ایہا الامـــام — پھیلا کے ھاتھ ھند لگی کرنے یہ کـــلام

قربان جاؤں دیر نہ فـــرماؤ یا حسین

لونڈی سمجھ کے گود میں آجاؤ یا حسین

لبیك کہ کے گود میں آیا سر حـــسین — چلائی ھند ھائے پیمبر کے نور عـــین

زینب کو جوش غم ھوا بولی شور و شین — اے بیـبیو ادا کرو بھائی کا میرے دین

حق ابن فاطمـــہ کا ھے سب پر زمانے میں

ماتم کرو حسین کا اب قیـــد خانے میں

پھر بیچ میں بٹھا کے سکینہ کو ننگے سر — اور بے پدر کی گود میں رکھا سر پـــدر

پھر ماتم حسین کیا سب نے یکـــدگر — تربت سے نکلے بال نبی اپنے کھول کر

ماتم کیا حسین کا اس زور شـــور سے

زھرا نے ھاتھ چوم لئے آکے گـــور سے

بس اے دبیر جوش طبیعت کہاں تلك — گو شہرہ تیری نظم کا ھے آسمان تلك

پونہچے یہ مرثیہ شہ کون و مکان تلك — حرف غرور آنے نہ پائے زبان تـــلك

درجے خدا بلند کرے اس کلام کـــے

ھوں دستخط حسین علیہ الســلام کے

حضرت مسلم کے صاحبزادون کی شہادت کا واقعہ

جلاد کے بس مین ھین دو مظلوم و نادان ــــ اک ھاتھ مین معصومون کی ھے زلف پریشان
اک ھاتھ مین ھین چھٹے سے کرتون کے گریبان ــــ ہیبے ھی توھین ڈر سے نکل آئے ھین دندان

گرتے ھین تڑپ کر یہ نہین چھوٹتے ھین بال
کرتے کبھی پھٹتے ھین کبھی ٹوٹتے ھین بال

بیچارون کے تن کانپتے ھین دل ھین اچھلتے ــــ حارث جو ڈراتا ھے تو پھر جلد ھین چلتے
کانٹے ھین گڑے پاؤن نہین اس سے سنبھلتے ــــ اب آنسوؤن کی جا خون کے قطرے ھین نکلتے

گر گر پڑے ھین چھٹے سے عمامے بھی سر سے
مظلوم اٹھاتے نہین بے رحم کـــــے ڈر سے

چھوٹے کو بڑا بھائی ھے بڑھ بڑھ کے بچاتا ــــ ھر بار ھے صحف کی طرح بیچ مین آتا
رو دیتا ھے کچھ کہنے کا موقع نہین پاتا ــــ ھے ساختہ یہ حرف زبان پر بھی ھے لاتا

سن حال غریبون کا خدا کے لئے دم لـــــے
اب ھم ترے گھر مین کبھی آئین تو قسم لـــے

کچھ گھر مین ترے چین بھی پایا نہین اصلا ــــ خود آئے نہین تھا تیری زوجہ نے تھـــــا منا
توڑا ھے فقط پانی سے فاقا کئی دن کا ــــ حجرے مین ادا طاعت حق کیا کیا سجدہ

للہ شکستہ تو یتیمون کا نہ دل کــــر
تقصیر کوئی ھم سے ھوئی ھو تو بحل کـــر

سنتا نہین مظلومون کی التجات ستمـــگر ــــ دیتے ھین ندا زوجـــۂ حارث کو وہ مضطر
یہ جانتے تو ھم نہ کبھی آتے ترے گھـــر ــــ مہمانون کو اپنے تو بچاتی نہین آکـــــر

چھوڑ واد ے کہ پکڑے ھوئے زلفون کو عـدو ھے
امان نہین بابا نہین جو کچھ ھے وہ تو ھـے

بکھرائے ہوئے بالون کو وہ مونھہ ہے سات　　مظلومون کو ظالم سے چھڑاتی ہے وہ خوشذات

گہ پاؤن پہ سر رکھتی ہے گہ جوڑتی ہے ہات　　کہتی ہے خدا کے لئے کیا کرتا ہے ہیہات

بس بس کہ زمین اب تو ہلی جاتی ہے ظالم

زہرا مجھے سر ننگے نظر آتی ہے ظالم

حیدر کے نواسون پہ غضب ڈھاتا ہے تو بہ　　سیدانی کے بچون کو تو رلواتا ہے تو بہ

دہشت سے بدن دونون کا تھراتا ہے تو بہ　　اور تجھ کو ذرا رحم نہین آتا ہے تو بہ

ڈر سے ترے معصومون کے دندان نکل آئے

اغلب ہے نجف سے شہ مردان نکل آئے

فرزند کو دی حارث ملعون نے تلوار　　اور بولا کہ ان دونون کے سر کاٹ لے اکبار

دونون کو لئے ساتھہ بڑھا آگے وہ دیندار　　حسرت سے لگے دیکھنے اس کو یہ خوش اطوار

اس نے کہا کیا دیکھتے ہو سر پہ قضا ہے

بابا نے مرے قتل کا فرمان دیا ہے

وہ بولے جوانی کا ترے دیکھہ کے عالم　　یاد آگئی اکبر کی جوانی ہمین اسدم

بھائی ہے تاسف ترے انجام پہ ہمین ہم　　لیتا ہے جوانی مین عبث نار جہنم

طاقت بھی ہے قدرت بھی ہے مشکل نہی کو

پر وہ تو نہین قتل کیا کرتے کسی کو

بولا وہ کہ اکبر ہین عزیزون مین تمہارے　　رو کر کہا کہ ہان بیٹے ہین ماموں کے ہمارے

سب بھائیون مین ہم علی اکبر کو ہین پیارے　　کیا دخل حضور ان کے کوئی دم بھی جو ہارے

ہم گھٹنیون عباس کے سینہ پہ چلے ہین

ہم زینب و کلثوم کی گودی مین پلے ہین

یہ سنتے ہی گرد ان کے پھرا حق کا وہ شیدا　　دریا میں گرا تیغ پٹک کر لب دریا
اللہ کی رحمت میں ہوا غرق سراپا　　حارث نے کہا حق پسر یہ تھا تو بولا

حاشا تو پدر کس کا شقی ازلی ہے
ماں فاطمہ ہے مومنوں کی باپ علی ہے

تو کون ہے ظالم نظر آئے تجھے کیوں کر　　وہ دیکھ بھی رہے ہیں دریا پہ کھلے سر
ظالم نے کہا مجھ کو نہیں خوف پیمبر　　اک تیغ تلے دونوں کو بھلا یا سراسر

گردن کو نہ جھکنے دیا سجدے میں خدا کے
سرکاٹا ہڑے بھائی کا چھوٹے کو دکھا کے

سر اس رکھا لاش کو دریا میں بہایا　　بھائی کے گلے کا جو لہو خاک پہ پایا
الفت سے برادر کا لہو جوش میں آیا　　تب جوش کے ہاتھ اس نے یہ قاتل کو سنایا

پونچھوں یہ لہو کرتے سے تلوار جھکا دے
لوٹوں بڑے بھائی کے لہو میں جو رضا دے

ناگہ غضب وطیش سے ظالم نے پکارا　　بس لوٹ چکے اٹھو کہ سرکاٹوں تمہارا
اٹھ بیٹھا کہا اچھا گلا کاٹ ہمارا　　سرکاٹ کے دریا میں جو تن ڈالا قضارا

مرتے نے کہا پورے ہوئے دل کے ارادے
اے نہر مجھے بھائی کے لاشے سے ملا دے (۱)

---

(۱)　مرثیہ " وہ کون دو یوسف ہیں جو آوارہ وطن ہیں " ص ۲۸۸ ـ ۲۹۰
جلد ۱ نولکشور ۱۹۲۷ء

آنا اهل حرم کا لاش امام حسین پر اور اسیری حضرت سجاد

(ص ۲۰۶ جلد ۱ نولکشور ۱۹۲۷ ع)

جب کربلا مین عترت اطہار لٹ گئی　　یعنی سب آل احمد مختار لٹ گئی

اور بارگاہ حیدر کرار لٹ گئی　　بالکل حسین پیاسے کی سرکار لٹ گئی

بیداد لشکر عمر نابکار سے

سادات نکلے خیمے سے زہرا مزار سے

کٹوا کے سر جو شاہ شہیدان ہوئے حسین　　یعنی خدا کی راہ مین قربان ہوئے حسین

مختار کارخانۂ یزدان ہوئے حسین　　فخر ذبیح وقدیۂ سبحان ہوئے حسین

تھا رقت صبر بھائی سے زینب جو چھٹ گئی

ضرب تلک حسین کی سرکار لٹ گئی

مقتل کے سامنے حرم آ آکے گر پڑے　　اور پہلوؤن مین بچے بھی غش کھاکے گر پڑے

اک جا ستارے خاک پہ زہرا کے گر پڑے　　عابد وفور ضعف سے تھرا کے گر پڑے

آیا نہ کوئی غش سے اٹھانے کے واسطے

زنجیر لایا شمر پہنانے کے واسطے

عابد نے غش مین شور جو زنجیر کا سنا　　ناطاقتی مین ضعف سے کی نیم وچشم وا

زنجیر و طوق دیکھ کے بیمار نے کہا　　کیون منصوبہی ہے مرے درد کی دوا

بیمار تلخ کام ہون اور تشنہ کام ہون

یارو امام زادہ ہون اور خود امام ہون

پہناتے ہو جو بیڑیان میری خطا ہے کیا　　بابا تو قتل ہوگئے مین زندہ کیون رہا

سمجھا مین ہتھکڑی کے پہنانے کا مدعا　　عباس کی طرح نہ ہوئے ہاتھ کیون جدا

اصغر کی طرح حلق نہ زخمی ہوا مرا

سو طوق و ریسمان کے قابل گلا مرا

بیکار بھی نہین ھین جو جیتے رہے ھین ھم ماتم پدر کو ہاتھون سے کرتے ھین دمبدم

پہلے ھی سے فلک نے کیا ہے اسیر غم دو بیڑیان ھین پاؤن مین الضعیف اک ورم

درد و قلق مرے ھین زیادہ شمار سے

دل سوز غم سے جلتا ہے اور تن بخار سے

وارث ہون شیر حق کا اسیری سے کیا ہے عار تخفیف کا مگر ہون مین تم سے امیدوار

بیڑی فقط پہناؤ یا طوق خاردار یا ہتھکڑی ہو ہاتھ مین یا اونٹون کی مہار

یا شانہ یا کلائی بندھے ہے رسن سے

سب بوجھ اٹھ سکین گے نہ اک ناتوان سے

تلوارین سر پہ کھینچ کے بولے جفا شعار تجھ کو پہننا ہوگا سب اے نحیف و زار

یہ ہتھکڑی یہ بیڑیان یہ طوق خاردار گردن مین تیری ہوگی رسن ہاتھ مین مہار

ہم سارہان بنا کے یہ زیور پہنائین گے

تا شام کربلا سے یونہین لے کے جائین گے

ناگہ دراز دست جفا شمر نے کیا بیکس کو ایک طوق پنہایا بصد جفا

اور شادیانے بجنے لگے گرد جابجا ہے ہوش غش مین خاک پہ تھی بنت مرتضیٰ

اس غل سے ہوش آیا جو اس خوش نہاد کو

رانڈون مین ڈھونڈنے لگی زین العباد کو

صبح کا منظر

(ص ۲۸۵ جلد ۱ نولکشور ۱۹۳۷ع)

جب سرنگون ہوا علم کہکشان شب ‏ ‏ خورشید کے نشان نے مٹایا نشان شب

تیر شہاب سے ہوئی خالی کمان شب ‏ ‏ تانی نہ پھر شعاع قمر نے سان شب

آئی جو صبح زیور جنگی سنوار کے

شب نے زرہ ستاروں کی رکھ دی اتار کے

شمشیر مشرقی جو چڑھی چرخ پر شتاب ‏ ‏ پھر تیغ مغربی نے دکھائی نہ آب و تاب

تھا بسکہ گرم خنجر بیضائے آفتاب ‏ ‏ باقی رہا نہ چشمہ٭ نیلوفری میں آب

محتاج ماہتاب ہوا آب و تاب کا

باغ جہاں میں پھول کھلا آفتاب کا

تھی جوش خون کے عارضہ میں مبتلا شفق ‏ ‏ فصاد صبح آیا لئے نشتر و طبق

کھولی شفق کی فصد تو رنگ افق تھا فق ‏ ‏ گلرنگ تھا صحیفۂ گردوں ورق ورق

خون شفق سے سرخ قضا نے قلم لیا

اور خط و خال روز شہادت رقم کیا

نکلا جو صید شب کو خدیو جہاں صبح ‏ ‏ ناوک شعاع مہر تھی گردوں کمان صبح

سلطان مشرق دوش پہ رکھے نشان صبح ‏ ‏ شبدیز ابلق فلکی زیر ران صبح

عالم تھا محو عالم نیر فروز کا

تار شعاع دام تھا عنقائے روز کا

ص ۱۱۹ (ج ۱ نولکشور ۱۹۳۷ع)

پیدا شعاع مہر کی مقراض جب ہوئی ‏ ‏ پنہاں درازئی پر طاؤس شب ہوئی

اور قطع زلف لیلیٰ زہرا لقب ہوئی ‏ ‏ مجنوں صفت قبائے سحر چاک سب ہوئی

فکر رفو تھی چرخ ہنر مند کے لئے

دن چار ٹکڑے ہوگیا پیوند کے لئے

فرہاد مہر نے کیا یہ طور اختیار ‏ اس کوہ بے ستون فلک پر لیا قرار
تیشہ لگا کے خط شعاعی کا آبدار ‏ کی جوئے شیر صبح سیاہی سے آشکار
لیکن عجیب حال تھا بے شیر شاہ کا
نہر لبن میں شور تھا واہ اصغراء کا

یوسف غریق چاہ سیہ ناگہاں ہوا ‏ یعنی غروب ~~طلوع نیر مشرق ستان ہوا~~ ماہ تجلی نشان ہوا
یونس دہان ماہی شب سے عیاں ہوا ‏ یعنی طلوع نیر مشرق ستان ہوا
فرعون شب سے معرکہ آرا تھا آفتاب
دن تھا کلیم اور ید بیضا تھا آفتاب

تھی صبح یا فلک کا وہ جیب دریدہ تھا ‏ یا چہرۂ مسیح کا رنگ پریدہ تھا
خورشید تھا کہ عرش کا اشک چکیدہ تھا ‏ یا فاطمہ کا نالۂ گردوں رسیدہ تھا
کہیے نہ مہر صبح کے سینہ پہ داغ تھا
اید اہل بیت کا گھر بے چراغ تھا

روز سفید یوسف آفاق شب نقاب ‏ مغرب کی چاہ میں تھا جو پابند اضطراب
سقائے آسمان نے لیا دلو آفتاب ‏ جس میں رسن شعاع کی باندھی بآب و تاب
یوسف کو دلو مہر میں بٹھلا کے چاہ سے
مشرق میں لایا کھینچ کے مغرب کی راہ سے

نکلا افق سے عابد روشن ضمیر صبح ‏ محراب آسمان ہوئی جلوہ پذیر صبح
کھولا سپیدی نے جو مصلائے پیر صبح ‏ پھر سجدہ گاہ بن گیا مہر منیر صبح
کرتی تھی شب غروب کا سجدہ ودود کو
سیارے ہفت عضو بنے تھے سجود کو

ظلمت جہاں جہاں تھی وہاں نور ہوگیا ‏ پھر مشک شب جہان سے کافور ہوگیا
کیا کہ زنگ آئینہ سے دور ہوگیا ‏ باطل رسالۂ شب دیجور ہوگیا

کیا پختہ روشنائی تھی قدرت کے خامے میں
مضمون تھا آفتاب کا ذروں کے نامے میں

رات کا سماں

مغرب سے نمایاں ہوئی جس دم شب عاشور
کچھ صبح قیامت سے نہ تھی کم شب عاشور
دل خلق کا کرنے لگی برہم شب عاشور
زینب کو ہوئی جامۂ ماتم شب عاشور
ظلمت کی ردا اس لئے ہر سمت پڑی تھی
سر کھولے ہوئے فاطمہ مقتل میں کھڑی تھی

جس وقت پڑا سکۂ شب سیم قمر پر
پھر کوئی نہ راغب ہوا خورشید کے زر پر
مریخ کا خنجر جو چلا ترک سحر پر
بن بن کے شفق خون چڑھا چرخ کے سر پر
کیوان علم ایوان فلک اور چاند نگین تھا
آفاق سلیمان کی طرح زیر نگین تھا

شب تھی کہ سیہ بختیٔ کفار ہر اک سو
چشم سیہ قہر تھی یا ظلم کا گیسو
کجرو صفت نقش نگین تھے جو وہ بد خو
آخر کو ہوئے شب کی سیاہی سے سیہ رو
روشن ہے سیہ کار وہ سب فوج جفا تھی
معدوم ہوئے نام سیاہی جو سوا تھی

صد حیف کیا عدل زمانے نے فراموش
دریا تو دیا ظالموں کو بہر خورد نوش
شبیر کے اطفال تھے یاں پیاس سے بے ہوش
دریائے رواں دامن شب سے ہوا روپوش
پیاسے جو تھے اطفال شۂ تشنہ گلو کے
تھی غم کی گرہ دل میں حباب لب جو کے

مشتاق نماز ابن علی خیمے سے آیا مہتاب نے سجادۂ مہتاب بچھایا
تسبیح ستارون کی فلک نذر کو لا یا مولا نے بھی ایک ایک نمازی کو بلایا

فرمایا غنیمت ہے جو کچھ طاعت رب ہو
لاشے پہ نماز اپنے خدا جانئے کب ہو

وہ شب کا اندھیرا وہ بیابان کی سیاہی گرمی کی وہ پیاس اور وہ پانی کی مناہی
آباد وہ گھر اور وہ اک بار تباہی یہ حادثہ اور آل نبی شان الہی

گر فرش پہ سو جاتے تھے روتے ہوئے بچے
پھر پیاس سے چونک اٹھتے تھے ستے ہوئے بچے

سن سن کی صدا آتی تھی میدان بلا سے غش ہوتے تھے اطفال درندون کی صدا سے
اور خیمے مین بجھنا وہ چراغون کا ہوا سے ہونچے کوئی اس حادثہ کو آل عبا سے

اک ہاتھ سے مان لیتی تھی اصغر کی بلائین
اک ہاتھ رکھے سینے پہ دیتی تھی دعائین

گرمی کی شدت (ص ٨١ ج ١ نولکشور ١٩٣٧) بند ٢٠ و ٢١)

گرمی کی شدت کے بیان مین دبیر بڑے عمدے اشارات سے شدت گرما کا تاثر پیدا کرتے ہین ملاحظہ ہو:۔

لکھا ہے عجب فصل مین یثرب سے چلے شاہ وہ دھوپ کی شدت تھی کہ العظمۃ للہ
ان روزون نہ چلتا تھا مسافر بھی کوئی راہ بھٹ ہرواز سے تھا مرغ تصور کو بھی اکراہ

لو چلتی تھی ایسی کہ جلے جاتے تھے ذرے
اسپند کے مانند نظر آتے تھے ذرے

تپتی تھی زمین کورہ حداد کی تمثال شہباز نگہ کھول نہ سکتا تھا پر و بال
خرمن مین ہر اک دانۂ سیہ تھا صفت خال بے رنگ شفق منہ فلک سبز کا تھا لال

اس فصل کی حدت اگر آجائے بیان میں
چھالے کہیں پڑجائیں نہ خیمے کی زبان میں

۲ ـ ص ۵۵۷ جلد ۱ نولکشور ۱۹۲۷ ع بند ۸ و ۹

لکھتے ہیں صاحبان تواریخ بیشتر　　جس سال نامشہ پہ پڑا قرعہ سفر
تھی اس برس یہ شدت گرما کہ الحذر　　مثل چنار آگ سے جلتا تھا ہر شجر
جائے غبار ریگ سے شعلے بلند تھے
مجمر زمین گرم تھی ذرے سپند تھے

مثل تنور گرم تھا پانی میں ہر حباب　　موجیں تھیں سیخ موج پہ مرغابیاں کباب
گلخن صدف تھے دانہ بریان درخوش آب　　آتش سے اپنی لعل بدخشان تھا آپ آپ
یہ دھوپ تھی کہ دانہ کا بچنا محال تھا
دانہ بچا بھی جلنے سے تو خال خال تھا

ـ ۳ ـ

تنہا کھڑے ہیں رن میں امام فلک جناب　　گرمی دکھا رہا ہے قیامت کی آفتاب
ہے آگ مرغ قبلہ نما ہوتے ہیں کباب　　خط غبار سے ہے لبی ابری سحاب
چھالا ہے آفتاب کا گردون کے پاؤں میں
خود چھپ رہی ہے دھوپ درختوں کی چھاؤں میں

شی خراب چرخ پہ ہے ہر آب کی　　رنگت ہے ہر خوت میں ماہی کباب کی
دریا میں آنکھ بیشہ گی ہے حباب کی　　حدت ہے موج موج میں تیر شہاب کی
فوارے کو نہ حوض میں گرمی سے کل پڑی
پانی کی بھی زبان دہن سے نکل پڑی

ش بدل بھنور میں تو موجوں میں شعلہ وش   آنے میں مچھلیوں کو حرارت سے غش آ غش
وز جگر سے مردم آبی میں نالہ کش   نوحہ ہے تین روز کے پیاسوں کا العطش

نزدیک ہے کہ زہد کو بے آبرو کریں
تر دامنی سے شہدوں میں زاہد وضو کریں

ظاہر ہے کہ ان اشارات سے گرمی کی شدت کا تاثر تو پیدا ہو سکتا ہے مگر ریگستان کی
گی کے موسم میں جو صورت ہوتی ہے اس کی منظر کشی نہیں ہوتی –

صبح کی صبح

وہ صبح تھی یا آئینۂ حال شہیدان   ہر اک کو وارث نظر آنے لگے بے جان
آنکھوں کے تلے پھرنے لگا موت کا سامان   زینب کو سر اپنا نظر آنے لگا عریان

بانو کی یہ فریاد تھی اے لوگو یہ کیا ہے
لاشا مرے آگے علی اکبر کا پڑا ہے

وہ روشنی صبح وہ جنگل وہ بیابان   وہ سرد ہوا اور وہ سحر قتل کا سامان
ہر مرتبہ جنبش میں بہم برگ درختان   اور شاخوں پہ وہ زمزمۂ مرغ خوش الحان

خورشید کی تو جلوہ گری اوج سما سے
اور خیموں میں بجھنا وہ چراغوں کا ہوا سے
